قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2024 قیمت 15₹

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4
خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5
ادب زاویے اور جہات
اجنبی جہانوں سے روبرو
کرانے والا جامِ جم — غضنفر 7
اردو فکشن کی تنقید میں — ابوبکر عباد 10
ہندو فکشن نگاروں کا حصہ

اردو زبان وادب کے فروغ میں فورٹ
سینٹ جارج کالج مدراس کا کردار — انوپما پول 14
اردو شاعری میں کرشن کنہیا — طالب اکرام 17
روئداد: تعریف، تفاعل اور کردار — عبدالرحمٰن فیصل 20
اردو مشاعروں کی افادیت
اور ادبی روایت — گلشن مسرت 23
زبان و تعلیم
'امالہ' سے بے نیازی: ایک بڑی غلطی — اسلم جاوداں 26
اردو زبان کا آغاز: مختلف نظریات — امتیاز احمد 28
یاد رفتگاں
بدنام نظر کی نظموں میں زندگی کی خوشبو — عشرت ظہیر 32

احسان سیوانی کو یاد کرتے ہوئے — اشتیاق سعید 35
خصوصی گفتگو
صغیر افراہیم سے انٹرویو — ریشا قمر 38
نگر نگر اردو
برہانپور میں نظمیہ شاعری — بسم اللہ عدیم برہانپوری 41
کتاب دریچہ
جن کتابوں نے متاثر کیا — ثناء اللہ صادق تیمی 43
فلم/ڈراما
سنیما: فریب نظر یا فریب حقیقت — محمد شاہد حسین 45
اردو اور ہندوستانی سنیما — شکیل احمد خان 48

اردو ڈرامے کی ابتدا — شہباز ارشد 50
ادب اطفال
کوکن میں ادب اطفال کی صورتِ حال — محمد دانش غنی 53
نیا آسمان نئے ستارے
میر تقی میر: تذکرہ نویس شاعر — محمد رضا اظہری 57

وحشت کا تصور اور میر و غالب — مہر فاطمہ 60
کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری — رودر شکتی جی مہاراج 62

کتابوں کی دنیا
تبصرہ وتعارف — ادارہ 66

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:02، فروری 2024

مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

دنیا میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان زبانوں کا تعلق ملک اور معاشرے سے ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں جو زبان بولی لکھی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے اسی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تا کہ تفہیم و ادراک کی سطح پر کسی قسم کی پیچیدگی پیش نہ آئے اور لوگ اپنی زبان میں ہی اپنے جذبات اور احساسات کا صحیح طور پر اظہار کرسکیں۔ زبان کا سماج سے بہت گہرا ربط ہوتا ہے اسی لیے جو زبان سماج سے مربوط ہوتی ہے وہ زبان زندہ رہتی ہے۔ اگر اس زبان سے رشتہ توڑ لیا جائے تو اس کا مرنا فطری ہے۔ آج بہت ساری زبانیں اس لیے معدوم ہوگئیں کہ ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ اسی لیے زبان کو زندہ رکھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ہر فرد اپنے معاشرے کی زبان کو روزمرہ میں شامل کرے، کیونکہ اس کا تعلق صرف زبان کی زندگی سے نہیں بلکہ ثقافتی، تمدنی اور تاریخی تشخص سے بھی ہے۔

رسول حمزہ توف نے اپنی مشہور کتاب 'میرا داغستان' میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک داغستانی 30 سال سے فرانس میں مقیم تھا، وہ ایک مصور تھا۔ اس کے والدین کو یقین تھا کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے۔ مگر جب بوڑھی ماں کو اس کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے تمام احوال پوچھنے کے بعد سب سے اہم سوال یہ کیا کہ میرے بیٹے نے تم سے مادری زبان 'آوار' میں بات کی یا نہیں! تو رسول حمزہ توف نے بتایا کہ نہیں وہ فرانسیسی زبان میں بات کر رہا تھا اور وہ اپنی مادری زبان 'آوار' بھول چکا ہے۔ تب ماں نے کہا کہ جس سے تم مل کر آئے ہو وہ میرا بیٹا نہیں کوئی اور ہوگا۔ میرا بیٹا اس زبان کو بھلا کس طرح بھلا سکتا ہے جو میں نے اسے بچپن میں سکھائی تھی۔ اس بوڑھی ماں نے کہا کہ ''اگر وہ اپنی مادری زبان بھول چکا ہے، تو میرے لیے وہ زندہ نہیں، مر چکا ہے!'' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مادری زبان کی کیا اہمیت و معنویت ہے۔

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ ہر فرد کی پہلی زبان وہ ہوتی ہے جو وہ اپنے والدین، ماحول، اطراف و اکناف اور معاشرے سے سیکھتا ہے۔ دراصل یہی فطری زبان ہوتی ہے۔ اگر ابتدائی مرحلے میں کسی بھی فرد کو اس کی اول زبان سے ناآشنا رکھا جائے تو آگے نہ صرف اس کے لیے بہت سی دقتیں اور دشواریاں پیدا ہوں گی بلکہ وہ اپنی معاشرتی، لسانی اور ثقافتی شناخت سے بھی محروم ہوجائے گا۔ اس لیے ہر معاشرے میں مادری زبان پر زور دیا جاتا ہے کہ بچے اسی زبان کے وسیلے سے بہتر طور پر حیات و کائنات کے رموز و اسرار کو سمجھ سکتے ہیں۔

تعلیم کے تعلق سے یہ تصور عام ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہی دی جائے تا کہ تعلیمی موضوعات، مسائل اور اس کے متعلقات کو سمجھنے میں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ بھارت سرکار نے بھی قومی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان پر زور دیا ہے کہ اس کے ذریعے تعلیم و تفہیم آسان ہوجاتی ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی مادری زبان میں نہ صرف ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی اسی زبان میں دی جاتی ہے۔ فرانس ہو یا جرمنی یا روس یا ان کے علاوہ کچھ اور ممالک بھی ہیں جہاں مادری زبان کو ہی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سائنس، ٹکنالوجی اور دیگر علوم کی تعلیم بھی مادری زبان میں ہی دی جاتی ہے۔ اس نظام تعلیم کے بہت مفید نتائج اور اثرات سامنے آئے ہیں۔ لیکن مادری زبان پر مرکوز رہنے کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر زبانوں سے رابطہ منقطع کرلیا جائے۔ دوسری زبانوں میں بھی بہت سے اہم علوم ہیں، اس لیے چاہیے کہ اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان بھی سیکھنے کی کوشش کریں، آج کے دور میں وہ شخص زیادہ کامیاب ہے جو ایک سے زیادہ زبانیں جانتا ہو، کیونکہ زبان جانے بغیر دنیا سے رابطہ کرنا مشکل ہوگا۔ مادری زبان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی آگہی انسان کی ذہنی، لسانی قوت اور علمی و ادبی ثروت میں اضافہ کرتی ہے اور اس کے مطالعاتی و معلوماتی دائرے کو بھی وسیع سے وسیع تر بناتی ہے۔

پروفیسر دھننجے سنگھ

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بھی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

حسب معمول 'اردو دنیا' جنوری، 2024 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ موضوعاتی تنوع تو قاری کو مکسڈ جیم کا حظ عطا کرتا ہی ہے، مشمولات کا معیار ووقار بھی اس کے مطالعے کو مجبور کرتا ہے۔ ظہیرانور کا مقالہ جوگیندر پال کی رنگارنگ فکری وفنی جہات کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ الیاس عزیز نے بھی شارب ردولوی کی عملی تنقید کے مختلف زاویوں کی تنقیح بہت عرق ریزی سے کی ہے۔

'پنجابی زبان پر فارسی کے اثرات' کے عنوان سے طارق حسین کا لسانیاتی مقالہ معلوماتی اور دلچسپ ضرور ہے لیکن دوران مطالعہ کئی موقعوں پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً جب وہ غزنوی کے حملے کے بعد مغربی پنجاب میں تہذیبی ولسانی اختلاط کے نتیجے میں ابھرنے والی نئی زبان کا تذکرہ کرتے ہیں تو صرف اتنا فرماتے ہیں کہ اس زبان کو آج ہم 'اردو' زبان کے نام سے جانتے ہیں۔ اگر مقالہ نگار اس موقع پر اس کا بھی ذکر کر دیتے کہ اسی مغربی پنجاب کو اردو کا اولین مولد ثابت کرنے کے لیے حافظ محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' کے عنوان سے باضابطہ ایک تحقیقی کتاب بھی لکھ رکھی ہے جو اپنے عنوان پر اب تک کی مستند ترین کتاب تصور کی جاتی ہے، تو مقالے کی وقعت میں اضافہ ہو جاتا۔ خصوصی گفتگو کے گوشے میں شہاب ظفر اعظمی سے مسرت جہاں کا انٹرویو موجودہ انتقادی منظرنامہ بطریق احسن پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی جناب اعظمی کا جواب عصری ادبی وانتقادی رجحانات کی تفہیم کے نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ میرا ایک ناقص مشورہ یہ ہے کہ مختلف علوم کے معلوماتی و دلچسپ مضامین کی اشاعت جاری رہے جو ہمیشہ سے اس رسالے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

زبیر احمد بھاگلپوری: بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ

ماہنامہ اردو دنیا کا جنوری 2024 کا شمارہ بذریعہ ڈاک موصول ہوا اور ہر ماہ پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ شمارہ کے مشمولات زیر مطالعہ ہیں۔ ہمیشہ کی طرح تمام علمی، ادبی مضامین، مقالات اور تبصرے بہت عمدہ اور معلومات افزا ہیں۔ اداریہ کی مختصر تحریر نے بھی بہت متاثر کیا۔ آپ نے اداریہ میں بہت اچھی بات لکھی کہ وقت ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ نیا سال 2024 محض ایک کلینڈر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ ہمارے فکر و نظر، رویے اور رجحان کا بھی ایک اشاریہ ہے۔ یقیناً آپ کی مدیرانہ صلاحیتیں اور آپ

کی علمی، ادبی، تہذیبی، صحافتی خدمات قابل قدر ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا یہ ماہنامہ 'اردو دنیا' دنیائے اردو ادب میں اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے اور زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ خوبصورت طباعت، پرکشش سرورق، علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور معلوماتی مضامین اور مقالات سے مزین یہ بین الاقوامی جریدہ اپنی تمام خوبیوں کے سبب قارئین کا محبوب رسالہ ہے۔

یاسین انصاری: باہ اڈا، اٹاوہ، یوپی

'اُردو دنیا' دسمبر 2023 کو الوداع کہتے ہوئے وصول ہوا۔ بارہ ماسہ کی مانند اس کی ترتیب بھی بارہ شہ سرخیوں سے مزین ہے۔ اداریے میں یہ پتے کی بات کہی گئی ہے کہ جمود چاہے سائنس میں ہو، ادب میں ہو یا کسی اور میدانِ عمل میں، یہ خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ مدار ومحور کی گردش ادب کے ارتقائی سفر میں محرک کا باعث بنتی ہے اور نئے رجحانات موضوعات اور تجربات کو اس سے تحریک ملتی ہے۔ ہماری بات میں یہ باتیں نہایت فکرانگیز ہیں گر کوئی عمل پیرا ہو۔ 'ادب: زاویے اور جہات' میں پانچ مقالات درج ہیں۔ پہلا مقالہ بعنوان 'شعری نحو اور عروضی صوتیات' جناب سلیم شہزاد کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ کلاسیکی نوعیت کا ادبی شاہ کار ہے۔ اس کی ابتدا اردو قواعد کے دو ساختی تصورات یعنی صرف اور نحو سے کی گئی ہے۔ چونکہ موضوع کی شروعات شعری نحو سے ہوئی ہے اس

لیے اس میں نحو کی صراحت پر زور دیا گیا ہے جبکہ صرف سے صرف نظر کرنا ضروری تھا۔ یہ مقالہ تمام طلبہ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر شمس بدایونی نے پیش کیا ہے۔ عنوان ہے 'اردو میں انگریزی رموز اوقاف اور صہبائی' انھوں نے بتایا کہ شیخ امام بخش صہبائی کا بیشتر سرمایہ فارسی زبان میں ہے تاہم دور برطانیہ میں انھوں نے اردو میں بھی 'حقائق البلاغت' (1842) (ترجمہ)، انتخاب دواوین (تالیف 1844) اور اُردو رسالہ قواعد صرف ونحو 1845 تصنیف کی ہیں۔ فاضل مصنف نے گوکہ رموز اوقاف پر بہت کچھ کام کیا ہے لیکن اردو میں عربی وفارسی سے مستعار لیے گئے رموز اوقاف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر نصرت جہاں نے 'وحشت کی شاعری میں تصوف' پیش کیا ہے۔ جس میں انھوں نے ان کے کلام میں صوفیانہ عناصر سے بحث کی ہے جس کے دوران غالب اور دیگر شعرا کے کلام سے بھی مدد لی گئی ہے تاکہ وحشت کے صوفیانہ عناصر کی مزید وضاحت وصراحت ہوجائے۔ 'استعماری نظام سے مزاحمت اور اُردو فکشن' محترمہ شہناز رحمٰن نے لکھا ہے۔ اس میں فرنگیوں نے سیاست میں جس چابکدستی سے نفسیات کا استعمال کرتے ہوئے ہندوستانیوں میں محکومیت اور ذلت کا احساس جاگزیں کیا تھا اور اپنی زبان رہن سہن لباس وغیرہ سے ہندوستانیوں پر اپنی فضیلت اور برتری تھوپ دی تھی اس کے خلاف ہندوستانی ادبا اور مصنفین نے اپنا باغیانہ مگر انسانیت آمیز ردعمل پیش کیا تھا۔ مضمون بہت عمدہ ہے۔ 'ادب' کے تحت آخری مقالہ جناب عبدالرحمٰن کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'میر کی شاعری میں مستعمل تلمیحات اور مضمون آفرینی' مضمون کی ابتدا ایک طویل تمہید سے ہوتی ہے جس میں ترسیل خیال میں تقریر وتحریر مختلف شکلوں مثلاً نثر ونظم کلام میں صنعتوں، علم بیان علم معنی کی اہمیت اور علم معنی میں تلمیح جیسے اہم جز کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اپنے مضمون میں جب مصنف نے میر کے پہلے شعر کو بیان کیا اور اس کی تشریح کرتے ہوئے دوسرا شعر یعنی پتہ پتہ بیان کیا تو تب معلوم ہوا کہ اس طویل تمہید کی کتنی ضرورت تھی۔ اچھی کاوش ہے پڑھنے سے علم میں کسی قدر اضافہ تو ضرور ہوگا۔ 'لعل وگہر' میں مزید پانچ مضامین زر وجواہرات کی مانند جگمگا رہے ہیں مگر 'مخمور سعیدی' جو کہ جناب عرفان رشید ڈار نے سپرد قلم کیا ہے نہایت پُرسوز ہے کیونکہ این سی پی یو ایل میں مخمور سعیدی صاحب راقم الحروف کے رفیق کار تھے گوکہ وہ ایڈیٹوریل کے ہیڈ تھے۔ مصنف نے یہ بالکل بجا فرمایا کہ کسی تحریک یا رجحان سے کوئی وابستگی ان کے مزاج میں نہ تھی۔ مبتدیوں کی اصلاح وہ بڑی ہمدردی سے کیا کرتے تھے کہ کہیں ان کی طبع پر گراں نہ گزرے۔ اور جب دیکھئے وہ ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے اور بات اتنی ہی جتنی ضروری ہو۔ قابل مصنف نے ان کے بارے میں اور بھی کئی حقائق سے واقف کرایا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'نگر نگر اُردو' کے ذیل میں جناب محمد اسلام خاں نے 'ضلع بستی کا ادبی منظر نامہ (آزادی سے قبل)' پیش کیا ہے کہ ضلع بستی اتر پردیش کا بہت بڑا ضلع ہے اور یہاں کی شخصیتوں نے آزادی کی لڑائی میں عظیم الشان قربانیاں پیش کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سیاست، مذہب، علم وادب کے میدانوں میں ہر دور میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ باقی تفصیلات اس پیش کردہ منظر نامہ میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ 'سلسلہ صحافت' میں جناب محمد احتشام الحسن نے 'ذرائع ابلاغ اور ہندوستان کے اُردو اخبارات' پیش کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کو قابل مصنف نے کوئی 18 حوالہ جاتی کتب و عاجلانہ ادب کی مدد سے تیار کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے مگر پچھلے برس صحافت کی دوسوسالہ کارکردگی کی روداد کے دوران کافی کچھ تفصیلات نظر سے گزری ہیں تاہم جو چوک گئے ہوں ان کی بازیافت اس مقالے میں ہوسکتی ہے شاید۔ 'جہانِ کلیم' میں دو قابل قدر مضامین دیے گئے ہیں۔ پہلا ڈاکٹر سید احمد قادری صاحب کا لکھا ہوا ہے اور عنوان ہے ''کلیم الدین احمد ناقدوں کے نرغے میں۔''

دوسرا مضمون جناب محمد شمشیر علی کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'کلیم الدین احمد کی خودنوشت نگاری'۔ وہ لکھتے ہیں کہ کلاسیکی ناقدین یعنی مولانا محمد حسین آزاد، سرسید، حالی، امداد امام اثر، شبلی نعمانی کے بعد تنقید میں کلیم الدین احمد کی گھن گرج والی مضبوط و منفرد آواز گونج اٹھی جو مغرب زدہ جدت آمیز معروضی اور بے لاگ تھی، جس نے اُردو ادب کو بے حد متاثر کیا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت 'اپنی تلاش میں' لکھا جس کی پہلی جلد نو حصوں اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے۔ 'خصوصی گفتگو' کے تحت دراصل ایک انٹرویو ہے جو جناب عبدالمنان صمدی نے جناب طارق چھتاری صاحب سے لیا ہے۔ اور اس روداد کو عنوان دیا ہے۔ 'اُردو صرف ادب تک محدود رہی تو ختم ہوجائے گی' اور یہ اہم بیان جناب چھتاری صاحب کا دیا ہوا ہے۔ ان کا یہ بیان برحق ہے کہ اگر اردو کو ادب کی حد تک ہی محدود رکھا گیا تو اردو کمزور ہوجائے گی۔ راقم الحروف کے خیال میں اگر ادب میں سائنس دخیل ہو تو اُردو ادب کی راہیں روشن ہوسکتی ہیں۔ 'ذکر جمیل' دراصل گوشۂ جمیل ہے جس کے ذیل میں دو مضامین 'جمیل مظہری کی نظم نگاری' اور 'جمیل مظہری کی نظمیہ شاعری' بالترتیب ڈاکٹر محمد ضمیر رضا اور سمیہ محمدی سلمہا کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر رضا کا بیان ہے کہ جمیل مظہری نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے بیان کو اشعار کی مدد سے مدلل کیفیت عطا کی ہے۔ جبکہ سمیہ سلمہا نے اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کی مانند جمیل مظہری کی 'فریاد' اور 'جواب فریاد' کے حوالے سے لاجواب موازنہ کیا ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' کے ذیل میں دو مقالے درج ہیں۔ ایک تو 'خواتین افسانہ نگاروں کے نسائی کردار' آفرین رضا سلمہا کی تحقیقی کاوش ہے۔ لیکن یہ موضوع اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ کوئی مستقل قاری ان کرداروں کو انگلیوں پر گنا دے گا۔ پھر بھی پڑھ لیجیے۔ شاید کوئی نئی بات ہاتھ لگ جائے۔ دوسرا مقالہ جناب محمد محتشم کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری' انھوں نے لکھا ہے کہ انشائیہ میں محض ہنسی مذاق کے کسی اعلیٰ مقصد/ موضوع کو کچھ اس طرح سے پیش کیا جائے کہ اس میں طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ اصلاح پذیری کا پہلو بھی شامل ہوجائے۔ بہرحال مقالے کا مقصد اچھا ہے اور یہی اوصاف احمد جمال پاشا کے انشائیوں میں بھی شامل ہوں گے۔ 'کتابوں کی دنیا' میں تبصرہ وتعارف کے ذیل میں کوئی 14 کتب پر تبصرے دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں آپ اپنی پسند کی کتاب/ کتابیں یا سارے ہی کتب حاصل کرسکتے ہیں تاکہ آپ کی لائبریری اَپ ڈیٹ رہے۔ کیا خیال ہے؟ 'خیر خبر نامہ' میں اُردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں شامل ہیں جو معلومات میں اضافے کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ سال بھر کا 'لاسٹ بٹ ناٹ دی لیسٹ' ثابت ہوگا۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

غضنفر

اجنبی جہانوں سے روبرو کرانے والا جامِ جم

اس وسیع و عریض دنیا کے تمام تر مشاہدات و تجربات، تصورات و خیالات اور جذبات و محسوسات کو کسی ایک زبان کے وسیلے سے تمام انسانوں کے ادراک و احساس تک پہنچانا ممکن نہیں اسی لیے ان کی مختلف زبانوں میں منتقلی کی صورت نکالی گئی اور اس صورت کو ترجمے کا نام دیا گیا۔ یعنی ترجمہ ایک ایسا وسیلہ ہے جو ایک زبان کے افکار و اسرار کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرتا ہے کہ وہ اس دوسری زبان کا حصہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

ترجمہ وہ جام جم ہے جس میں ہم نا دیدہ دنیاؤں کو بھی دیکھ پاتے ہیں۔ اجنبی جہانوں سے بھی مانوس ہو جاتے ہیں۔ اپنی بینائی میں نئے منظروں کا رنگ بھی بھر لیتے ہیں اور ان نئے نظاروں سے منعکس ہونے والے نور کو بھی اپنے سینے میں اتار لیتے ہیں۔

ترجمہ وہ قبلہ نما ہے جو دوسروں کے قبلے کو بھی ہمارے قریب کر دیتا ہے۔ ہمارے دیدوں میں نئے راستوں کے چراغ رکھ دیتا ہے۔ ہم کو نئی سمتوں کا پتا بھی ملنے لگتا ہے اور ہمیں نئی منزلیں بھی حاصل ہونے لگتی ہیں۔

ترجمہ دوسری دنیاؤں کے متعلق محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ ہمارے محسوسات کو بھی مستفیض کرتا ہے اور حواس کو نئی اڑانوں کے لیے مہمیز بھی کرتا ہے۔

ترجمے کا یہ عمل اظہار کا ایسا پیرایہ اختیار کرتا ہے کہ دو زبانوں کے مواد کو ایک بنا دیتا ہے۔ زبانوں اور زبانوں کے توسط سے ایک سے زیادہ تہذیبی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو ایسا ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور غیر بھی اپنا لگنے لگتا ہے مگر یہ فن آسان نہیں ہے کہ دوسرے کی روح کو اپنے قالب میں ڈھالنا ایک مشکل امر ہے۔ اس عمل میں دماغ کی نسیں پھٹتی ہیں، پتلیاں جلتی ہیں، اعصاب اکڑ جاتے ہیں، مناسب اور متبادل لفظ کی تلاش میں دیر اور دور تک بھٹکنا پڑتا ہے اور لسانی جھاڑیوں میں بھٹکنا سہل نہیں ہوتا۔ اس سفر میں شعور وادراک چھلنی ہو جاتے ہیں۔

تخلیقی تحریروں کا ترجمہ تو اور بھی مشکل ہوتا ہے کہ اس کے لیے علمی لیاقت اور لسانی مہارت کے ساتھ ساتھ تخلیقی بصیرت بھی درکار ہوتی ہے، تخئیلی قوت اور قوتِ احساس بھی چاہیے ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک زبان کی تخلیقیت جو مخصوص تہذیبی امور، ادبی شعور اور جذباتی وفور سے معرض وجود میں آتی ہے، کو دوسری زبان میں برقرار رکھنا ہوتا ہے اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو تخلیقی پروسیس کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اسے برتنا بھی جانتا ہو۔

اور اگر بچوں کا ادب ہے تو اس کی منتقلی کے لیے تخلیقی استعداد کے ساتھ ساتھ اس لسانی شعور کا بھی ادراک ضروری ہوتا ہے جو بچوں کی ذہنی سطح اور اس سطح سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کا بھی علم رکھتا ہوتا کہ وہ انھیں لفظوں کا انتخاب کر سکے جو بچوں کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہوں۔ بچوں کے ادب کا ترجمہ کرتے وقت ہدف زبان (Target language) میں لفظ تو مل جاتا ہے مگر کبھی کبھی وہ متبادل نہیں بن پاتا اس لیے کہ وہ بچوں کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا جبکہ اصل مفہوم تک پہنچنے کے لیے ہر طرح کی مطابقت ضروری ہے۔ ایسے میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مترجم مراقبے کے عمل سے گزرے۔ دھیان میں بیٹھے، اطمینان سے ذہن و نظر کو دور دور تک دوڑائے اور مناسب و موزوں ترین لفظ کی تلاش کرے اور اگر اس کے بعد بھی مطلوبہ لفظ ہاتھ نہ آئے تو وہ اپنی تخلیقی ذہانت کا استعمال کرے اور کوئی ایسا لفظ اختراع کرے جو اس معنی و

> تخلیقی تحریروں کا ترجمہ تو اور بھی مشکل ہوتا ہے کہ اس کے لیے علمی لیاقت اور لسانی مہارت کے ساتھ ساتھ تخلیقی بصیرت بھی درکار ہوتی ہے، تخئیلی قوت اور قوت احساس بھی چاہیے ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک زبان کی تخلیقیت جو مخصوص تہذیبی امور، ادبی شعور اور جذباتی وفور سے معرض وجود میں آتی ہے، کو دوسری زبان میں برقرار رکھنا ہوتا ہے اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو تخلیقی پروسیس کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اسے برتنا بھی جانتا ہو۔

مفہوم کو ادا کر سکے۔ یقیناً اس عمل میں وقت تو لگے گا مگر ترجمے کا حق ادا ہو جائے گا۔

ترجمہ شدہ کتابوں اور ترجمے کے فن پر غور و خوض کرتے وقت جو مشاہدات (observations) میرے سامنے آئے میں انھیں پیش کر رہا ہوں، ممکن ہے میرے یہ مشاہدات ترجمے کے میدان میں کام کرنے والے خصوصاً نئی نسل کے مترجمین کے کام آسکیں اور بہتوں کے لیے رہنما اصول بھی بن جائیں۔

1 متن کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کا مقصد یہ ہے کہ مفہوم پوری طرح منتقل ہو جائے۔ بعض تحریروں میں معنی کی ایک سے زیادہ تہیں ہوتی ہیں وہ ساری کی ساری تہیں اصل زبان سے ہدف زبان میں آجائیں۔

2 متن کا کوئی اہم پہلو یا جزو چھوٹنے نہ پائے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ شدہ کتابوں یا تحریروں میں اصل متن کے کچھ اجزا چھوٹ جاتے ہیں یا بعض مترجم کچھ حصوں کو غیر ضروری یا مشکل یا ناقابل فہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے اس رویے سے کبھی کبھی بعض ضروری باتیں رہ جاتی ہیں اور پوری تحریر میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم متن کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔

3 اصل متن میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ بھی مناسب نہیں، اس لیے کہ اس عمل سے منشائے مصنف متاثر ہو سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے متن میں غیر ضروری اطلاعات بھی شامل ہو سکتی ہیں یا غیر ہم آہنگ عناصر بھی داخل ہو سکتے ہیں جن سے بنیادی موضوع و مواد کی معنویت متاثر ہو سکتی اور اثر انگیزی میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

4 اگر کوئی عبارت گنجلک یا غیر واضح ہے تو اس کی وضاحت پر بھی توجہ کی جائے۔ بعض مصنفین اشاراتی انداز بیان استعمال کرتے ہیں جس کے باعث ان کی باتیں مبہم رہ جاتی ہیں یا اشکال کی شکار ہو جاتی ہیں۔ یا بعض نکتوں کی ترسیل نہیں ہو پاتی۔ ایسی صورت میں ترجمہ کرتے وقت اس عبارت کی وضاحت و صراحت پر دھیان دینے کی ضرورت ہے تا کہ معانی و مفاہیم پوری طرح سمجھ میں آسکیں۔ بعض ادبی تحریروں میں مصنف کے اشاروں اور ابہام کو بھی برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے تا کہ تخلیقی حسن مجروح نہ ہونے پائے لیکن علمی اور سائنسی نگارشات میں اسے برقرار رکھنا مناسب نہیں کہ یہاں ادبی حسن کے بجائے معلومات کی ترسیل زیادہ ضروری ہے۔

وضاحت مختلف انداز سے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک تو یہ کہ عبارت کو رواں زبان میں واضح کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وضاحت قوسین میں کی جائے اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وضاحتی بیان حاشیے پر لکھ دیا جائے۔ مضمون کے آخر یا کتاب کے اختتام پر بھی نوٹ کی شکل میں وضاحتیں درج کی جا سکتی ہیں۔

5 فن ترجمہ نگاری کا ایک اہم اور کارگر عنصر یا وسیلہ اصطلاح ہوتی ہے۔ مگر اصطلاحات کے انتخاب و استعمال میں ہشیاری اور ہنر مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمے کے دوران ایسی اصطلاحیں منتخب کی جائیں اور انھیں اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ مفہوم کی مکمل ترسیل کر سکیں اور بولنے اور سننے میں بھی آسان ہوں۔ کوشش یہ ہو کہ پہلے سے موجود اور مروجہ اصطلاحیں ہی استعمال کی جائیں اور اصطلاحات موجود نہ ہونے کی صورت میں اصطلاحیں وضع کی جائیں مگر ان کے ساتھ انگریزی اصطلاح بھی قوسین میں لکھ دی جائیں۔ اصطلاحات سازی میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ جو اصطلاحیں وضع کی جائیں وہ آسان، رواں اور قابل فہم ہوں۔

6 بعض عبارتیں اصطلاحوں کی وجہ سے گنجلک اور بوجھل ہو جاتی ہیں اور سمجھ میں نہیں آپاتیں یا مستعمل اصطلاحیں معنی و مفہوم کی ترسیل نہیں کر پاتیں۔ ایسی صورت میں اصطلاحوں کی وضاحت کر دینی چاہیے تا کہ پڑھنے والا عبارت کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اگر وہ تحریر ادبی نوعیت کی ہے تو اس سے پورے طور پر محظوظ بھی ہو سکے۔

7 ترجمے کی زبان کا استعمال مواد و موضوع یا نفس مضمون کی مناسبت سے کیا جائے۔ ہر موضوع یا مضمون اپنے لیے مخصوص زبان و بیان کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے موضوع کے پیش نظر اظہار کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ زبان مختلف رنگ روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر علمی مضامین کی زبان الگ ہوتی ہے اور ادبی موضوعات کی الگ۔ ادب میں بھی افسانوی ادب کی زبان الگ اور غیر افسانوی ادب کی زبان الگ۔ ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ متن کے موضوع و مواد سے مطابقت رکھنے والے وسیلۂ اظہار کا استعمال ہو۔ مثلاً علمی اور سائنسی موضوعات کے ترجمے میں ایسی زبان استعمال کی جائے کہ سارا زور معلومات کی ترسیل پر صرف ہو۔ یعنی مقصد معلومات فراہم کرنا ہو، نہ کہ زبان و بیان کا کرشمہ دکھانا اور اگر کوئی ادبی تخلیق ہے تو اس کی منتقلی میں اس بات کا پورا خیال رکھا جائے کہ کسی بھی طرح جاذبیت باقی رہے اور ہر حال میں ادبیت باقی رہے۔

یہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ کسی تحریر کا ترجمہ کن کے لیے کیا جا رہا ہے؟ بہتر اور موثر ترسیل و ابلاغ کے لیے قاری یا سامع کی ذہنی سطح اور ان کے ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بچوں کی کتابوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اس بات کی سعی ضروری ہے کہ وہی الفاظ لائے جائیں جو ان کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود ہوں اور جو ان کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہوں۔

8 چونکہ ترجمے کا مقصد ہے ایک زبان کی باتوں کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنا یا دوسری زبان میں منتقل کرنا، اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہدف زبان کی ایسی صورت اختیار کی جائے جو منتقلی کا کام آسانی اور روانی کے ساتھ کر سکے۔ یعنی زبان کی اظہاری صورت ایسی ہو کہ جسے سبھی سمجھ سکیں۔ اس کے لیے سادہ، سہل، رواں، مانوس، مناسب اور موزوں الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مشکل، ادق، غریب اور نامانوس لفظوں سے بچا جائے۔ جملوں کی ساخت ایسی تیار کی جائے کہ پڑھتے وقت کہیں بھی کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ محسوس ہو۔ اس نکتے کو سامنے رکھا جائے کہ تحریر میں آسانی اور روانی عام طور پر آسان لفظوں اور چھوٹے جملوں سے آتی ہے۔ مشکل و ادق الفاظ اور پیچیدہ و مرکب جملوں سے روانی میں کمی آتی ہے۔ ساتھ ہی مفہوم کو سمجھنے میں دشواری بھی ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو عبارت گنجلک اور ناقابل فہم بھی ہو جاتی ہے۔

8 اگر کسی تحریر میں تہذیبی امور کا ذکر ہو تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ متن اپنی تہذیب و ثقافت کے رنگ کے ساتھ منتقل ہو، ادبی نگارشات میں تو عموماً یہ رنگ ہوتا ہی ہے بعض علمی کتابوں میں بھی کسی قوم یا ملک کے ثقافتی عناصر موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمہ کرتے وقت یہ سعی کی جانی چاہیے کہ وہ عناصر ترجمے میں آجائیں تا کہ کتاب کے موضوع و مواد کو صحیح تناظر میں سمجھا جا سکے۔

اگر اصل زبان کے تہذیبی امور یا ثقافتی اجزا کے اظہار کے لیے ہدف زبان میں کوئی متبادل ہے تو اسے استعمال کیا جائے ورنہ ان تہذیبی نکات کی مناسب انداز سے وضاحت کر دی جائے۔

9 متن کا موضوع اگر علمی نوعیت کا ہو اور اس میں کوئی شعری اقتباس نقل ہو تو اس اقتباس کا شعری ترجمہ کرنے کے بجائے اسے آسان نثر میں بیان کر دیا جائے اور اگر تحریر شعری نوعیت کی ہو اور مترجم کو شعری ترجمے پر قدرت ہو اور اس بات کا اسے یقین ہو کہ نظم نظم کے قالب میں اچھی طرح ڈھل سکتی ہے تو یہ بہتر صورت ہو سکتی ہے۔

10 ترجمہ کرتے وقت پیراگرافنگ کا پورا خیال رکھا جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک پیراگراف کا مواد ہدف زبان میں دو یا دو سے زیادہ پیراگراف کا تقاضا کر بیٹھے ایسے میں یہ ضروری ہے کہ پیراگرافنگ مواد کے تقاضے کے مطابق کی جائے۔ ایسا نہ کر پانے پر ممکن ہے کہ مفہوم پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ ترجمے کے تقاضے کے مطابق اگر کہیں پر ایک پیراگراف کی جگہ ایک سے زیادہ پیراگراف کی ضرورت پڑتی ہے تو اس ضرورت کا ضرور خیال رکھا جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ ایک بات یا ایک نکتہ ایک پیراگراف میں ختم ہو جائے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری اپنی زبان میں بھی پروپر پیراگرافنگ کا خیال بہت کم رکھا جاتا ہے۔ بہت ساری باتیں ایک ہی پیراگراف میں لکھ دی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے نکتے آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں اور باتیں واضح نہیں ہو پاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں انشا نگاری کی مشق اس طرح نہیں کرائی جاتی جس طرح کرانی چاہیے اور نہ ہی عبارت سازی، انشا پردازی، پیراگرافنگ وغیرہ کے فن پر کوئی معقول و معیاری تدریسی نوعیت کی کتاب لکھی گئی جو طلبہ کی رہنمائی کر سکے۔ اس طرح کے بنیادی موضوعات پر مینوول تیار کیا جانا چاہیے۔ شارٹ ٹرم تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا جانا چاہیے تاکہ لکھنے والوں کی رہنمائی ہو سکے۔

11 پیراگرافنگ کے ساتھ ساتھ رموز اوقاف (Punctuations) کا بھی خیال رکھا جائے ترجمہ کرنے والے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ رموز اوقاف کا استعمال کرے۔ اس سے مفہوم آسانی سے واضح ہو جاتا ہے، غلط فہمی یا نا سمجھی کا امکان باقی نہیں رہتا۔ متن کی ادائگی میں بھی آسانی ہوتی ہے، آنکھوں پر زور بھی نہیں پڑتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کے رموز اوقاف اور ان کے علامات و نشانات سے واقف ہو۔ اردو کے مترجم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اردو زبان میں آٹھ رموز اوقاف رائج ہیں۔ سب کے نام اور نشانات ہیں اور سبھی کے محل استعمال جدا جدا ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ سکتہ کہاں اور وقفہ کس جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کی زیادہ تر تحریروں میں وقفے کی جگہ بھی سکتہ کا ہی استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو میں جو رائج رموز اوقاف ہیں، آپ کی سہولت کے لیے ان کے نام اور نشانات یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

سکتہ ، وقفہ ؛ رابطہ : ختمہ ۔ سوالیہ ؟ فجائیہ/ندائیہ ! قوسین ( ) واوین " "

12 کسی دوسری زبان مثلاً انگریزی یا ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اکثر اردو کی ساخت غیر رواں یا بوجھل ہو جاتی ہے۔ اس بوجھل پن سے بچنے اور روانی لانے کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل زبان کے بجائے ہدف زبان کی ساخت (Structer) کے اصولوں کو عمل میں لایا جائے۔ یعنی جملوں کی ساخت، اجزا کی ترتیب وغیرہ ہدف زبان کی قواعد کے مطابق ہو۔ ایسا کرنے سے بہت ساری پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں اور ترجمے کی زبان بھی فطری محسوس ہوتی ہے۔

ترجمہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے متن کو اپنی زبان کا متن بنا دے۔ ایسی ہنر مندی اور فنی چابک دستی دکھائے کہ اجنبی تحریر بھی مانوس محسوس ہونے لگے۔ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں ایسی کاریگری دکھائے کہ پڑھتے وقت کہیں بھی ذہن کو جھٹکا نہ لگے اور پڑھنے والے کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

13 بعض ترجموں کو پڑھتے وقت زبان اکھڑی اکھڑی سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زبان کی ساخت ہدف زبان کے اصولوں کے مطابق ترتیب نہ پا سکی یا کچھ جگہوں پر کمی رہ گئی۔ ترجمے کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ پڑھتے وقت یہ نہ لگے کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ محسوس ہو کہ ہم اپنی زبان کی کوئی تحریر پڑھ رہے ہیں۔

14 جہاں لفظی ترجمے کی ضرورت ہو وہاں لفظی ترجمہ کیا جائے اور جہاں یہ محسوس ہو کہ لفظی ترجمے سے کام نہیں چلے گا تو وہاں مفہوم بیان کر دیا جائے۔

15 کبھی کبھی کسی کسی عبارت میں دوسری زبان کا قول بھی آ جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی کی کتاب میں فرانسیسی یا عربی یا ہندی کی کتاب میں سنسکرت یا کسی اور زبان کا قول ہو تو ایسی صورت میں متن کو اسی طرح برقرار رکھا جائے اور اس کا ترجمہ ہدف زبان میں کر دیا جائے۔ ایسی جگہوں پر خط کھینچ دینا بہتر ہوگا۔

16 ترجمہ کرتے وقت کہیں پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اصل متن میں کوئی جز و رہ گیا ہے یا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو پایا ہے۔ ایسی صورت میں ادھوری محسوس ہونے والی بات کو ہدف زبان میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ وہ ادھوری نہ لگے یا اس کا ادھوراپن دور ہو جائے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مترجم کو اپنی طرف سے کچھ جوڑنا یا اضافہ کرنا ہوگا اور بہتر ترسیل کے لیے مترجم کو ایسا کرنا بھی چاہیے مگر احتیاط بہت ضروری ہے ورنہ بننے کے بجائے عبارت بگڑ بھی سکتی ہے۔

17 مترجم کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ معلومات کے ساتھ متن میں دلچسپی بھی قائم رہے تاکہ اسے ذوق وشوق سے پڑھا جا سکے۔ پڑھتے وقت کہیں بھی رکاوٹ اور اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔

18 ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اصل زبان کے علمی، لسانی اور قواعدی اصولوں اور معیاروں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ساتھ ہی ہدف زبان کے روزمرہ اور محاورے کا بھی خیال رکھا جائے تاکہ کسی کا بھی رنگ پھیکا نہ پڑنے پائے۔

19 ترجمے کے دوران ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ساخت ہدف زبان کے مطابق ہو نہ کہ کسی اور زبان کے۔ مثال کے طور پر مترجم کو اگر انگریزی یا ہندی سے سے کسی متن کو اردو میں منتقل کرنا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ جملوں کی ساخت اردو کے مزاج کے مطابق بنائے نہ کہ انگریزی یا ہندی کے۔

20 اصل زبان کے محاوروں، ضرب الامثال اور افعال ترکیبی ترجمہ نہ کیے جائیں بلکہ ان کے متبادل محاورے، امثال اور افعال ترکیبی ہدف زبان میں تلاش کر کے استعمال کیے جائیں۔ اگر ہدف زبان میں متبادل موجود نہ ہوں تب ان کا مفہوم بیان کیا جائے۔

ترجمہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے متن کو اپنی زبان کا متن بنا دے۔ ایسی ہنرمندی اور فنی چابک دستی دکھائے کہ اجنبی تحریر بھی مانوس محسوس ہونے لگے۔ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں ایسی کاریگری دکھائے کہ پڑھتے وقت کہیں بھی ذہن کو جھٹکا نہ لگے اور پڑھنے والے کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

یہ باتیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا اچھی ترجمہ نگاری کے لیے یقیناً کارآمد ثابت ہوں گی اور ان سے رہنمائی ملے گی مگر علم و فن کے دائرے کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی سوچ کچھ نہ کچھ علم و فن کے ہر شعبے میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ انفرادی افکار سے موجود دائرہ متاثر ہوتا رہتا ہے اور وقت کے تقاضے اور انسانی سوچ کے تغیرات کے باعث یہ دائرہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور ہمیشہ اس بات کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش کے نتائج کو جگہ ملتی رہے۔

■

Dr. Ghazanfar
Bushra, Lane A-12
Hamza Colony
New Sir Syed Nagar Extension
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 7678436704

ابوبکر عباد

اردو فکشن کی تنقید میں ہندو فکشن نگاروں کا حصہ

اردو زبان کے تعلق سے یہ شدید غلط فہمی ہے کہ یہ بدیسی یا مسلمانوں کی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان نہ تو بدیسی ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی ہے۔ اس کے بارے میں یہ غلط بات بھی مشہور ہے کہ اس زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ حد سے زیادہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور اس نے اپنے دامن میں عربی، فارسی، ترکی، پرتگیزی، ہندی، سنسکرت، اور انگریزی زبان کے الفاظ کے ساتھ ہندوستان کے بیشتر علاقائی الفاظ کو بھی جگہ دی۔ اس لحاظ سے یہ خالص ہندوستان اور ہندوستانیوں کی زبان ہے، جو دنیا کے بیشتر مما لک میں بولی، سمجھی اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔

اردو زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور اس نے اپنے دامن میں عربی، فارسی، ترکی، پرتگیزی، ہندی، سنسکرت، اور انگریزی زبان کے الفاظ کے ساتھ ہندوستان کے بیشتر علاقائی الفاظ کو بھی جگہ دی۔ اس لحاظ سے یہ خالص ہندوستان اور ہندوستانیوں کی زبان ہے،جو دنیا کے بیشتر ممالک میں بولی، سمجھی اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کے دوسرے شعبوں کی طرح فکشن میں بھی ہندو ادیبوں کی لائق افتخار خدمات اور ان کے افسانوی ادب کا نا قابل فراموش سرمایہ موجود ہے۔ اس حوالے سے سب سے پہلا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ جنھوں نے فکشن کی مشرقی روایات سے انحراف کرنے اور انگریزی اصولوں پر اولین ناول لکھنے کا دعویٰ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے فکشن کی تنقید بھی لکھی اس ضمن میں ان کا مضمون 'ناول نگاری' بے حد اہم ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے داستان اور ناول کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ یہ مضمون بعد کا ہے۔ اس سے قبل وہ فسانہ آزاد کے مقدمہ میں اپنے جدید ناول نگار ہونے اور انگریزی طرز پر ناول لکھنے کا دعویٰ کر چکے تھے، لہٰذا فسانۂ آزاد کی جلد چہارم کے مقدمے کو بھی اسی زمرے میں رکھنا چاہیے، کہ یہ بھی ان کے مضمون کی طرح ان کے نظریۂ ناول کی تفہیم کے لیے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

دعوے کے مطابق سرشار انگریزی طرز میں جدید ناول کی بنیاد ڈال رہے تھے مگر درحقیقت غیر شعوری طور پر وہ قدیم افسانوی ادب کے اثر سے پوری طرح آزاد نہ ہو پائے تھے، کہ فسانۂ آزاد ایک حقیقی دنیا کا قصہ ہونے کے باوجود اپنی ساخت (مثالی کردار، آرائشی زبان، قصہ در قصہ کی تکنیک اور غیر معمولی مبالغہ) اور کہانی کی تشکیل کے اعتبار سے ناول کے مقابلے داستان سے زیادہ قریب ہے۔ کہ اس میں بھی مختلف واقعات کی مدد سے ایک ایسے شخص کی کہانی گڑھی گئی ہے جو داستان کے شہزادوں کی طرح علوم وفنون کا ماہر ہے اور ایک حسینہ کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے ایما پر ایک بڑی مہم سر کرنے نکلتا ہے اور مختلف مراحل ومنازل طے کرنے اور طرح طرح کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے بعد بالآخر کامیاب وکامران واپس لوٹتا اور اپنی محبوبہ سے شادی رچاتا ہے۔

فسانۂ آزاد میں واقعات کی کثرت، تنوع اور سنسنی خیزی یقیناً کسی داستان سے مختلف نہیں ہے، اس کے باوجود 'فسانۂ آزاد' پر داستان کا اطلاق یوں نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پس منظر تصوراتی عالم کی بجائے حقیقی دنیا ہے۔ جس میں ناول کے فن کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جیتا جاگتا شہر، ایک خاص عہد کا معاشرہ اور اس میں رہتے بستے لوگ اپنی اپنی فطرت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

'فسانۂ آزاد' پنڈت رتن ناتھ سرشار کا پہلا ناول ہے اور سب سے زیادہ مشہور بھی یہی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں فنی اعتبار سے ان کا ناول 'جام سرشار' اپنے مربوط پلاٹ اور کہانی کے ایک آغاز، ارتقا اور انجام کی وجہ سے کافی حد تک ناول کے فارم کو پیش کرتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد اور 'جام سرشار' کے علاوہ اور بھی کئی ناول لکھے ہیں جن میں سیر کوہسار، کامنی، خدائی فوجدار، پی کہاں، ہشو، کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن، طوفان بے تمیزی، 'چنچل نار' اور 'گور غریباں'، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ 'چنچل نار' 'دبدبۂ آصفی' میں قسط وار شائع ہوتا تھا لیکن اس کے مکمل ہونے کی نوبت نہیں آئی، جب کہ 'گور غریباں' کا مسودہ مکمل ہونے کے باوجود اشاعت کے مرحلے سے بوجوہ نہیں گزر سکا تھا۔ ان کی ماخوذ و مترجمہ تصانیف میں 'اعمال نامۂ روس'، 'شمس الضحیٰ'، اور 'الف لیلیٰ' کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں۔

پنڈت برج نرائن چکبست اچھے شاعر اور نثر نگار تھے اور شاعری، فکشن کے نقاد بھی۔ چکبست کا اردو فارسی ادبیات کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ 'گلزار نسیم' سے متعلق مباحثے کے سلسلے میں انھوں نے معترضین کے فنی، لسانی، معنوی اور ادبی اعتراضات کے جواب جس خوبی سے دیے ہیں وہ ان کی علمیت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا جب آغاز ہوا اس وقت تک حالی اور شبلی کی تنقیدی نگارشات سامنے آچکی تھیں۔ البتہ تب اردو فکشن کی تنقید کا باضابطہ آغاز نہ ہوا تھا، لیکن فکشن سے متعلق مرزا محمد ہادی رسوا کے خیالات خطوط اور دیباچوں کی شکل میں اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولوی عبدالحلیم شرر کے ابتدائی مضامین منظر عام پر آچکے تھے۔ چکبست نے پہلی بار اردو کی بعض اہم ادبی شخصیتوں بالخصوص لکھنؤ کے نثر نگاروں مثلاً منشی سجاد حسین، منشی جوالا پرشاد برق، تربھون ناتھ ہجر اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف وغیرہ پر مضامین لکھے، جن میں ان کی نثر کی فنی خصوصیات پر معتبر اور معتدل گفتگو کی۔

فکشن کی تنقید کے تعلق سے ان کا نظریہ ان کے صرف ایک مضمون 'پنڈت رتن ناتھ سرشار' میں ملتا ہے، جو رسالہ 'کشمیر درپن' کے مئی 1904 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس طویل مضمون کی حیثیت سرشار اور ان کی ناول نگاری کے سلسلے میں متوازن تنقیدی اور تقابلی مطالعے کی ہے۔ مضمون میں چکبست نے سرشار اور فسانۂ آزاد پر عائد الزامات اور ان دونوں کی بیجا تعریف سے قطع نظر ناول کے فن، بالخصوص فسانۂ آزاد سے متعلق اصولی بحث کی ہے۔ گو کہ مضمون کی نوعیت کسی دفاعی اور اندازِ بیان مناظرانہ ہے اس کے باوجود انھوں نے بڑی حد تک اس میں اعتدال برتنے کی کوشش کی ہے۔ 'فسانۂ آزاد' کی اہمیت اور قدر و قیمت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی نزاکت، جواب وسوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاوروں کی صفائی، روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گل کاری، تراشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا والہ وشیدا بنالیا... محض قصہ سمجھ کر فسانہ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر نافہمی ہے، اس فسانہ کا انحصار اس کی داستان کے مسلسل ہونے پر نہیں ہے۔ حضرت سرشار نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔'' (مضامین چکبست، لکھنؤ، 1344ھ، ص 40)

لفظوں کی نئی تراش' ترکیبوں کی خوبصورتی' کلام کی گرمی' مضامین کی شوخی' طرز تحریر کی نزاکت' جواب وسوال کی نوک جھونک' زبان کی پاکیزگی' محاوروں کی صفائی' روز مرہ کی لطافت' ظرافت کی گل کاری' تراشوں کی نئی پھبن' ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا واله وشیدا بنالیا... محض قصہ سمجھ کر فسانہ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر نا فہمی ھے' اس فسانہ کا انحصار اس کی داستان کے مسلسل ھونے پر نہیں ھے- حضرت سرشار نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ھوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ھے- اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ اس مٹی ھوئی حالت پر بھی ایک عالم ھے-'

فسانۂ آزاد کی خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس کے کچھ عیوب بھی گنواتے ہیں اور شرر اور سرشار کے فن کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کرتے ہیں۔ پورے مضمون میں چکبست نے فنی معیار، تنقیدی اصول اور گفتگو کی سطح کو برقرار رکھا ہے۔

چکبست نے ناول کے واقعات کے انتخاب، پلاٹ کی تنظیم، واقعات میں سبب اور نتیجے کی منطق، کرداروں کی تخلیق اور ناول کی زبان کے بارے میں اپنے خیالات کا جس طرح اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ناول کا تصور خود سرشار اور شرر (جنھوں نے ناول کے علاوہ ناول کی تنقیدیں بھی لکھی ہیں) کے مقابلے میں زیادہ واضح اور فن کے جدید اصولوں سے بے حد قریب ہے۔

منشی پریم چند ہمارے پہلے باضابطہ اہم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کثیر تعداد میں افسانے لکھے ہیں، ناول لکھے ہیں اور ناول اور افسانے بلکہ یوں کہیے کہ فکشن کی تنقید بھی بہ نسبت زیادہ لکھی ہے۔ ناول سے متعلق، منشی پریم چند کے چار مضامین خاصے اہم ہیں۔ یہ مضامین ہیں: 'اردو زبان اور ناول'، 'شرر و سرشار'، 'ناول کا فن' اور 'ناول کا موضوع'، جن کا زمانۂ تحریر 1910 سے لے کر 1931 تک کے عرصے کو محیط ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جس زمانے میں پریم چند عالمی پیمانے کے ناول لکھ رہے تھے اس زمانے میں ان کی فکشن تنقید کسی حد تک مبتدیانہ نوعیت کی ہے۔ پریم چند کا ذہن دراصل خلاقانہ تھا، ناقدانہ نہیں۔ پریم چند اپنے پہلے مضمون 'اردو زبان اور ناول' میں لکھتے ہیں:

''اردو دنیا کے لیے ناول ایک اچھوتی چیز تھی۔ زبان میں ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانوں سے زیادہ دلآویز، اور معمولی مثنویوں سے زیادہ پرلطف تھی اس لیے پبلک نے حسب حیثیت ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور برائے چند، ناولوں کی خوب گرم بازاری رہی۔''
(مضامین پریم چند، مرتبہ عتیق احمد

دوسرے علوم و اصناف کے مقابلے میں پریم چند ناول کی وکالت کرتے ہوئے اس کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تاریخ، پالیٹکس یا فلسفے کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے اس طور ممکن نہیں کہ دنیا کی بیشتر

آبادی جو تلاش روزگار اور کسب معاش کی فکر میں پریشان رہتی ہے اس کے لیے ایسے علوم کا مطالعہ دلچسپی کے بجائے ایک بے رس مشکل ترین عمل ثابت ہوگا۔'' سو یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے۔'' چنانچہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس فن کے توسط سے دوسرے اہم اور مفید علوم کی تحصیل کہیں زیادہ بہتر اور آسان طریقے سے کی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ پریم چند عالمی ادب اور اس کے فنی طریق کار سے آشنا اور اس کے حامی تھے، کہ وہ خود زندگی اور معاشرے کی اصلاح کو ناول کے فرائض میں شامل کرتے تھے، ساتھ ہی وہ اس نزاکت سے بھی واقف تھے کہ انسانی فطرت پر اثر انداز ہونے والی یہ لطیف تحریر کب تک فن رہتی ہے اور کب فن کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ناول نگاروں کو استادانِ فن کی تخلیقات کا مطالعہ، انسانی نفسیات کا بغور مشاہدہ، سچے جذبات کی عکاسی اور خیالات میں تازہ کاری کا مشورہ دیتے ہیں۔ پریم چند کے آخری تین مضامین سے ناول کی تعریف و تقسیم اور اس کے منصب و مقصود کی تعیین ہوتی ہے۔ گو کہ انھوں نے 'ناول کا فن' میں لکھا ہے کہ ''ناول کی تعریف انتہائی مشکل ہے، آج تک اس کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہو سکی جس پر سب لوگ متفق ہوں۔'' لیکن اپنے ایک دوسرے مضمون 'شرر و سرشار' میں اس کی مفصل تعریف یوں کرتے ہیں:

''ناول انگریزی لفظ ہے اور اگر اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے تو وہ فسانہ ہے۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہے۔ ناول اس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا، جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو، صاف صاف چربہ اتارے۔ اور اس کے رسم و رواج، مراسم و آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادات کو دخل نہ دے، یا اگر دے تو اس کی تاویل بھی اس خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگے، اسی کا نام ہے ناول یا فسانہ۔'' (ایضاً، ص، 38-237)

پریم چند ناول کو ناول کے خالق کی شخصیت، اس کے کردار، اس کے فلسفۂ حیات اور اس کے نتائج فکر کا آئینہ قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مصنف اگر رجائی ہے تو اس کی تخلیقات میں بھی امیدوں کی روشنی اور حوصلوں کی تازگی نظر آتی ہے، اور اگر وہ قنوطی ہے تو ہزار کوششوں کے باوجود بھی اپنے کرداروں کو زندہ دل بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ ناول میں طرز بیان کی دلکشی اور اثر انگیزی کو لازمی قرار دیتے اور اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ مصنف الفاظ کا گورکھ دھندا رچا کر قاری کو اس مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کرے کہ ناول میں کوئی حسن، خوبی یا اعلیٰ مقصد پوشیدہ ہے۔ ان کے نزدیک ''ناول نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے دل میں بھی ان ہی جذبات کو بیدار کردے جو اس کے کرداروں میں رونماں ہوں، اور پڑھنے والا یہ بھول جائے کہ وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔''

مختصر افسانے کے فن اور اس کی خصوصیات کے تعلق سے بھی پریم چند نے کافی کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم اور مزے کی بات وہ یہ لکھتے ہیں کہ: ''مذہبی کتابوں میں جو تمثیلی حکایتیں بھری پڑی ہیں وہ مختصر کہانیاں ہی ہیں۔''

(مضامین پریم چند)

اس زمرے میں وہ بجا طور پر مہابھارت، اپنشد، بائبل، حکایات لقمان اور بودھ جاتک وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ کردار نگاری سے متعلق ان کا خیال ہے کہ افسانہ نگار کرداروں کی تحلیل نفسی کرنے نہیں بیٹھتا، صرف اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ بعض اوقات تو مکالموں میں صرف ایک دو الفاظ ہی سے کام نکالتا ہے۔ وہ حقیقت کی بعینہ تصویر کشی کو فن تسلیم نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ ''اگر ہم حقیقت کی ہو بہو نقل کر بھی لیں تو اس میں آرٹ کہاں؟ فن صرف حقیقت کی نقل کا نام نہیں ہے''۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے افسانے سے جو نتیجہ حاصل ہو وہ مقبول عام ہو اور اس میں کچھ باریک نکتے بھی ہوں۔''

سچ تو یہ ہے کہ رجحانات سے قطع نظر فکشن کی تفہیم او تشریح کے تعلق سے جن مسائل پر گفتگو کی جانی چاہیے ان تمام مسائل کو پریم چند نے موضوع بحث بنایا ہے۔ منشی جی نے فکشن کی جڑوں کی تلاش، اس کا ماخذ، افسانہ و ناول کی تعریف و تقسیم، پلاٹ، کردار، کردار کی قسمیں، مکالمے، زبان و بیان، ان کے آغاز و انجام، ان کے منصب و مقصد، پھر ناول اور افسانہ کے فرق اور اس کے امتیازات پر کسی قدر اختصار سے لیکن کافی حد تک اطمینان بخش گفتگو کی ہے۔

کرشن چندر ہمارے سب سے بسیار نویس ترقی پسند فکشن نگار ہیں۔ جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھے جانے والے فکشن سے وہ خاصے ناراض تھے، بالخصوص انٹی اسٹوری، غیر مربوط واقعات، بے پلاٹ کے افسانوں اور مبہم کرداروں کی پیش کش سے۔ فکشن کی تنقید سے متعلق ان کا ایک اہم مضمون 'ہاتھی دانت کا ٹاور' ہے۔ جس میں انھوں نے جدید افسانے کے حوالے سے اپنے خیالات بیباک، تردیدی لہجے اور قدرے جارحانہ انداز سے رکھے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ادھر کہانی کے میدان میں کچھ نئے لوگ آئے ہیں۔۔۔۔ آپ جب ان سے بات کریں گے تو ان کی گفتگو بالکل ٹھیک ٹھیک آپ کی سمجھ میں آئے گی۔ مگر جب یہ کہانی لکھیں گے تو آپ کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، سوائے ایک مجہول چیستان کے۔ وہ کافی ہاؤس جانے کا راستہ تو جانتے ہیں مگر اپنی کہانی کا راستہ انھیں معلوم نہیں۔ انھیں اپنی ملازمت کا مقصد معلوم ہے اپنی کہانی کا نہیں۔ جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو دو ٹانگوں کے سہارے قدم اٹھاتے ہوئے جاتے ہیں مگر اپنی کہانی میں سر کے بل رینگتے ہیں اور اسے آرٹ کہتے ہیں۔ میں انھیں کہانی کار نہیں شعبدے باز کہتا ہوں۔ یہ لوگ رنگین الفاظ کے فیتے اپنے منہ سے نکالتے ہیں، اپنی ٹوپی سے خرگوش، آپ کی جیب سے انڈا اور آپ کو حیران و ششدر چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ بعد

بلاشبہ پریم چند عالمی ادب اور اس کے فنی طریق کار سے آشنا اور اس کے حامی تھے، کہ وہ خود زندگی اور معاشرے کی اصلاح کو ناول کے فرائض میں شامل کرتے تھے، ساتھ ہی وہ اس نزاکت سے بھی واقف تھے کہ انسانی فطرت پر اثر انداز ہونے والی یہ لطیف تحریر کب تک فن رہتی ہے اور کب فن کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہے۔

میں آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی جیب کی آخری چونی بھی شعبدے بازی کی نذر ہوگئی اور ملا کچھ نہیں اور آپ کو کچھ ملے بھی کیوں؟ کیوں کہ یہ لوگ آپ سے کچھ لینے کے قائل ہیں۔عوض میں کچھ دینے کے قائل نہیں ہیں۔''

(مضمون ہاتھی دانت کا ٹاور، از کرشن چندر، مشمولہ جدیدیت، تجزیہ و تفہیم لکھنؤ، 1985، ص 293)

کرشن چندر کے مذکورہ اقتباس سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ بیشتر ادیبوں کے تئیں نئے لکھنے والوں کی یہ شکایت درست ہے کہ وہ اپنے فوراً بعد آنے والی نسل کو جو باغیانہ رویہ رکھتے ہوئے مروجہ ادبی اسالیب سے انحراف کرتی ہے، یکسر رد کردیتے ہیں یا پھر ان کی تحریروں کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

اوپندر ناتھ اشک نے اپنے افسانوی مجموعے 'کونپل' میں دیباچے کے طور پر 'افسانہ: اس کا فن اور ترقی پسندی' کے عنوان سے ایک مضمون شامل کیا ہے، جس میں انھوں نے افسانے، افسانے کی تفہیم، اس کے پلاٹ، مقصد اور کردار نگاری سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''......اٹھو، بولو اور بیٹھ جاؤ۔''

کسی نے مقرر کو یہ قیمتی مشورہ دیا ہے لیکن افسانہ نگار کے لیے بھی یہ کم قیمتی نہیں، جس طرح اچھے مقرر سے امید کی جاتی ہے کہ فوراً اپنی تقریر شروع کرکے جو کچھ کہنا ہے، صاف اور عیاں الفاظ میں کہہ کر بیٹھ جائے، نہ شروع میں فضول اور بے معنی تمہید باندھے، نہ درمیان میں سامعین کو بلاضرورت ادھر سے ادھر لے جائے اور نہ خاتمہ کو غیرضروری طور پر طول دے۔ اسی طرح افسانہ نویس سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح پہلے ہی فقرے سے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ کرتا جائے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر اس طرح افسانہ کو ختم کردے تاکہ جو اثر وہ اپنے ناظر پر ڈالنا چاہتا ہے، وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوجائے۔''

(دیباچہ، 'کونپل')

اس اقتباس سے افسانے کی تین صفات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اول افسانے میں 'فضول اور بے معنی تمہید سے احتراز' دوم خاتمہ کو غیرضروری طور پر طول دینے سے اجتناب اور سوم آغاز سے ہی قاری پر افسانے کی مضبوط گرفت۔ اور یہ سب اس لیے کہ افسانہ نگار اپنا جو تاثر دینا چاہتا ہے، وہ تمام تر شدت کے ساتھ قاری کے دل و دماغ پر مسلط ہوجائے۔ اشک کے خیال میں وہ افسانہ جسے پڑھ کر قاری کو ایک طرح کی تسلی، ایک طرح کا اطمینان ہو، اور یہ احساس کہ اس نے کہانی پڑھ کے وقت ضائع نہیں کیا اور ذاتی طور پر کہانی کے بنیادی خیال سے اختلاف رکھنے کے باوجود یہ یقین کہ افسانہ نگار نے اس بنیادی خیال کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے، کامیاب افسانہ ہے۔ ترقی پسند افسانہ کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ افسانہ اب اپنی حد تکمیل کو پہنچ گیا ہے لہٰذا قاری کو اپنے خیال یا نظریے سے متاثر کرنے کے لیے انتہائی احتیاط اور ہنرمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

دوسرے ترقی پسندوں کی طرح اوپندر ناتھ اشک بھی افسانہ کو محض لطف و انبساط کے ذریعے کے بجائے زندگی کا ترجمان مانتے ہیں، لیکن وہ مقصد پر فن کو قربان کرنے یا اسے اپنے معیار سے گرانے پر کسی طور راضی نہیں، لکھتے ہیں:

''آرٹ، آرٹ کے لیے ہے میں اس میں یقین نہیں رکھتا۔ آرٹ زندگی کے لیے ہے اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہے اور اگر کوئی کہانی زندگی کا مرقع نہیں یا ہمیں زندگی کو سمجھنے میں امداد نہیں دیتی تو وہ دلچسپ ہوسکتی ہے، فن کے لحاظ سے کامیاب ہوسکتی ہے، لیکن نوع انسان کے لیے سودمند نہیں۔'' (دیباچہ، کونپل، ص، 23)

دیوندر اسر اردو کے معروف فکشن نگار اور فکشن کے اہم ناقد ہیں۔ فکشن تنقید کے حوالے سے انھوں نے کافی لکھا ہے۔ ادب اور جنسیات، ادب اور فحاشی، مطالعہ اور نفسیات، 'اردو افسانہ: ایک مطالعہ' اور 'ادب اور فرائڈ' وغیرہ ان کے اہم مضامین ہیں۔ 'ادب اور نفسیات' اور 'نئی صدی اور ادب'، فکشن تنقید کے حوالے سے ان کی اہم کتابیں ہیں۔ آخرالذکر کتاب میں انھوں نے فکشن کے متعدد مسائل، رجحانات، خدشات اور مشرق و مغرب کے تعلق سے گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ اہم فکشن نگاروں مثلاً پریم چند، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو اور دیوندر ستیارتھی وغیرہ کے فکر و فن کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے تنقیدی مجموعوں میں بھی انھوں نے فکشن کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ مذکورہ مجموعوں کے علاوہ 'فکر اور ادب'، ادب اور جدید ذہن'، 'مستقبل کے روبرو' اور 'ادب کی آبرو' ان کے اہم تنقیدی مجموعے ہیں۔

جدید افسانہ نگار سریندر پرکاش اور بلراج مین را بنیادی طور پر جدیدیت کے رجحان کے افسانہ نگار ہیں۔ سریندر پرکاش نے فکشن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضمون 'نیا اردو افسانہ میری نظر میں' میں کیا ہے۔ مین را ایک اہم رسالہ 'شعور' نکالا کرتے تھے۔ انھوں نے کوئی باضابطہ تنقیدی مضمون تو نہیں لکھا لیکن ان کے تین ایسے مضامین ہیں جن میں فکشن اور فکشن نگاروں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان کا لہجہ ذرا سخت اور قدرے مبہم ہے۔ ان کے مضامین ہیں 'تنبولا'، 'ایک ناپسندیدہ کہانی' اور 'ایک اور ناپسندیدہ کہانی'۔ وہ جدیدیت کو نہ تو کوئی تحریک مانتے ہیں اور نہ ہی کسی تحریک کا ردعمل، ان کے مطابق جدیدیت کا اطلاق ایک خاص طرح کے لوگوں کی ایک خاص طرح کی تحریر پر ہوتا ہے جسے نباہنا ان کے مطابق آسان نہیں۔ لکھتے ہیں:

''جدیدیت جسے ایک رجحان کہا جاتا ہے نہ تو تقسیم وطن کے بعد کسی سماجی تحریک سے پھوٹا ہے اور نہ ہی رجحان کوئی تحریک بن پایا ہے جو صورت حال کو سمجھنے اور سنوارنے کی ناکام یا کامیاب کوشش ہوتی۔ جدیدیت کا آغاز چند ایک حساس، دکھی اور برہم نوجوانوں کی تحریر تھی۔ ان چند لکھنے والوں کی برہمی جو غلط یا صحیح تو ہوسکتی ہے، سچی تھی۔ اس لیے نئی تحریر کا مشکل اور خطرناک کام ہوتا رہا۔''

(مضمون 'تنبولا' مشمولہ اردو فکشن، مرتبہ آل احمد سرور، شعبہ اردو علی گڑھ، 1973، ص 412)

گویا بلراج مین را کے نزدیک جدیدیت ایک رویے کا نام ہے جبکہ سریندر پرکاش اسے ایک ایسی اصطلاح مانتے ہیں جس میں اسلوب کے تجربے اور موضوع کی جدت کے ساتھ سماجی رشتوں کے پیچیدہ عمل کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے کرب کو محسوس کرنے اور کرانے کی صفت موجود رہتی ہے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ایک بار نئے کی اصطلاح پھر دہرائی جانے لگی اور اس بار نیا ادیب محض اسلوب کے تجربوں کے نئے پن کی بات نہیں کر رہا تھا، مواد کے نئے پن کی بھی بات ہورہی تھی، واقعہ نگاری اور فرد کے سماجی رشتوں کی سطحی بات نہیں ہورہی تھی، بلکہ سماجی رشتوں کے پیچ در پیچ عمل سے جو ہولناک نتائج برآمد ہورہے تھے، ان کے کرب کو محسوس کیا جارہا تھا اور اس کرب کو ایک ذات کے وسیلے سے دوسری ذات تک منتقل کرنے کی بات ہورہی تھی۔''

(سریندر پرکاش، مضمون 'نیا اردو افسانہ میری نظر میں' مشمولہ اردو فکشن، ص 360)

یہ ہمارے وہ فکشن نگار ہیں جنھوں نے فکشن اور فکشن کی تنقید میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور اردو زبان و ادب کو مختلف النوع فکر و خیالات، میلانات و رجحانات اور بیان و اسلوب کے جواہرات سے ثروت مند بنانے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

■

Abu Bakar Abbad
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007

انوپما پول

اردو زبان وادب کے فروغ میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کا کردار

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کردار بنیادی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ کمپنی نے ہندوستان میں تعلیم وتربیت کے ساتھ زبان وادب کے فروغ کے لیے جوادارے قائم کیے وہ ہندوستان میں عام بول چال اور نثری ارتقا کی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں ایک فورٹ ولیم کالج کلکتہ ہےاوردوسرافورٹ سینٹ جارج کالج مدراس۔اول الذکر کا قیام سنہ 1800 میں ہوا تھا جب کہ آخر الذکر 1812 میں قائم کیا گیا۔فورٹ سینٹ جارج کالج، مدراس کے بھی وہی مقاصد تھے جوفورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تھے۔ دونوں کالجوں کے پیش نظر جونیئر سول ملازمین کی تعلیم وتربیت کا انتظام تھا،لیکن فورٹ سینٹ جارج کالج کو فورٹ ولیم کالج پرایک طرح سےفضیلت اس لیے حاصل تھی کہ یہاں صرف سرکاری ملازمین ہی کوتربیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ وکیلوں اورججوں کے لیے بھی ٹریننگ کا خاص انتظام تھا۔اس کالج میں ہندوستانی زبان وادب خصوصی طور پراردو کے ساتھ ساتھ قانون، ریاضی، تاریخ اور فلسفے کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ عربی، فارسی سنسکرت، تمل، ملیالم،تلگو اور خصوصاً دکنی کی بھی تعلیم کا انتظام تھا۔اس کی تصدیق پروفیسر سری نواس چاری کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔

’’اس کالج کے بھی وہی مقاصد تھے جوفورٹ ولیم کالج کے تھے۔فورٹ ولیم کالج پراس کالج کوایک طرح کی فوقیت اس لیے حاصل تھی کہ یہاں ہندوستانی ادب کے ساتھ غیرملکی زبانوں کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں صرف منشی ہی نہیں آتے بلکہ وکلاء اور بچوں کوبھی تعلیم دی جاتی تھی۔‘‘ (ہسٹری آف دی سٹی آف مدراس،ص:216)

فورٹ سینٹ جارج کالج کوئی اچانک معرض وجود میں آنے والا ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک صدی قبل 1717 میں فورٹ سینٹ جارج کے احاطے میں اسکول کی شکل میں اس کا قیام عمل میں آچکا تھا جب 1812 میں اسے کالج کی شکل میں متعارف کیا جانے لگا تب ناکافی جگہ کی وجہ سے 1816 میں Mr Garrow کا مکان دس سال کے لیے پٹہ پر حاصل کیا گیا، پھر دس سال بعد 1827 میں Mr Morrat کے مکان میں منتقل کیا گیا اور آج تک اسی مقام پر قائم ہے۔البتہ کالج تقریباً 1854 تک عمل میں جاری رہااس کے بعداس کی کالج کی حیثیت ختم کردی گئی اوراس کاانضمام مدراس لٹریری سوسائٹی کے ساتھ ہوگیا۔

لیکن آج دوصدی گزرنے کے بعد افسوس اس بات کا ہے کہ مورخین زبان وادب فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کی ادبی خدمات کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ تاریخی بےاعتنائی کی یہ حالت ہے کہ اکثر کتابیں جو اردو ادب کی تاریخ میں لکھی گئی ہیں ان میں اس کالج کا ذکر سرے سے ملتا ہی نہیں ہے۔البتہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال سمیت کئی ادبا وناقدین نے اس کالج کی خدمات کاخصوصی ذکر کیا ہے۔ اب جب اردوادب میں ہمہ جہت تحقیقی خدمات کا فروغ ہوا ہےتو جنوبی ہند میں اس ادارے کی خدمات کا ذکر بھی سنہرے الفاظ میں کیا جارہا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تعلیم، سنسکرت، عربی، دکنی، تلگو، ملیالم اور دکنی زبانوں کے شعبے قائم تھے۔تراب علی نامی شعبہ عربی، فارسی اور اردو کے صدر شعبہ تھے۔منشی شمس الدین احمد، منشی ابراہم بیجاپوری، منشی مظفر، قاضی ارتضی علی خاں، مولوی مہدی واصف، سید حسین شاہ حقیقت، مرزا عبدالباقی، سیدتاج الدین تاج، غلام دستگیر، محمد خاں اور میر حیدر بلگرامی وغیرہ نے اس کالج میں برسوں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ یہ تمام اساتذہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے سینٹ جارج کالج مدارس آئے اور علم وادب کے فروغ میں کوشاں رہے جس سے اس کالج کی خدمات کی گونج شمال تک پہنچ گئی۔مقامی علما اور شعرا

نے بھی اس سلسلے میں اپنی زریں خدمات پیش کیں۔ان میں منشی شمس الدین احمد، مہدی واصف، غلام دستگیر، منشی مظفر اور محمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ مہدی واصف کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ وہ تین سو کتابوں کے مصنف ومولف تھے۔

اردوادب کے لیے سرزمین دکن اولین گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اردوادب کا شاہکار'سب رس' دکن ہی کی پیداوار ہے۔اس کے ٹھیک دوسو سال بعد انیسویں صدی کے اوائل میں اردو کی نثری داستانیں لکھنے کا رواج عام ہوا۔ یہ داستانیں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے زیراہتمام بھی لکھی اور شائع کی گئیں۔جس طرح شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اسی طرح جنوبی ہند میں فورٹ سینٹ جارج کالج نے بھی دکنی زبان وادب کی نشر واشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کالج کی داستانوں میں 'دکنی انوار سہیلی'، 'حکایات جلیلہ'، 'سنگھاسن بتیسی' اور 'قصہ ملکہ زماں وکام کندلہ' مشہور ہیں۔ یہ داستانیں انگریز سرداروں کی تعلیم کے لیے لکھی گئی تھیں۔ یہ کتابیں فورٹ سنیٹ کالج کے پریس سے بھی شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ مقامی مطابع سے بھی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ مدراس کے مشہور مطبع اعظم الاخبار اور مطبع جامع الاخبار نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔طلبا کونئی زبان سیکھنے پر انعام واکرام سے نوازا جاتا اس کے علاوہ تصانیف پر مخصوص رقم بطور انعام پیش کی جاتی۔فورٹ سینٹ کالج میں ایک وسیع کتب خانہ موجود تھا۔کتب خانے میں دکنی زبانوں کی بے شمار کتابیں موجود تھیں۔کرنل میکنزی سرویر جنرل آف انڈیا کی وجہ سے یہ ذخیرہ جمع ہوگیا۔مخطوطات کے اس ذخیرے کو کرنل میکنزی کے نام سے موسوم کیا گیا۔اس بارے میں ولیم ٹیلر لکھتے ہیں:

'' ہندوستان سے متعلق تاریخی دستاویزات کا اتنا بیش قیمت ذخیرہ یوروپ یا ایشیا میں آج تک کسی مرواحد نے جمع نہیں کیا۔''

کرنل میکنزی کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ اتنے مخطوطات کو اکٹھا کرنا ممکنات میں سے تھا۔مگر یہ کرنل میکنزی کے ذوق وشوق کا ضامن ہے کہ اتنا ذخیرہ جمع ہو پایا۔

ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال اپنی کتاب۔ 'فورٹ سینٹ جارج کالج دکنی زبان وادب کا ایک اہم مرکز' میں رقمطراز ہیں کہ یہ کالج قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کے زوال کے بعد دکنی زبان وادب کا اہم مرکز بن گیا تھا۔اس کالج کی جتنی اردو مطبوعات ومخطوطات دستیاب ہیں وہ زیادہ تر دکنی زبان میں ہیں۔مثلاً حکایات الجلیلہ، انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی، گلستان وغیرہ۔ دکنی انوار سہیلی کو مسعود حسین خان نے قدیم اردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ قرار دیا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے تعلیمی شعبہ جات مختلف زبانوں پر مشتمل تھے۔ابتدا میں کئی شعبۂ تعلیمی میں اساتذہ کی کمی تھی۔ان تعلیمی شعبہ جات کی ترویج کے لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے مصنفین کو مدعو کیا گیا۔ جن میں تراب علی، حسین شاہ حقیقت، عبدالودود عاشق، منشی محمد ابراہم بیجاپوری اور مرزا عبدالباقی وفا کے نام قابل ذکر ہیں ساتھ ہی کئی انگریزی مصنفین بھی تھے،تو سب سے پہلے انگریز مصنفین کا ذکر کرتے ہیں جن میں ڈاکٹر ہنری ہیرس، الکسانڈر ڈنکسن کمپیل، تھامس روبک، کیپٹن گرین آوے اور ڈاکٹر ایڈورڈ بالفوراہمیت کے حامل ہیں۔

جس طرح سے فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ دونوں نام ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہوتے ہیں اسی طریقے سے ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور اور فورٹ سینٹ کالج بھی لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اگر چہ کالج کے بورڈ آف اگزامنز کے ممبر رہے،لیکن اصل میں وہ علاقہ مدراس میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیتے رہے۔انھوں نے مدراسی مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کا نام'' مجمع علم و ہنر' تھا۔ یہی نہیں بلکہ 'کتب خانہ عام' اور 'مدرسہ اعظم مدراس' کے قیام میں بھی ڈاکٹر ایڈورڈ کا تعاون شامل تھا۔ ڈاکٹر ایڈور ڈ کی تصانیف میں سب سے اہم کارنامہ 'انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا' ہے، جس کی تین جلدیں شائع ہوئی تھیں جواب نایاب ہیں۔اس کی ہر جلد ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل تھی۔عثمانیہ یونی ورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔انھوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں اور سبھی الگ الگ علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔'گلدستہ سخن' جو تذکرہ شعرائے فارسی اور اردو پر مشتمل ہے۔'کتاب علم نجوم' یہ مسٹر گلیگ Gleig کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔' اردو اور انگریزی میں دنیا میں اعداد وشمار کا نقشہ' یہ جنرل نالج پر ہے۔'اصول فن قبالت' زرسنگ اور فن ولادت پر ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر جی ٹی کنکوئسٹ کی انگریزی کتاب 'آؤٹ لائن آف مڈوائفری' کا اردو ترجمہ ہے۔'رسالہ علم کیمیا' یہ کتاب بھی نایاب ہے اور مدراس کے کتب خانہ اہل اسلام میں اس کا ایک نسخہ ہے۔یعنی انھوں نے کتاب تو لکھی ہی ساتھ ہی دیگر علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

تھامس روبک کا تعلق فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ کالج دونوں اداروں سے ہے۔ابتدا میں افواج مدراس سے منسلک رہے۔تھامس نے ان دونوں اداروں سے فیض اٹھایا ہے۔جس کی وجہ سے اردو میں انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی۔ دوران قیام مدراس ان کی کتاب برٹش انڈیا مانی ٹر (British India Monitor) جو فورٹ سینٹ کالج کی جانب سے نہ صرف شائع ہوئی بلکہ اسے کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا۔پروفیسر سید محمد نے اپنی کتاب ارباب نثر اردو میں تھامس روبک کی اور ایک کتاب جہاز رانی کا بھی ذکر کیا ہے۔جس میں اردو قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی شامل ہے۔ان کی اور ایک کتاب ترجمان ہندوستان Hindustany Interpreter ہے اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل درج ہیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ تھامس روبک نے جان گل کرسٹ کی ہندوستانی لغت کی تیاری میں ان کا ساتھ دیا تھا جس کے لیے انھوں نے دوسال کی چھٹی بھی لی تھی،جس کا تذکرہ جان گل کرسٹ نے لغت کے دیباچے میں کیا ہے۔تھامس روبک فورٹ ولیم کالج کے سکریٹری کے عہدے پر فائزر ہے اور 1804 میں گل کرسٹ کی سبکدوشی پر ان کی جگہ اردو کے پروفیسر مامور ہوئے۔ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی جو Annale of the College of Fort William کے نام سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر ہنری ہیرس فورٹ سینٹ کالج سے ہی فارغ التحصیل تھے فوج کے لیے مدراس میں اسسٹنٹ سرجن مقرر تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی مشہور لغت ہندوستانی زبان کا تجزیہ اوراس کی قواعد ولغت (Analysis ,gramme and dictionay of the Hindusatany Language) ہے جو سنہ 1791 میں فورٹ سینٹ کالج کے پریس سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے جواب نایاب ہے۔ ڈاکٹر ہنری کی اس لغت کے حوالے سے پروفیسر ایس کے جینی نے اپنے مقالے' اردو لغت نویسی اور اہلِ انگلستان' میں اس لغت کوگل کرسٹ کے کارنامے سے بہتر قرار دیا ہے۔اس لغت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس لغت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ جنوبی ہند میں بولی جانے والی اردو زبان یا دکنی زبان کا بھی اچھا ذخیرہ ملتا ہے۔

جنرل جوزف اسمتھ کا تعلق فورٹ سینٹ کالج سے تو تھا ہی لیکن انھیں جن خطابات سے نوزا گیا وہ ہندوستانی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں جیسے نواب مبارز الملک،

جنزل اسمتھ بہادر اور صولت جنگ۔ مختلف تذکر نگاروں نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ میر عطا حسین خاں تحسین نے چہار درویش کا ترجمہ 'نوطرز مرصع' کے نام سے جنزل اسمتھ کے کہنے سے ہی کیا تھا، یہ بات سچ اس وجہ سے بھی ہوسکتی ہے کہ تحسین ان کے یہاں منشی کے طور پر بھی کام کرتے تھے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے دربار میں کتاب ختم کی۔ اگر چہ جنزل جوزف اسمتھ کا کوئی خاص کارنامہ نہیں ملتا ہے لیکن اس واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اردو میں نثر کی داغ بیل ڈالنے اور ترویج وترسیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔

الکسانڈر فورٹ سینٹ کالج سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انھیں تصنیف و تالیف سے خاصی دلچسپی تھی۔ ان کی ایک تلگوزبان کی قواعد فورٹ سینٹ کالج کی جانب سے شائع ہوئی۔

اب ہندوستانی محققین پر گفتگو کرتے ہیں تو میں سب سے اہم نام منشی تراب علی نامی کا ہے جو 1179 میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خیرآباد میں ہی حاصل کی۔ نامی کے ہم درس اور ہم عمر ساتھیوں میں سب سے اہم نام علامہ فضل امام خیرآبادی کا ہے جو علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد محترم تھے۔ نامی نے کچھ عرصہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کی پھر 1813 میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبہ عربی، فارسی اور اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ فارسی اور عربی میں آپ کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ منطق میں درالمنظوم، نحو میں وسیط النحو، رسالہ حکایتی چند اور خزینۃ الامثال وغیرہ۔ وسط النحو عربی زبان میں صرف ونحو کی ایک معیاری کتاب ہے یہ کتاب فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں شامل تھی۔

سید حسین شاہ حقیقت میر منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ سنہ 1774 میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری سے دلچسپی تھی اور جرات کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ ابتدا میں ان کی غزلوں کی کتابت کرتے تھے۔ پھر معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ریذیڈنٹ کلکتہ کے دفتر میں اول منشی رہے۔ حقیقت کی جملہ تصانیف میں نو کتابیں شامل ہیں۔ صنم کدہ چین، جذب عشق اردو میں ایک عشقیہ شاعری ہے۔ تحفۃ العجم وغیرہ۔ حقیقت نے قیام مدراس میں دو مثنویاں لکھی۔ مثنوی گلزار اور مثنوی ہیرامن طوطا۔

مولوی حسن علی ماہلی۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کا تعلق اعظم گڑھ یوپی سے تھا۔ حسن علی ماہلی سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ حزیں کے مشہور شاگرد ملاعمر کے شاگرد تھے۔ 1816 سے 1836 تک سینٹ جارج کالج مدراس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ صدر مفتی بنائے گئے، لیکن یہ کالج کی جانب سے تھے یا نہیں اس کا حتمی علم نہیں ہے اور 1846 کو ان کی وفات ہوئی۔ ان کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں لیکن ان کی مشہور کتابیں 'تبصرۃ الحکمۃ' طبعیات اور الٰہیات میں اور 'منتخب التحریر' علم ریاضی میں ہیں۔

> **فورٹ سینٹ جارج کالج کے تعلیمی شعبہ جات مختلف زبانوں پر مشتمل تھے۔ ابتدا میں کئی شعبۂ تعلیمی میں اساتذہ کی کمی تھی۔ ان تعلیمی شعبہ جات کی ترویج کے لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے مصنفین کو مدعو کیا گیا۔ جن میں تراب علی، حسین شاہ حقیقت، عبدالودود عاشق، منشی محمد ابراہم بیجا پوری اور مرزا عبدالباقی وفا کے نام قابل ذکر ہیں ساتھ ہی کئی انگر یزی مصنفین بھی تھے، تو سب سے پہلے انگریز مصنفین کا ذکر کرتے ہیں جن میں ڈاکٹر ہنری ہیرس، الکسانڈرڈنکسن کمبیل، تھامس روبک، کیپٹن گرین آوے اور ڈاکٹر ایڈورڈبالفور اہمیت کے حامل ہیں۔**

قاضی ارتضا علی خاں خوشنود کا تعلق وپاموَ ضلع ہردوئی یوپی سے تھا۔ ان کا ذکر مذہبی و ادبی ہرزاویے سے بڑے علما وادبا کے یہاں ملتا ہے۔ مدراس میں ان کا قیام صرف پانچ یا چھ سال رہا۔ 1815 میں انھوں نے مدراس سے رخت سفر باندھ لیا۔ ان کی کتابوں کا ذکر فرداً فرداً کہیں نہیں ملتا ہے بلکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے صاحب کثیر التصانیف لکھا ہے، البتہ حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں ان کی تینتیس سے زائد عربی و فارسی، قلمی ومطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔

محمد مہدی واصف مدراس میں ہی پیدا ہوئے۔ وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرنچ، ترکی اور دیگر ہندوستانی زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔ موصوف 1818 سے 1835 تک کالج تک وابستہ رہے۔ ان کی کچھ کتابیں کالج کے نصاب میں بھی داخل تھیں، جن میں 'حکایات دل پسند'، 'لطائف عجیبہ' اور 'حکایات نادرہ' ہیں۔ ان کے علاوہ عربی فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی ایک ضخیم کتاب 'مجمع الامثال'' ہے۔ اس میں جدید وقدیم ضرب الامثال کو یکجا کیا گیا ہے۔ ایک لغت نویس کی حیثیت سے بھی انھیں اہمیت حاصل ہے۔ 1851 میں انگریزی ہندوستانی اور فارسی لغت مدراس سے ہی شائع کی تھی۔ دوسری لغت 'دلیل ساطع' ہے۔ اس میں سنسکرت الفاظ کے معانی فارسی اور اردو میں درج کیے گئے ہیں۔ تیسری لغت 'مناظر اللغات' فارسی اردو لغت ہے۔ ان کے علاوہ خلاصہ تکمیل الایمان، ترجمہ کیمیائے سعادت، رسالہ تعبیر خواب، منہاج العابدین، شادی نامہ، ترجمہ جلالین، نفائس الکلام، فصل الخطاب، انیس الذاکرین، انسان کامل اور دیگر کثیر تصانیف ہیں۔

منشی غلام علی معان خاں کا تعلق ارکاٹ سے تھا۔ ان کا ذکر تذکروں میں تو ملتا ہے البتہ ان کی تصانیف کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ ریکارڈ میں اتنا ملتا ہے کہ 1842 تک وہ کالج میں ملازم رہے اور 1851 میں ان کا انتقال ہوا۔

ان سب کے علاوہ، مرزا عبدالباقی وفا، مرزا محمد جان، سید تاج الدین، محمد خاں منشی سید غلام دستگیر، منشی مظفر، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری، منشی شمس الدین احمد، سید امیر حیدر بلگرامی، اکرام علی اور میر بہادر علی حسینی یہاں کے اہم اساتذہ میں تھے جو انگریزوں کو اردو کی تعلیم کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی بخوبی انجام دے رہے تھے۔

اس ادارے سے شائع شدہ اہم داستانوں کی بات کی جائے تو 'دکنی انوار سہیلی' کا خصوصی ذکر ہوتا ہے، اس کے مصنف محمد ابراہیم بیجاپوری تھے۔ اس کے بعد 'حکایت الجلیلہ' ہے جو الف لیلہ ولیلہ کی دوسو راتوں کا اردو ترجمہ تھا۔ تواریخ اور تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اردو میں الف لیلہ کا پہلا اردو ترجمہ تھا۔ اس کے مترجم منشی شمس الدین احمد تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1836 میں کالج پریس سے شائع ہوئی تھی۔ ایک اور داستانی کتاب 'ملکہ زماں وکام کندلہ' بھی ہے۔ کالج کے ہی پریس سے 1819 میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔

حاصل کلام فورٹ سینٹ کالج کی اردو خدمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو کسی طور پر بھی فورٹ ولیم کالج سے کم نہیں ہوگا کیونکہ اس کو مزید فوقیت دیگر علوم درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں حاصل ہے، جیسا کہ چند مصنفین کی ادبی خدمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Anupama Pol
Dept of Urdu
Mysore Rd, Jnana Bharathi,
Bengaluru-560056 (Karnataka)

اردو شاعری میں کرشن کنہیا

طالب اکرام

ابتدا سے ہی اردو شاعری میں عشق کا رنگ غالب رہا ہے۔ کہیں عشق حقیقی تو کہیں عشق مجازی۔ شعرا کلام میں اپنے محبوب کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے رہے ہیں۔ محبوب کوئی بھی ہو خواہ وہ شخص ہو یا ملک یا مذہب۔ سبھی شعرا اپنے مزاج کے مطابق کلام اخذ کرتے رہے اور اظہار خیالات کا ذریعہ بناتے رہے۔ اکثر اردو شعرا کے کلام میں عشق حقیقی کا رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جس طرح سے بعض شعرا نے ملک وقوم کو اپنا محبوب بنایا تو بعض شعرا نے مذہب وملت اور اشخاص کو اپنا محبوب بنایا۔ حتیٰ کہ برصغیر کے بعض شعرا نے کرشن کنہیا کو اپنی شاعری کا محور ومرکز بنایا۔ جن میں امیر خسرو، پنڈت چندر بھان برہمن، ملک محمد جائسی، رسکھان، عبدالرحیم، محمود دریائی، کاظم قلندر کاکوروی، شاہ بدر الدین جانم، واجد علی شاہ، حسرت موہانی، نظیرا کبر آبادی، سیماب اکبر آبادی، ڈاکٹر اقبال، حفیظ جالندھری، منور لکھنوی، محسن کاکوروی، کیفی دہلوی، جوش ملیح آبادی، سرور جہان آبادی، چکبست اور ظفر علی خاں وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں، جن میں ملک محمد جائسی کا نام اہم ہے، جنھوں نے اپنی شاعری میں کرشن کنہیا کو خاص جگہ دی ہے۔

تیرہویں صدی کا عظیم صوفی شاعر امیر خسرو جن کی شاعری میں ہندوی زبان یعنی عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت وغیرہ زبان کے الفاظ کثرت سے نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کرشن کنہیا کے موضوع کو ترجیح دی۔ ایک جگہ امیر خسرو اپنے کلام میں کرشن کنہیا کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جگ میں ظلم وستم کا بازار گرم تھا۔ محبت نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آفتاب اخوت ڈوب چکا تھا۔ ہر سمت عداوت عام ہو چکی تھی۔ جہالت کی بدلی چھائی ہوئی تھی۔ اخلاقیات سے کسی کو دور تک بھی واسطہ نہیں تھا۔ لاعلمی، پستی، کم ہمتی اور جمود وسکوت کے عناصر غالب ہو گئے تھے۔ انسانیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہر جانب ہراس و ناامیدی کی گھنگھور گھٹا تھی۔ چراغ امید بجھ چکا تھا۔ ایسے پرفتن دور میں جناب کرشن عالم میں جلوہ پذیر ہوئے، جس سے ظلم وجبر نیست و نابود ہوا۔ دولت علم وعمل عام ہوئی۔ اخوت والفت اور انسانیت کے دیپ جل اٹھے۔ محبت عام ہوئی۔ امید کا سورج طلوع ہوا۔ سنسار روشن ومنور ہو گیا۔ شعر ملاحظہ ہو۔

شیام سیت گوری لے جمت بھئی انیت
ایک پل میں پھر جات ہیں جوگی کا کے میت[1]

کرشن جی کی محبت میں رسکھان نے اپنی شاعری میں کرشن کی بال لیلاؤں کا، گو چارن لیلاؤں کا، کنج لیلاؤں کا، راس لیلاؤں کا، پنگھٹ لیلاؤں کا اور کرشن کی مرلی لیلاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کرشن کی بھکتی کے دلدادہ تھے اور ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ گرچہ انھیں دوسرا جنم حاصل ہو تو برج میں نصیب ہو اور کرشن کے ہی بھکت بنے۔ اگر جانوروں کی رحم میں پیدائش ملے تو وہ نند کی گایوں کے ساتھ چریں، پتھر بنوں تو اسی پہاڑ پر جاؤں جسے کرشن نے آراستہ و پیراستہ کیا ہے اور اگر پرندہ بنوں تو جمنا کے ساحل پر کاشانہ بناؤں۔ اس ضمن میں اشعار ملاحظہ ہوں۔

مانش ہوں تو وہی رسخانی بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن
جو پشو ہوں تو کہا بس میرا چروں نت نند کی دھینو منجھارن
پاہن ہوں تو وہی گری کو جو دھریو کر چھتر پورندر کارن
جو کھگ ہوں تو بسیرا کروں ملی کالندی کول کدنب کی ڈارن[2]

رسکھان ورندا جنگل کی ہر چیز سے محبت کرتے تھے۔ وہاں کے پھول، پتے، پیڑ پودھے وغیرہ سے عشق کرتے تھے۔ 'پریم واٹکا' ان کی مشہور نظم ہے، جس میں سری کرشن اور رادھا کے عشق کو عشق حقیقی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ وہ سری کرشن کو وشنو کا اوتار گمان کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اسی طرح عبدالرحیم بھی جناب کرشن کے مداح تھے۔ وہ اکبر کے نو رتنوں میں سے ایک تھے، جنہیں کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سری کرشن کے اوصاف وکمالات کی بڑی خوب صورتی کے ساتھ عکاسی کی ہے، جس سے سری کرشن کے ساتھ ان کی عقیدت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ دراصل وہ اپنے محبوب حقیقی کے عشق میں ہر لمحہ فنا رہتے ہیں، جس سے ان کا دل ہمہ وقت بے چین و

بے قرار رہتا ہے اور دھیان سدا اپنے محبوب کی جانب مائل رہتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

تیں رحیم من آپنو، کینہوں چارو چکور
نسی باسر لاگو رہے، کرشن چندر کی اور

سولہویں صدی میں شاہ بدرالدین جانم نے کرشن کنہیا کے موضوع پر 'سکھ سہیلا' نام سے دوہے لکھے۔ بعد ازاں اٹھارویں صدی کے تقریباً تین شعرا شاہ طیب چشتی اور ولی دکنی نے کرشن بھکتی کا تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں عالم شیخ نے بھی کرشن کنہیا کے عشق میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں۔

اردو کے شعرا نے بھی کرشن جی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ مثلاً شاہ برہان الدین جانم 'ارشاد نامہ'، حفیظ جالندھری 'کرشن کنہیا'، واجد علی شاہ 'راس لیلا' اور نظیر اکبر آبادی نے خاص طور پر 'جنم کنہیا جی، کنہیا جی کی شادی اور کنہیا جی کا راس' وغیرہ نظموں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح کیفی دہلوی 'بنسی کی دھن سنائے جا، کرشن جی کا فلسفۂ عمل، بنسی والے آجا اور رادھے شیام' نظمیں لکھی ہیں۔ باسط بسانوی نے 'شہید معانی' تصنیف میں کرشن اور یشودا موضوع پر نظمیں اخذ کی ہیں۔ ظفر علی خاں نے 'گوکل کی بنسری کی گونج'، حسرت موہانی نے 'متھرا جی' اور سیماب اکبر آبادی نے اپنی تصنیف 'کار امروز' میں سری کرشن نام کی نظم لکھی ہے۔ اسی طرح منور لکھنوی نے کشن کا مقام، خدائے حسن کشن، رکمنی اور کشن کی عظمت نظمیں لکھیں ہیں۔ جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور شاہ محمد کاظم وغیرہ نے بھی کرشن کنہیا پر نظمیں کہی ہیں۔

کلام حسرت موہانی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کرشن کنہیا کے بہت بڑے شیدائی تھے۔ وہ متھرا کی حاضری کو عین سعادت سمجھتے تھے اور دل میں یہ امید سجائے تھے کہ ایک روز ایسا آئے گا جب میں کرشن جی کے در پر حاضر ہوں گا، کیوں کہ وہ اپنے عاشقوں پر خاص نظر رکھتے ہیں اور ان سے شفقت و محبت کرتے ہیں، پھر کیوں نہ ہو جب اقلیم عشق ہی ان کے قدموں تلے ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھوں میں نور جلوۂ بے کیف و کم ہے خاص
جب سے نظر پہ ان کی نگاہِ کرم ہے خاص
کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص[3]

کلیات حسرت موہانی میں ایسے متعدد اشعار ہیں جس میں ان کا دل عشق کرشن میں سرشار ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں کرشن کنہیا کا ذکر ملتا ہے۔ بسا اوقات تصور میں حاضری بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک سرزمین متھرا ہی عاشقوں کا منبع و مرکز ہے، جس سے دلِ عشاق مست و بیخود اور سیراب ہوتے ہیں۔ سری کرشن کی بانسری کی مدھر آواز سے گوپیوں کو حیات جاودانی میسر ہوتی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا　　دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
ہر ذرۂ سر زمین گوکل　　دارا ہے جمال دلبری کا
برسانا و نندگاؤں میں بھی　　دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا　　ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نور سیاہ یا کہ حسرت　　سرچشمہ فروغِ آگہی کا[4]

نظیر اکبر آبادی کی نظمیں کنہیا جی کی شادی، لہو ولعب کنہیا، بانسری، بالپن بانسری بجیا، جنم کنہیا جی، مہتا، اور کنہیا جی کی راس وغیرہ قابل ستائش ہیں، جو عشق کرشن میں غوطہ زن ہیں۔ ان میں عقیدت و احترام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ نظمیں ہندو اور مسلم اتحاد و یگانگت کی بہترین مثالیں ہیں۔ وہ اپنی نظم 'بالپن بانسری بجیا' میں کرشن کے بچپن کو عہد بچپن سے تعبیر نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے جوانی اور بڑھاپا کے مترادف قرار دیتے ہیں ان کا بظاہر بچپنا تھا مگر درحقیقت سن بلوغیت میں داخل تھے۔ اس لیے کہ ان کا ہر فعل قابل ستائش تھا۔ انھیں بچپن سے کیا غرض تھی ان کے لیے تو بچپن، جوانی اور بڑھاپا سبھی یکساں تھے کیونکہ وہ تو وشنو کے اوتار بن کر سنسار میں پیدا ہوئے تھے اور عالم کی حفاظت کے لیے مامور تھے۔ لکھتے ہیں۔

ان کو تو بالپن سے نہ تھا کام کچھ ذرا
سنسار کی جو ریت تھی اس کو رکھا بچا
مالک تھے وہ تو آپی انہیں بالپن سے کیا
واں بالپن جوانی بڑھاپا سب ایک تھا[5]

اسی طرح ایک جگہ کرشن جی کو متعدد القاب و آداب سے تعبیر کرتے ہیں اور انھیں موہن، مدن، گوردھن، گوپال، نندلال اور ہری ناتھ وغیرہ کے صفاتی اسما سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے اوصاف و کمالات بیان کرتے ہیں اور ان پر تن من دھن سب قربان کر دینے کی بات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر اپنے محبوب سے عشق کرنا لازمی ہے اور کنہیا جی ایسے محبوب حقیقی ہیں جو ہم جگت واسیوں کے ملجا و ماوا ہیں، جنہوں نے ہم جگت واسیوں کی خاطر تمام طرح کے مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے دامن میں سمو لیا ہے۔ اس ضمن میں ایک جگہ ارشاد پذیر ہیں۔

موہن مدن گوپال ہری بنس من ہرن
بلہاری ان کے نام پہ میرا تن بدن
گردھاری نند لال ہری ناتھ گوردھن
لاکھوں کئے بناؤ ہزاروں کئے جتن [6]

نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم 'ہر کی تعریف' میں کرشن جی کے اسما کا بیان نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ مثلاً: ہری ناتھ، گوردھن، مدن، شیام، کنج بہاری، گردھاری، کانھ مراری، کشن کنہیا، مرلی دھر، من موہن، گھنشیام، نندلال وغیرہ۔ اکبر آباد کی ہی سرزمین سے تعلق رکھنے والا دوسرا اہم شاعر سیماب اکبر آبادی ہیں جنھوں نے 'پریت کے گیت' میں سری کرشن سے والہانہ عشق کا اظہار کیا ہے اور فضائے دہر میں محبت کے ترانے گنگناتا ہوا بسنت کی آمد کا نقشہ کھینچا ہے جس سے ہر جانب بہار ہی بہار ہے اور فرط مسرت کا خوب صورت ماحول ہے، محبوب کی زیبائش اور آرائش کا سلسلہ پورے عروج پر ہے۔ اسی طرح محسن کاکوروی نے 'گلدستۂ محسن کاکوروی' میں متھرا، گوکل کنہیا اور گوپیوں کے چرچے کئے ہیں اور محبوب کے عشق میں رقص بسمل ہیں۔ نیز ان کا لامیہ قصیدہ 'سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل' بہت معروف و مقبول ہے جو اصل میں نعت رسول ہے، لیکن انہوں نے بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس میں محسن کاکوروی نے کرشن کنہیا کی تعریف اس انداز میں کی ہے کہ قاری رشک کرتا ہے اور عشق کنہیا میں مست و بے خود ہو اٹھتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیکھیے ہوگا سری کشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل
سمت کاشی سے گیا جانب متھرا بادل
برج میں آج سری کشن ہے کالا بادل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل
راجہ اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی
نغمۂ مے کا سرِ کشن کنہیا بادل [7]

جوش ملیح آبادی ایک جگہ گھنشیام کی دلکش اور سریلی آواز میں بانسری بجانے کا ذکر کرتے ہیں جس سے گوپیاں ان کی جانب متوجہ ہو جاتی ہیں اور ان کے عشق میں فنا ہو کر جاں نثار کر دیتی ہیں۔ مزید ایک جگہ جناب کرشن اور گوپیوں کے عشق کی داستان کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ کنہیا کے مدھر بانسری کی آواز سے گوپیوں کے ہردے میں بدری چھا جاتی ہے اور ہر دل عشق کنہیا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور گوکل جنگل میں عشق و محبت کی

فراق گورکھپوری کی شاعری میں جہاں زیست کی سرمستیاں، شادابیاں، وصل و ہجر کی تلخیاں اور غم و آلام کی جلوہ فرمائیاں موجود ہیں وہیں حسن و عشق کے عناصر بھی جاگزیں ہیں۔ محبوب کے ناز و نعم، حسن و جمال، حسین ادائیں، سرشاری اور جاں نثاری کے رنگ بھی غالب ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں رادھا اور کرشن کنہیا کے حسن و عشق کی داستان کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور جا بجا کیف و سرور، سرمستی، رندی، تشنگی، سرشاری اور حسن و جمال کی منظر کشی بھی کی ہے۔

داستان چھڑ جاتی ہے۔اسی طرح جوش ملسیانی نے اپنی معروف نظم 'بھگوان تمھیں کیا' میں کرشن کنہیا سے عقیدت وانسیت کا اظہار کیا ہے اور انھیں بھگوان اور گھنشیام جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔اس کے علاوہ ندا فاضلی نے 'ورندا ون کے کرشن کنہیا اللہ ھوٗ' سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔حفیظ جالندھری بھی کرشن کے بہت بڑے مداح تھے۔ برصغیر میں ان کی نظم 'کرشن کنہیا' کو شہرت دوام حاصل ہوئی ہے۔ان کی نظر میں کرشن کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ بے مثل ہیں۔بے نظیر ہیں۔وہ ہری داس، گوپال اور منوہر ہیں۔جس کے باعث سبھی ان کے متوالے نظر آتے ہیں۔کلیات حفیظ جالندھری (ص 86) میں کہتے ہیں کہ گوکل کا گوالا یہ بانسری والا دنیا سے نرالا ہے جو اخلاق کا دھنی اور اخلاص کا پیکر ہے اور بظاہر ایک شخص ہے لیکن در حقیقت کچھ اور ہی شے ہے۔[8]

شاہ کاظم عباسی کاکوروی کے حوالے سے کرشن جی کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کی شاعری گنگ وجمن کا سنگم قرار دی گئی ہے، کیونکہ ان کے مطالعہ کلام سے عشق کنہیا کی دھارا بہتی نظر آتی ہے، جس سے تشنگان دل سیراب ہوتے نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری اٹھارہویں صدی کے معروف شاعر رسکھان کی شعری روایت کو مزید آگے بڑھاتی ہے۔انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'سانت رس' تصنیف کرکے بھکتی روایت کو شہرت دوام بخشا ہے۔وہ لکھتے ہیں ؎

کہاں گئے برج لال بسیا
من موہنی بنسی کے بجیا
کہاں چھپی جائے موہنی مورتیا
سگرے نگر کے من کی چھلیا
جون کرت رہے کھیل کنجن ما
کونے کنج چھپو ای دیاّ
کہاں گئیں گوپیں روپ انوپیں
دودھ ماکھن گورس کی بچیا
چھین چھین دَدُھ مٹکی پھوڑ پھوڑ [9]

اسی طرح مزید ایک جگہ کہتے ہیں معلوم نہیں وہ کیا معاملہ تھا اور کیا ترکیبیں تھیں جن سے کاظم (رادھا) نے شیام کے دل کو فتح کرلیا اور ان کے دلوں پر سکہ بٹھا دیا وہ کنہیا جو رادھا کے من کو موہ لیا تھا اور اپنی کامرانی کا سکہ جما دیا تھا۔شعر ملاحظہ ہو ؎

کہہ گن کاظم شیام لبھانے
رادھا ہر کے جئے دھنیا [10]

فراق گورکھپوری کی شاعری میں جہاں زیست کی سرمستیاں، شادابیاں، وصل و ہجر کی تلخیاں اور غم و آلام کی جلوہ فرمائیاں موجود ہیں وہیں حسن وعشق کے عناصر بھی جاگزیں ہیں۔محبوب کے ناز ونعم، حسن و جمال، حسین ادائیں، سرشاری اور جاں نثاری کے رنگ بھی غالب ہیں۔انہوں نے اپنے کلام میں رادھا اور کرشن کنہیا کے حسن وعشق کی داستان کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور جا بجا کیف و سرور، سرمستی، رندی، تشنگی، سرشاری اور حسن و جمال کی منظر کشی بھی کی ہے ؎

یہ کیف و رنگ نظارہ یہ بجلیوں کی لپک
کہ جیسے کرشن سے رادھا کی آنکھ اشارہ کردے کردے [11]

وہ راتوں رات سری کرشن کو اٹھائے ہوئے
بلا کی قید سے بسدیو کا نکل جانا [12]

ایک جگہ مزید رادھا اور سری کرشن کے عشق ومحبت کی داستان بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دل اس مایا روپی سنسار میں نہ جانے کتنے مہابھارت برپا ہوئے اور دل گھروندا بنا۔کہیں ہیرا اور رانجھا کی شکل میں، کہیں قیس اور مجنوں کی شکل میں، کہیں یوسف اور زلیخا کے عشق حقیقی کی شکل میں تو کہیں رادھا اور کنہیا کے عشق حقیقی کی شکل میں۔حتیٰ کہ عشق نے شیخ سرمد اور منصور حلاج جیسے عظیم سالک کو بھی اپنے زد میں لے لیا اور انہیں تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ملاحظہ ہو ؎

دنیا میں ہوئے اے دل کتنے ہی مہابھارت
ارجن کی کماں تھا تو بھیشم کی پیکاں تھا
اسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا، سلوچنا، رادھا [13]

اسی طرح چندر بھان کیفی دہلوی کی شاعری میں بھی کرشن کنہیا کی مدح سرائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔کہیں الفت کرشن میں یشودا کا بے قرار ہونا تو کہیں سری کرشن کا یشودا سے ملنے کی تدبیر کرنا اور ان کی محبت میں بے خود ہونا وغیرہ کنہیا سے اظہار محبت کی واضح دلیل ہے۔ایک جگہ کنہیا کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد پذیر ہیں ؎

ہیں جسودھا کے لیے زینت آغوش کہیں
گوپیوں کے بھی تصور سے ہیں روپوش کہیں
گوپیاں سن کے مرلیاں ہوئیں ایسی بیتاب
گر گئے ہار کہیں، رہ گئی پاپوش کہیں [14]

حاصل کلام یہ کہ اگر بنظر عمیق ودقیق مطالعہ کیا جائے تو اردو شاعری میں مدح کرشن کے عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔اردو شعرا نے اپنے کلام میں کرشن کنہیا کے بارے میں لکھ کر کی ہے۔ان شعرا کے کلام سے تہذیب گنگ وجمن کی ایسی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے جس سے پوری فضا معطر ہوجاتی ہے۔

حواشی

1 کلیات ہندوی امیر خسرو، گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی دہلی، 2017، ص 25
2 رسکھان گرنتھا ولی (ہندی)، پروفیسر دیش راج سنگھ بھاٹی، اشوک پرکاشن دہلی، 1966، ص 155
3 دیوان حسرت موہانی، مرتبہ مرحومہ بیگم حسرت موہانی، ح ہفتم، شفیق بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی، 1977، ص 312
4 ایضاً ص 371
5 کلیات نظیر اکبر آبادی، عبد الباری آسی، نول کشور پریس بکڈ پو لکھنؤ، 1951، ص 44-743
6 ایضاً ص 745
7 کلیات مولوی محمد محسن، مولوی محمد نور الحسن، نامی پریس کانپور، 3123ھ، ص 97 تا 1107
8 کلیات حفیظ جالندھری، فرید بک ڈپو دہلی، 2008، ص 86
9 سانت رس، شاہ محمد کاظم قلندر، خانقاہ عالیہ کاظمیہ کاکوروی لکھنؤ، 1957، ص 61-160
10 ایضاً ص 32
11 گل نغمہ، فراق گورکھپوری، مکتبۂ فروغ اردو ٹمیا محل دہلی، 2006، ص 135
12 ایضاً، ص 256
13 ایضاً، ص 249
14 خمستان کیفی، طالب دہلوی، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، 1951، ص 76

Dr. Talib Ikram
S/o Master Ikramul Haque Abbasi
Vill.: Chheetay Mau, post-
Mahraunda
Via- Mau Aima
Dist- Prayagraj- 212507
E mail.: talibikram3@gmail.com
Mob.: 7800812595

روئداد

تعریف، تفاعل اور کردار

عبدالرحمن فیصل

روئداد / وصف حال کا بنیادی طریقہ یہی ہے کہ روئداد میں وقت ٹھہر جاتا ہے یعنی افسانہ نگار واقعہ کو درمیان میں روک کر کردار کی کیفیت، صورت حال یا جگہ کی تفصیل بیان کرنے لگتا ہے۔ اور پھر وقت میں حرکت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب واقعہ بیان ہونے لگتا ہے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ افسانے کا راوی اسی وقفے کو جہاں وہ وقت کے دھارے کو روک دیتا ہے، اپنے مشاہدے کے بیان سے تشکیل دیتا ہے۔ لیکن اس بیان میں روئداد وقت اور دورانیہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آمیز ہو جاتے ہیں کہ قاری کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار افسانے میں وقت کے دھارے کو روک کر روئداد سے پُر کرتا ہے۔

علم بیانیات (Narratology) کے ماہرین نے جب سے بیانیہ کے اوصاف، تفاعل اور اس کی اہمیت و افادیت پر مباحث کا سلسلہ شروع کیا ہے، بیانیہ اصناف میں روئداد کی اہمیت مسلم ہوئی ہے۔ روئداد (Description) کے پُرقوت بیانیہ تفاعل کو دیکھتے ہوئے ماہرین اب اسے محض طرز اظہار کی ایک حاوی شکل کے طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اسے ادبی نمائندگی کی ایک جہت تصور کرتے ہیں۔

اردو میں Description کے لیے دو لفظ مستعمل ہیں روئداد اور وصف حال۔ یہ نظم یا نثری متن کی وہ ترتیب ہے جس میں 'عمل' کے علاوہ دوسری بیشتر انواع بیان کی نمائندگی شامل ہے۔ بیانیہ میں روئداد کی اہمیت و افادیت اور اس کے کردار پر گفتگو سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ روئداد کے کیا معنی ہیں اور ادب کے ماہرین کے نزدیک اس کی کیا تعریف ہے۔

اکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں روئداد کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں:

1 (الف) بیان، نقل، کہنے، بنانے، کھینچ کر دکھانے کا عمل (ب) کسی شخص، شے یا واقعہ کا زبانی یا تحریری نقشہ۔

2 قسم، نوع۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی مرتب کردہ انگریزی اردو لغت میں روئداد کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں:

''(1) بیان، ذکر؛ وصف، کیفیت، تعریف، صراحت (2) قسم، نوع (3) (ہندسہ) شکل بنانا۔''

Mieke Bal کی مرتب کردہ کتاب "What is Narrative Theory" میں شامل مضمون a description by Philippe Hamon میں روئداد کی یہ تعریف کی گئی ہے:

''روئداد اشیا کا بیان ہے اور بیانیہ اعمال (Acts) یا واقعات کا بیان ہے۔ گرامر (Morphological) کی زبان میں روئداد/ وصف حال اسم وصفت کا بیان ہے اور بیانیہ فعل سے مشتق ہے۔''... ''روئداد، لسانی اکائی کی ایک خود مختار صورت ہے جو بیانیہ کا کم و بیش ضمیمہ ہے۔ روئداد بیانیہ میں آزادی کے ساتھ داخل ہو سکتی ہے۔ روئداد میں کسی مخصوص نشان یا روایتی اشیا کا فقدان ہوتا ہے۔ روئداد ماقبل کی کسی پابندی سے مشروط نہیں ہوتی ہے۔''1

مزید لکھتا ہے:

''تعریف کی رو سے روئداد ایک پیرامیٹر کے سبب (فہرست، شمار، فرہنگ) بیانیہ میں داخل ہو کر رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ کردار کے دیکھنے کے عمل کو منظر تصور کر کے مخصوص عرصے میں پھیلا دیتا ہے۔ دیکھنے کا یہ عمل روئداد سے منسوب کیا جائے گا''2

ژرار ژینت رقم طراز ہے:

''ہر بیان حقیقتاً دو قسم کی نمائندگی سے مل کر بنتا ہے جو مختلف تناسب میں ایک دوسرے میں گھلی ملی ہوتی ہیں۔ ایک طرف عمل اور واقعات کی نمائندگی ہے جو اپنے خالص مفہوم میں بیانیہ ہے اور دوسری طرف اشیا و کرداروں کا بیان ہے جو روئداد اور تفصیل کا نتیجہ ہے۔''[3]

گرامر کی زبان میں روئداد یا وصف حال اسم وصفت کا بیان ہے یعنی روئداد میں فعل کا بیان نہیں ہوگا۔ لیکن کوئی بھی بامعنی جملہ صرف اسم وصفت یا صرف فعل سے تشکیل نہیں پاتا، اس لیے ایک بامعنی متن ان تینوں کے اتصال سے ہی تعمیر ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فعل سے مشتق نہ ہونے کے سبب روئداد بیان کے خالص مکانی وجود پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن روئداد کبھی آزاد حالت میں نہیں پایا جاتا، یہ بیانیہ کا لازمی جز ہوتا ہے۔ بیانیہ جو کہ واقعہ کا بیان ہے اور واقعے میں صورت حال کی تبدیلی ایک زمانی تسلسل کی پابند ہوتی ہے اس لیے جیسے ہی روئداد واقعہ کے درمیان میں داخل ہوتی ہے وقت کا گزران رک جاتا ہے۔ یعنی اپنے خالص مکانی وجود کے سبب روئداد کے بیان میں وقت ٹھہر جاتا ہے اور پھر وقت میں حرکت اس وقت شروع ہوتی ہے جب 'واقعہ' بیان ہونے لگتا ہے۔ گویا فکشن بیانیہ میں مکان (Space) کا تصور اور تعین روئداد کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔

بیانیہ اور روئداد کے اس طرح ہم آمیز ہونے کے سبب دونوں میں کسی نہ کسی نوع کا ربط و تعلق بھی موجود ہوگا۔ دونوں کے درمیان ربط و تعلق کا مطالعہ ہی اصلاً روئداد کے بیانیہ تفاعل کی وضاحت کرتا ہے۔ روئداد کے بیانیہ تفاعل کی ایک ابتدائی صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے ژرار ژینت لکھتا ہے:

''اصولاً ایک خالص روئدادی متن کا تصور ممکن ہے، جس کا مقصد کسی واقعے بلکہ کسی بھی زمانی جہت سے ماوراو بے نیاز، معروض کی خالصتاً اپنے مکانی وجود میں نمائندگی ہے..... حتیٰ کہ ایک فعل بھی اس اعتبار سے کم و بیش روئداد ہوسکتا ہے کہ وہ فعل یا عمل کو بے کم و کاست بیان کرتا ہے..... اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی فعل روئداد کے شائبہ سے یکسر خالی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ روئداد بیانیہ کے مقابلے میں زیادہ ناگزیر ہے، اس لیے کہ بغیر بیانیہ عناصر کے تفصیل بیان کرنا، بغیر روئداد کے بیانیہ کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ (غالباً اس لیے کہ ایک شے بغیر حرکت کے وجود رکھتی ہے، جب کہ حرکت بغیر شے کے ممکن نہیں)۔''[4]

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہے کہ روئداد کا تصور بیانیہ کے بغیر ممکن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ روئداد کبھی آزاد حالت میں نہیں ملتا اس لیے کہ کوئی بھی صنف محض روئداد نہیں ہوتی ہے۔ ایک اور اہم بات جو مذکورہ اقتباس کے اس جملے سے (کہ کوئی فعل روئداد کے شائبہ سے یکسر خالی نہیں ہوسکتا) ظاہر ہوتی ہے کہ بیانیہ میں وقت کا تصور بھی مکان کے چوکھٹے میں ہی قائم ہوتا ہے یعنی روئداد کے بغیر بیانیہ کا وجود ہی ممکن نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ روئداد اسم وصفت سے مشتق ہے یا اسما و کردار کا تفصیلی بیان ہے، کافی نہ ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فکشن بیانیہ میں وقت/ زمانے کا تصور/تعین روئداد کے ہی ذریعے ایک مخصوص مکانی وجود میں قائم ہوتا اور اپنے معنی دیتا ہے۔

وقت اور جگہ کے تعین کے ساتھ ساتھ فکشن بیانیہ میں وقت کے بہاؤ کو 'بیان' کا پابند رکھنے کے لیے فکشن نگار روئداد کا استعمال کرتا ہے۔ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ افسانے/ ناول کا راوی کسی کردار، صورت حال، شے یا جگہ کا بیان کرتے ہوئے نہایت کامیابی سے روئداد/ وصف حال کو واقعے سے مربوط کر لیتا ہے۔

روئداد/ وصف حال کا بنیادی طریقہ یہی ہے کہ روئداد میں وقت ٹھہر جاتا ہے یعنی افسانہ نگار واقعہ کو درمیان میں روک کر کردار کی کیفیت، صورت حال یا جگہ کی تفصیل بیان کرنے لگتا ہے۔ اور پھر وقت میں حرکت اس وقت شروع ہوتی ہے جب واقعہ بیان ہونے لگتا ہے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ افسانے کا راوی اس وقفے کو جہاں وہ وقت کے دھارے کو روک دیتا ہے، اپنے مشاہدے کے بیان سے تشکیل دیتا ہے۔ لیکن اس بیان میں روئداد وقت اور دورانیہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آمیز ہو جاتے ہیں کہ قاری کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار افسانے میں وقت کے دھارے کو روک کر روئداد سے پُر کرتا ہے۔

اس کی مثال میں اسد محمد خاں کے افسانہ 'نربدا' کا یہ اقتباس دیکھیں جس میں جب بوڑھا راجپوت گھڑ سواروں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ بٹ مار ہیں سسرے اور پھر اپنی نیام کی ہوئی سروہی، کٹار اور سوا بالشت چوڑی راجپوتی ڈھال پیال سے نکال کر زمین پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ٹھگوں کے گھوڑوں کا بیان روک کر افسانہ نگار دونوں باپ اور بیٹے کی لڑائی کے لیے تیاری کی تفصیل بیان کرتا ہے:

''پٹکے میں کٹار اڑس کے کمر سے نیام کا پرتلا باندھے ہوئے ''ما آلائے بھوانی!'' کہتا وہ گاڑی چھوڑ رسان سے زمین پہ آ کھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے اپنی تلوار کے قبضے کو چھوا۔ وہ ہاتھ اپنے ماتھے اور آنکھوں پہ پھیرتا ہوا ہونٹوں تک لایا، اسے چوم کر تلوار کے قبضے پر مضبوط گرفت قائم کی اور بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا ''ہاں رے پتر سارنگ سنگھ!''

لڑکے نے بھی یہی سب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا ''ہاں رے بابا!''

دونوں نے اپنی اپنی تیاری کی خبر دی تھی۔

لڑکے کی کمر سے کھانڈا بندھا تھا۔ کھانڈا بوڑھے کی سروہی سے کوئی سوائی ڈیوڑھی لمبائی کا تھا۔ ایسے ہتھیار بلخ اور بخارا سے منگائے جاتے تھے اور صرف نوجوان تلوریوں میں مقبول تھے۔ پرانی ڈھب کے ساونت انھیں دیکھ دیکھ کے ہنستے تھے اور طنز کرتے تھے کہ گنوار کھا مرے یا اٹھائے مرے...... کہتے تھے، ''ای کھانڈا چھوڑ، کلھاڑا کاہے نئیں باندھ لیہو کمر سے، ہاں بھیا؟''

لڑکی یاد کر کے مسکرائی۔ اس نے بٹ ماروں کو بڑھتے اور دونوں کو تیاری کرتے دیکھا۔ باپ بیٹے کی حرکات میں ایک طرح کی ہمواری اور سبھاؤ میں دھیما پن تھا...... گھات کرتے چیتے کا دھیما پن کہ جب وہ زمین سے پیٹ لگائے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوتا ہے۔ ٹھگوں کے تومرکب تک او بڑکھابڑ ٹانگیں مارتے آ رہے تھے۔

لڑکے نے اب اپنی طرف کے پیال میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے ایک سبک سی برچھی اور راجپوتی ڈھال کھینچ نکالی۔ ''ای لو...... دونوں تمہارے ہی مطبل کے ہیں۔'' اس نے یہ ہتھیار لڑکی کی طرف بڑھا دیے۔

''اخا!'' لڑکی نے برچھی سنبھالتے ہوئے بے اختیار تعریف کی۔ چاروں سوار خاصا بڑھ آئے تھے۔ اس نے برچھی ہاتھ میں تولی۔ زخمی شانے کو آرام دینا تھا سو ڈھال کا تسمہ الجھا کر اس نے ہاتھ کو دوسرے شانے پر ٹکا لیا اور ریت میں قدم جما کے کمر سے اوپر اپنا بدن دائیں بائیں جھلاتے ہوئے نیزہ زنی کی ابتدائی مشقیں دہرانی شروع کر دیں۔ وہ منھ ہی منھ میں شمار کرتی جا رہی تھی، 'ایک، دو، تین، دائیں! ایک، دو، تین، بائیں!، تین، دو، ایک، ہا! ایک، دو، تین، ہا!'' ہر 'ہا!'' پر اس کا برچھی والا ہاتھ ہوا میں مار کرتا تھا۔

لڑکا دیکھ کے مسکرانے لگا مسخرے میں اس کی تعریف کی۔ بولا، ''ہاں آں، تمہیں تو یاد ہے۔ واوا! پورا سبک یاد ہے!'' پھر اس نے خود بھی یہ مشقیں دہرائیں، ''ایک، دو، تین، دائیں! ایک، دو، تین، بائیں! تین، دو، ایک، ہو! ایک، دو، تین، ہو!' ہو!' پر اس کا بھی ہاتھ نیزہ پھینکنے کا دکھاوا کرتا تھا۔'

گاڑی سے سو قدم دور رہ گئے تو سواروں نے ایک دوسرے کو اشارہ دیا اور رخ مار کے گھوڑوں کو ایڑ دیتے مختلف سمتوں میں انھیں دور تک دوڑائے چلے گئے۔''5

مندرجہ بالا اقتباس میں دیکھیں کہ ٹھگوں کے گھوڑوں کا ذکر اس وقت تک رکا رہتا ہے، جب تک باپ بیٹے کی تیاری چلتی رہتی ہے۔ لیکن اس بیانیہ میں وقت ٹھہرا ہوا نہیں ہے بلکہ ٹھگوں کے گھوڑے دوڑے آرہے ہیں اس کا اشارہ اقتباس میں موجود ہے مثلاً (1) ''اس نے بٹ ماروں کو بڑھتے اور دونوں کو تیاری کرتے دیکھا۔'' (2) ''ٹھگوں کے تو مرکب تک اوبڑ کھابڑ ٹانگیں مارتے آرہے تھے۔'' (3) ''چاروں سوار خاصا بڑھ آئے تھے۔'' لیکن چونکہ ٹھگ فاصلے پر تھے تو راوی نے اس دورانیہ کو باپ بیٹے کی تیاری کی تفصیل کے لیے استعمال کرلیا۔ اس طرح ایک ہی بیان میں ایک طرف وقت جاری رہتا ہے اور دوسری طرف فاصلے کے سبب پیدا ہونے والے وقفے کو افسانہ نگار وصف حال/ روئداد سے پُر کرلیتا ہے۔

اس سے روئداد کے تفاعل میں جو نمایاں فرق ہوا ہے وہ یہ کہ مذکورہ اقتباس میں روئداد کو بیانیہ کی طرح ڈرامائی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی کردار کی جسامت کی لسانی تشکیل، اس کے لباس اور اس کے اطراف کی اشیا سے اس قدر مربوط یا ہم آمیز کردی جاتی ہے کہ وہ سب مل کر کردار کی نفسیات کا بیک وقت انکشاف بھی کرتے ہیں اور اس کے ہونے کا سبب اور نتیجہ بھی بنتے ہیں۔ اردو افسانے میں اس کی عمدہ مثال منٹو کے افسانہ 'سوگندھی' میں سوگندھی کا کردار ہے۔ ژرار ژینت کہتا ہے کہ روئداد کے اس قدر معنوی اہمیت حاصل کر لینے کی وجہ سے اس کی خود مختاری ختم ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ روئداد کی اہمیت کم ہوئی ہے یا بیانیہ متن/فکشن بیانیہ میں روئداد کے کردار کی تخفیف ہوئی ہے بلکہ اگر اسے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ روئداد، جامد ذہنی نقشہ کے بجائے بیانیہ کی طرح ڈرامائی اور متحرک صفات سے متصف ہوئی ہے تو یہ روئداد اور بیانیہ کے جدلیاتی رشتے کو زیادہ مضبوط اور مستحکم بناتی ہے۔6

مذکورہ اقتباس میں روئداد (آرائشی یا تزئینی) نے جامد کردار کے بجائے معنوی اور ڈرامائی اہمیت تو حاصل کر لی ہے لیکن اس سے اس کے مکانی کردار میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے کیونکہ اس اقتباس میں روئداد دیکھنے کے عمل کو بقول 'فلپ ہیمن' ایک منظر تصور کرکے وقت کو معطل کر دیتا ہے اور بیانیہ یعنی عمل کے تسلسل کو ایک مخصوص زمانی عرصے میں پھیلا دیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیانیہ کلام (Discourse) کے زمانی کردار پر دلالت کرتا ہے اور روئداد معروض یا اشیا کے ہمہ وقتی وجود کے سبب بیان کے خالص مکانی وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اظہار کی سطح پر بیانیہ اور روئداد کلام (Discourse) کی اقسام ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ایک واقعے کا بیان اور دوسرا معروض یا اشیا (Objects) کا تفصیلی بیان، دونوں ایک ہی طرح کے عمل ہیں اور دونوں زبان کے یکساں وسائل کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن دونوں میں جو نمایاں فرق ہے اس کے متعلق ژرار ژینت لکھتا ہے:

''بیانیہ، کلام کے زمانی کردار کے حوالے سے سلسلۂ واقعات کو دوبارہ قائم کرتا ہے جب کہ روئداد مبرہن تسلسل میں ان اشیا کی نمائندگی کو موزوں ترین ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے جو ایک مخصوص محل میں بہ یک وقت اور پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔''7

لیکن اگر طرز اظہار کے بجائے زبان کے تخلیقی کردار کا مطالعہ کیا جائے تو روئداد کی زبان ہی بیانیہ کو حد درجہ تخلیقی بناتی ہے اس لیے کہ روئداد اشیا یا معروض کو حواس کی سطح پر خلق کرتی ہے اور قاری کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بیان کردہ جزئیات کو ایک ذہنی تصویر کی صورت دے سکے۔ روئداد چونکہ اسما وصفات کا استعمال کرتی ہے لہٰذا اس کی زبان زیادہ موضوعی اور پُر استغراق ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے روئداد کی زبان بیانیہ کے مقابل زیادہ تخلیقی/ شعری ہوتی ہے۔

جس طرح روئداد کے بغیر بیانیہ کا وجود ممکن نہیں ہے اسی طرح روئداد کے بغیر پُر قوت تخلیقی بیانیہ کی تشکیل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جو تخلیق کار روئداد نگاری پر قدرت نہیں رکھتا وہ پُر قوت تخلیقی بیانیہ تشکیل نہیں دے سکتا۔

روئداد، ادبی نمائندگی کے ایک طرز کی حیثیت سے کبھی بھی اپنی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن بیانیہ سے روئداد کے اس جدلیاتی رشتے کے سبب متن میں روئداد کے تفاعل اور اس کے کردار کا مطالعہ نہایت ہی ناگزیر ہو جاتا ہے جیسا کہ ژرار ژینت کا خیال ہے کہ اگر ہم بیانیہ کے تصور میں ادبی نمائندگی کی، تمام صورتوں کو شامل کریں اور روئداد کو صرف ایک طرز نہ سمجھیں (جس کے لیے زبان کی تخصیص ضروری ہوگی) بلکہ زیادہ سیدھے سادے طریقے سے اسے ادبی نمائندگی کی ایک جہت تصور کریں تو ممکن ہے کہ وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ پُرکشش ہو۔

روئداد، ادبی نمائندگی کے ایک طرز کی حیثیت سے کبھی بھی اپنی خود مختاری کا دعوی نہیں کرتا لیکن بیانیہ سے روئداد کے اس جدلیاتی رشتے کے سبب متن میں روئداد کے تفاعل اور اس کے کردار کا مطالعہ نہایت ھی ناگزیر ھو جاتا ھے جیسا کہ ژرار ژینت کا خیال ھے کہ اگر ھم بیانیہ کے تصور میں ادبی نمائندگی کی، تمام صورتوں کو شامل کریں اور روئداد کو صرف ایک طرز نہ سمجھیں (جس کے لیے زبان کی تخصیص ضروری ھوگی) بلکہ زیادہ سیدھے سادے طریقے سے اسے ادبی نمائندگی کی ایک جہت تصور کریں تو ممکن ھے کہ وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ پُرکشش ھو۔

حواشی

1. Micke Ball(Edited) Narrative theory, Critical concept in literary and cultural studies, Routledge Taylor & Francis group London, New york, V-l, 2004, Pg-309
2. ایضاً ص 312
3. رسالہ تنقید، ششماہی علی گڑھ مشمولہ: بیانیہ کی سرحدیں: مترجم قاضی افضال حسین، 2011، ص 171
4. رسالہ تنقید، ششماہی علی گڑھ مشمولہ: بیانیہ کی سرحدیں: مترجم قاضی افضال حسین، 2011، ص 171
5. افسانہ نربدا، مجموعہ نربدا، مشمولہ جو کہانیاں لکھیں 2006، ص 392-93
6. رسالہ تنقید، ششماہی علی گڑھ مشمولہ: بیانیہ کی سرحدیں: مترجم قاضی افضال حسین، 2011، ص 174
7. رسالہ تنقید، ششماہی علی گڑھ مشمولہ: بیانیہ کی سرحدیں: مترجم قاضی افضال حسین، 2011، ص 175

Dr. Abdur Rahman Faisal
Assistant Prof. (C)
UP Rajarshi Tondon Open University
Prayagraj - 211013 (UP)
Mob.:8218467664

گلشن مسرت

شاعری کا ذکر دنیا کی تمام زبانوں میں موجود ہے ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ شاعری میں سکون قلب بھی ہے اور روح کو تڑپا دینے کا ہنر بھی۔ علم و فن کا مظاہرہ اور فن کی ستائش کی خواہش نے شعری نشستوں کی بنیاد رکھی تو مشاعروں کی روایت وجود میں آئی۔

اردو مشاعروں کی افادیت اور ادبی روایت

زبان اردو کی آبیاری میں درباروں، بازاروں اور مختلف تہذیبی اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ زبان اردو مغلیہ دور میں ابھری اور پروان چڑھی۔ اس کا تعلق محض درباروں سے نہیں رہا یہ عوام کی زبان تھی جو عوام کے درمیان اپنے مقامی رنگ میں ارتقا پزیر تھی۔ غزل کیونکہ اردو شاعری کی سب سے محبوب و مقبول صنف ہے۔ زبانِ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے غزل میں طبع آزمائی کی۔ مشاعروں کی ابتدا میں صنف غزل کی سحر آفرینی ہی ہے جس نے مشاعروں کی روایت کو نہ صرف وقار بخشا بلکہ زبان کے ارتقائی سفر کو مزید تقویت عطا کی اور زبانِ اردو کو عوام سے جوڑنے کا کارنامہ انجام دیا اور خاص و عام میں مقبولیت عطا کی۔ اردو مشاعروں کی روایت صدیوں پر محیط ہے، دورِ حاضر میں مشاعرے ایک تہذیبی روایت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

دیگر ملکی زبانوں میں بھی شعری نشستوں کا انعقاد عمل میں آتا رہا ہے مگر ان میں سے کسی کو بھی عالمی سطح پر وہ امتیاز حاصل نہیں جو اردو مشاعروں کا اعزاز ہے شعرا کی مقبولیت اور مشاعروں کی کامیابی کا انحصار شاعری پر ہے شاعری قلب و ذہن پر گزرنے والی واردات اور کیفیات کے اظہار کا بے حد مؤثر ذریعہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل پر اثر کرتی ہے۔ حالی کے نزدیک 'شاعری عطیہ خداوندی ہے'

شاعری کا ذکر دنیا کی تمام زبانوں میں موجود ہے ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ شاعری میں سکون قلب بھی ہے اور روح کو تڑپا دینے کا ہنر بھی۔ علم و فن کا مظاہرہ اور فن کی ستائش کی خواہش نے شعری نشستوں کی بنیاد رکھی تو مشاعروں کی روایت وجود میں آئی۔

مشاعرے کی تاریخ بہت قدیم ہے ہندوستان میں مشاعروں کے آغاز سے بہت پہلے عرب اور ایران میں مشاعروں کی ابتدا ہو چکی تھی حالانکہ ان کی نوعیت قدرے مختلف تھی عرب کے مشاعروں میں قبائلی زندگی کی روح اور حسب و نسب کا طمطراق موجود تھا تو ایران کے مشاعروں میں زندگی کی حقیقت اور درباروں کی نفاست کے لوازم موجود تھے۔ عربی زبان سے اس روایت کا آغاز ہوا، مگر مقبولیت کے اعتبار سے فارسی اور اردو زبان میں اس کی روایت زیادہ طویل اور مستحکم نظر آتی ہے۔ عربوں کے قبائلی جاہ و حشم اور پر تصنع تمدن سے کون واقف نہیں دورِ جاہلیت میں اس کی تاریخی مثالوں کا ایک باب رقم ہے۔

شاعری کے میدان میں بھی یہ روایت من و عن موجود تھی شاعری کا رواج عوامی سطح تک تھا ہر قبیلے کے اپنے شعرا تھے جن کی سرپرستی اور قدردانی میں اہل عرب ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی غرض سے ان شعرا کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ باقی رکھتے، ہر قبیلہ اعلی ترین شاعر کی اپنے قبیلے میں موجودگی باعث افتخار سمجھتا تھا۔ یہ روایت عہد اسلام کے بعد بھی جاری تھی مگر اب فحاشی، عاشقانہ جذبات اور تلذذ کی جگہ مذہبی پاکیزگی اور ثنا سرائے نے لے لی تھی اور آہستہ آہستہ سماجی، سیاسی اور مذہبی تبدیلیوں کے باعث عربوں کی یہ قدیم عوامی روایت ماند پڑ گئی۔

ایران میں فارسی شعرا کا ایک جم غفیر موجود تھا جن میں سے کثیر تعداد ان شعرا کی تھی جو درباروں سے وابستہ تھے درباروں سے وابستگی کے سبب ان شعرا نے اپنا سارا

زورقلم قصائد پر صرف کیا۔ قصائد کے شانہ بشانہ غزل اور دیگر اصناف سخن بھی فروغ پا رہے تھے۔ شعرا کی سرپرستی، سخاوت اور ادب نواز کہلانے کی خواہش نے اور اپنے درباروں کی رونق میں مزید اضافے کی غرض سے ان شعرا کی قدر میں اس قدر اضافہ کیا کہ انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

قصائد کے شانہ بشانہ غزل بھی رواج میں آ چکی تھی، مگر اب بھی احساسات، جذبات وخیالات کی ترسیل ایک مخصوص دائرے میں محدود تھی۔ باقاعدہ مشاعرے کا آغاز 15ویں صدی میں 1519 کے قریب ہوا، ایران کے شہروں میں مشاعرے کا انعقاد کیا جانے لگا اور شہر شیراز اس کا مرکز بنا۔لیکن ایران میں مشاعرے نے وہ عوامی صورت اختیار نہ کی تھی جو بعد میں فارسی شاعری کی تقلید میں ہندوستان میں واضح ہوئی۔

ہندوستان میں دکن میں جب اردو زبان نے ادبی حیثیت اختیار کی تو تمام اصناف سخن غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ کوفروغ حاصل ہوا نہ صرف شعرا بلکہ متعدد بادشاہوں نے بھی فن شاعری میں تخلیقات پیش کیں اور قطب شاہی عہد کے تاجدار قلی قطب شاہ نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا افتخار بھی حاصل کیا۔ان میں بعض ایسے بادشاہ بھی شامل تھے جو شعروسخن کے دلدادہ تو نہیں تھے مگر درباری وضع کی روایت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس روایت کا حصہ بنے ہوئے تھے۔

15ویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی عالمی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان میں مغل سلطنت اپنے عروج پر تھی ملک کے دیگر خطوں پر مسلمان حکمرانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ان درباروں میں کثیر تعداد میں شعرا موجود تھے۔ ایرانی تہذیب وثقافت کے اثرات ہندوستانی تہذیب کے ہر گوشے کو متاثر کر رہے تھے۔علم وفن، تہذیب وثقافت، عوامی زندگی سے حکومت وقت تک ایرانی تہذیب کے اثرات نمایاں تھے۔

دیوان ولی کی دہلی آمد کے بعد شمالی ہند میں باقاعدہ اردو میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ولی کے اشعار گلی کوچوں، ادبی محفلوں اور اہل ذوق کی مجلسوں میں گونجنے لگے۔ شعرائے دہلی، ولی کی زمینوں میں شعر کہنے کو باعث فخر سمجھنے لگے محمد شاہی دور میں جب مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا ہوئی تو بہت سی رنگ رلیوں کے ساتھ مشاعروں کی رونق میں بھی اضافہ ہوا اور غالباً اسی زمانے میں ریختہ اردو کے مشاعروں کی بھی ابتدا ہوئی۔

ہندوستان میں شاعری نہ عرب کی طرح عوام سے مخاطب تھی نہ ایران کی طرح صرف خواص اور درباروں تک محدود۔ ہندوستان میں ادب اور شاعری سب سے پہلے صوفیا کی خانقاہوں میں پروان چڑھی۔ جب شرفا میں مقبول ہوئی تو درباروں نے اس کی سرپرستی کا حق ادا کیا اور ایک نئی زبان جو آہستہ آہستہ اپنے ارتقا کی راہیں ہموار کر رہی تھی اسے بیک وقت عوام اور خواص دونوں کی محبت اور توجہ نصیب ہوئی۔ اب درباروں میں فارسی کے ساتھ اردو کو بھی اہمیت دی جانے لگی تھی، جہاں ایک طرف فارسی مشاعروں کی دھوم تھی تو دوسری جانب عہد سودا اور میر میں اردو ترقی کے ان ابتدائی مدارج کو طے کر کے اس مرحلے میں پہنچ چکی تھی کہ اس زبان میں مشاعروں کا آغاز ہو چکا تھا:

''میر تقی میر نے نکات الشعرا میں کئی اردو مشاعروں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی مشاعروں سے ممتاز کرنے کے لیے لوگوں نے ریختہ کے مشاعروں کو 'مراختہ' کہنا شروع کیا۔''

(ذوق ادب اور شعور: سید احتشام حسین، ص83، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ)

اردو شاعروں کو فارسی سے منفرد اور ممتاز کرنے کی غرض سے زبان ریختہ کے مشاعروں کو مراختہ کہا گیا جن میں صرف شعرا ہی نہیں شرفا، امرا، روسا، اور صوفیا اور سلاطین باہم شرکت کرتے تھے ایسے کئی مشاعروں کی تفصیلات نکات الشعرا، ریاض الفصحا میں اور دیگر ابتدائی تذکروں میں موجود ہیں اردو شاعری کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نکات الشعرا میں دکن اور شمالی ہند کے 140 شعرا کا ذکر موجود ہے۔

صوفی شعرا نے بھی محفل سماع کے علاوہ مشاعروں کو بھی ایک تہذیبی روایت کی شکل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا جن میں خواجہ میر درد کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ خواجہ میر درد ہر ماہ اپنے گھر پر ایک شعری نشست کا اہتمام کرتے جس میں شہر کے معزز شرفا، شعرا کے علاوہ بادشاہ وقت بھی شرکت کرتے تھے۔

دہلی پر احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے قتل وغارت گری کا ایسا بازار گرم کیا کہ دہلی کی آبادی اپنے محبوب وطن کو خیرآباد کہنے اور دوسرے شہروں کا رخ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس انتشار کا اثر صرف عوام تک ہی محدود نہ تھا سیاسی حالات پر بھی اس کا شدید اثر ہوا۔ ایسے سیاسی اور معاشی بحران سے متاثر سلاطین و روسا، شعرا کی سرپرستی اور قدردانی کرنے والے خود پناہ تلاش کرنے پر مجبور تھے۔ شعرا تلاش معاش کی خاطر ملک کی دیگر ریاستوں سے منسلک ہو گئے۔

اس وقت تک لکھنؤ ان ملکی حالات سے دوچار نہ ہوا تھا۔ لکھنؤ میں امن ونشاط کا دور دورہ تھا، دہلی کی شکست و ریخت سے متاثر شعرا اپنی تمام تر شعری روایت کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گئے اور لکھنؤ دوسرا ادبی مرکز بن کر ابھرا۔ لکھنؤ کا عیش پرست ماحول ان شعرا کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ نوابین اودھ شعروادب کے پرستار بھی تھے اور سرپرست بھی لکھنؤ میں باقاعدگی سے مشاعروں کی محفلوں کا انعقاد ہونے لگا۔ لکھنؤ کا رنگِ شاعری دہلی سے قدرے مختلف تھا۔ استاد شعرا اپنے اپنے رنگِ دبستان کی بھرپور نمائندگی کر رہے تھے۔ اپنی اپنی ادبی وراثت کی برتری کی خواہش نے معاصرانہ چشمک کو جنم دیا۔ یہاں تک کہ خدائے سخن میر تقی میر کی لکھنؤ آمد پر انھیں جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اس درد و کرب کا احساس میر کے ان اشعار سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو، پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی، جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے، ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں، اسی اجڑے دیار کے

لکھنؤ شعروسخن اور علم وفن کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا لیکن 1857 کے بعد اودھ جو اب تک عیش ونشاط کا گہوارہ تھا وہ بھی اب زوال کی زد میں تھا۔ لکھنؤ اجڑ چکا تھا شہر کی ادبی رونق ماند پڑ چکی تھی اور مشاعروں کی پرانی روایت بھی تبدیل ہوگئی تھی۔

اس بدلی ہوئی فضا میں مشاعروں کی روایت کو جلا بخشنے کی سعی میں مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اور شاعری کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔

''21 جنوری 1865 کو انجمنِ پنجاب قائم کی گئی۔ ڈاکٹر لائٹر کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا... انجمنِ پنجاب اپنے وسیع تر تناظر میں مختلف امور کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس زمانے میں بہت سی ادبی انجمنوں میں سے ایک انجمنِ پنجاب ہی ایسی تھی جس نے آگے چل کر اردو ادب پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔''

(انجمنِ پنجاب کے مشاعرے: عارف ثاقب، ص 22، الوقار پبلی کیشنز، لاہور 1995)

اب مشاعرے طرحی نہیں موضوعاتی ہونے لگے جس نے مشاعروں کو زندگی سے قریب کر دیا اور شاعری میں بھی حقیقی اور نیچرل شاعری کا اضافہ ہوا اور غزل کے

زبان اردو جو ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی اپنی ادبی حیثیت منوانے کے لیے کوشاں تھی اردو شعرا نے اپنی کاوشوں سے اس کے حسن کو مزید جاذبیت عطا کی۔ شاعری جو کہ قلبی واردات اور جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ ہے اس نے عوام کو جوڑنے کا کام کیا۔ شعراجو ان محفلوں کا حصہ رہے انہوں نے عوام کے مذاق اور تہذیبی روایات کو اپنی شعری کاوشوں میں قائم رکھنے کی پوری کوششیں کی کہیں داخلیت کا زور رہا تو کہیں خارجیت کی بھرمار اس کی مثال دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کے رنگ شاعری سے واضح ہے۔

ساتھ ساتھ ان مشاعروں میں نظم کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس بدلی ہوئی صورت حال میں بھلے ہی مشاعروں کا رنگ پہلے جیسا قائم نہ رہا ہو لیکن اس کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ مشاعروں کی اس بدلی ہوئی نوعیت پر ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی تغیرات کا گہرا اثر رہا۔ لیکن ان مشاعروں نے نہ صرف مشاعرے کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ حقیقی رنگ شاعری نے اس کے موضوعات کے دامن کو مزید وسعت عطا کی اور اردو کو اپنے دور کے بہترین شعرا سے متعارف کروایا۔

تحریک آزادی کی جدوجہد نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شعری نشستوں میں بھی انہیں نظریات کی نمائندگی ہونے لگی، حب وطن اور پیغام آزادی کا درس رواج عام ہوگیا جس نے عوام میں جوش آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ ادب کا دامن جیسے جیسے سیاسی اور سماجی تحریکات سے جڑنے لگا مشاعروں کے انداز اور موضوعات میں ایک بار پھر تبدیلی واقع ہوئی اور غزل اور نظم کا دامن مزید وسعت اختیار کرتا گیا۔

آزادی سے قبل اور بعد میں مشاعرے کی روایت میں اتنی تبدیلی رونما ہو چکی تھی کہ اب تصنع، تکلف اور زبان کی تراش وخراش کی جگہ خیال وفکر کی سادگی وندرت نے لے لی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعرا کی تخلیقات میں نئے شعور اور سماجی تغیرات کا اظہار بھی شامل ہوگیا۔ اس عہد میں مشاعروں کی روایت نے انفرادی واجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا اور اردو شاعری کو نئے معنی اور نئی جہت عطا کی۔

مشاعرے کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ زمانے کے اعتبار سے مشاعروں کے انداز بھی بدلے، خانقاہوں کی پاکیزہ فضا کی محفل سماع، میر وسودا کے عہد میں منعقد ہونے والے مراختے، درد کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی شعری نشستیں جن کا تعلق خواص سے تھا یا آتش وناسخ کے دور میں وہ عام سامعین کے مذاق کے مطابق ہونے والے مشاعرے، انجمن پنجاب اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہونے والے اصلاحی، فکری، سیاسی مشاعرے شمع سے لاؤڈ اسپیکر اور ریڈیو تک کا سفر مشاعروں کی روایت نے جس کامیابی سے طے کیا۔ عوام اور ادب کے درمیان جس طرح ایک پل کا کام کیا ان کی مجلسی، اجتماعی اور لسانی اہمیت غیر معمولی نہیں۔

مشاعرے میں شعرا نے ہر زمانے میں عام فہم زبان کا استعمال کیا اور ایسے مضامین کو اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی جس سے سننے والے لطف اندوز ہو سکیں۔ برقی ترقی اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں پہلے ریڈیو پھر ٹیلی ویژن پر منعقد ہونے والے مشاعروں نے کامیابی کی نئی تاریخ رقم کی۔

زبان اردو کی ترویج واشاعت اور عوام سے اس کا تعلق استوار کرنے میں مشاعروں نے ابتدا سے ہی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ زمانہ قدیم جہاں لوگوں کو تفریح اور وقت گزاری کے مواقع میسر نہیں تھے، ایسے وقت میں لوگوں نے ان اجتماعی تقریبات میں جہاں روسا، امرا، اور صوفیا ہی نہیں سلاطین کے ساتھ عوام کو باہم شرکت کے مواقع فراہم ہوئے، ان اجتماعی تقریبات کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے آپسی میل جول سے تہذیب وثقافت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ملک گیر سطح پر مختلف خطوں میں وہ شعری محفلیں مختلف تہذیبوں کے فروغ کا باعث بنیں۔ زبان اردو جو ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی اپنی ادبی حیثیت منوانے کے لیے کوشاں تھی اردو شعرا نے اپنی کاوشوں سے اس کے حسن کو مزید جاذبیت عطا کی۔ شاعری جو کہ قلبی واردات اور جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ ہے اس نے عوام کو جوڑنے کا کام کیا۔ شعرا جو ان محفلوں کا حصہ رہے انہوں نے عوام کے مذاق اور تہذیبی روایات کو اپنی شعری کاوشوں میں قائم رکھنے کی پوری کوششیں کی کہیں داخلیت کا زور رہا تو کہیں خارجیت کی بھرمار اس کی مثال دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کے رنگ شاعری سے واضح ہے۔

مشاعروں میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل بن کر مقبول ہوئے یا یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مشاعروں نے شعرا کو مقبولیت کے بہترین مواقع فراہم کیے ان میں سے متعدد غزل اور نظم کے اشعار ایسے بھی ہیں جو شعرا کی مقبولیت کے ضامن بنے تو بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو شعرا کے نام سے نہیں بلکہ اپنی جاذبیت کے سبب مقبول ہوئے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اشعار شعرا کی مقبولیت کے ضامن ہیں۔ ان میں سے بعض غزلیں یا صرف چند اشعار اور بعض اشعار کا صرف ایک مصرع ہی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشاعروں کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر زمانے اور ہر دور میں مشاعروں نے منفرد اور مقبول تاریخ مرتب کی ہے، جس سے زبان کو ترقی کے مواقع میسر آئے، تہذیبی روایات کو استحکام اور افتخار حاصل ہوا۔ سیاسی سماجی بیداری کا کارنامہ انجام دیا گیا، اور ایک ایسی روایت قائم ہوئی جس نے ذہنی انبساط اور دائرہ فکر کو وسعت عطا کی۔ آج زبان اردو پر مختلف آرا قائم کی جا رہی ہیں تاہم مشاعروں کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

■

Gulshan Musarrat
347/161/16 ka, Old Tikait Ganj
Lucknow- 226017 (UP)
Mob.: 8004727071

'امالہ' سے بے نیازی
ایک بڑی غلطی

اسلم جاوداں

امالہ اردو زبان کا ایک بے حد خاص اور پیچیدہ قاعدہ ہے، جس سے اکثر اہل زبان بے نیاز ہیں۔ جس کے سبب ان کی تحریر میں بڑی خاموشی کے ساتھ غلطی در آتی ہے، جو اہل زبان کی شان کے منافی ہے۔

پہلے تو یہ جان لیا جائے کہ 'امالہ' ہے کیا؟ آسان زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ جملے کی ساخت کے اعتبار سے کچھ لفظوں کی کھڑی آواز کو پڑی آواز میں بدلنے کے عمل یا قاعدے کو 'امالہ' کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جملے کی ساخت کے اعتبار سے مخصوص الفاظ کے آخر میں آنے والے 'الف'، ہائے مختفی اور 'ہ' کو یائے مجہول یعنی بڑی 'ے' میں بدلنے کے عمل کو 'امالہ' کہتے ہیں۔ جیسے لڑکا سے لڑکے، سہرا سے سہرے، کتا سے کتے، مدینہ سے مدینے، نقشہ سے نقشے وغیرہ۔

مثال کے طور پر کہا جائے کہ 'اس لڑکا کو بلاؤ' تو یہ غلط ہوگا، لفظ 'لڑکا' میں امالہ مطلوب ہے۔ جملے کی ساخت کے اعتبار سے 'لڑکا' کے الف کو 'ے' سے بدلنا ہوگا:

یعنی 'اس لڑکے کو بلاؤ' کہنا ہوگا۔ واضح رہے کہ لڑکے یہاں پر جمع نہیں بلکہ امالہ یافتہ ہے۔

اسی طرح 'میخانہ میں شراب نہیں ہے' کی بجائے:

'میخانے میں شراب نہیں ہے' لکھا جائے گا۔

گویا جملے کی نوعیت کے اعتبار سے کسی خاص لفظ کے آخر آنے والے 'الف' یا 'ہ' کو بڑی 'ے' میں بدلنے کے عمل کو امالہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ امالے کا عمل اس سے بھی آگے ہے۔ مگر اصل اور عمومی قاعدہ یہی ہے، جس کی واقفیت لازمی ہے۔

دوران مطالعہ مجھے اندازہ ہوتا رہا ہے کہ اس اہم قاعدے سے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بھی بے نیاز یا ناواقف ہیں، ہما شما کی بات تو خیر جانے دیجیے، ان کے یہاں عام طور سے اس کا شعور بھی نہیں ہے۔

عالمی شہرت کے حامل شاعر پدم شری ڈاکٹر کلیم احمد عاجز بھی اس سے بے نیاز گزرے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ وہ محفل جمی ساقی نہ پھر وہ دور جام آیا
ترے ہاتھوں میں جب سے 'میکدہ' کا انتظام آیا

(کلیات کلیم عاجز: ص 176)

دوسرے مصرعے میں، 'میکدہ' کی جگہ 'میکدے' ہونا چاہیے۔ یہاں امالہ مطلوب ہے۔

کلیم عاجز صاحب کے حج کے سفرنامے کا نام ہے:

'یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ'

جب کہ اس کا نام 'یہاں سے کعبہ، کعبے سے مدینہ' ہونا چاہیے تھا۔ ان کا شعر بھی ملاحظہ ہو۔

سفر ہوتا ہے ختم، پھرتا ہے مینا یہاں سے کعبہ کعبہ سے مدینہ

شفیع جاوید بہار کے اردو افسانے کا ایک معتبر اور مستند نام ہے۔ لیکن ان کے یہاں بھی امالے کی غلطیاں ہیں۔ ان کے افسانوں کے ایک مجموعے کا نام ہے:

'دائرہ کے باہر' جب کہ اس کا نام ہونا چاہیے تھا:

'دائرے کے باہر'۔

کتاب کا نام ہی غلط ہونا بڑا ستم ہے۔

اختر اورینوی جیسے جید زبان داں سے بھی کہیں کہیں چوک ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حسن عسکری نے اپنے ایک گرانقدر 'مقالہ' میں مغلیہ عہد کے قبل کے ان اثرات کا ذکر کیا ہے۔''

(بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص 183)

حالانکہ مقالہ میں امالہ مطلوب ہے۔ 'مقالے' ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اس میں تعزیہ کی برائی... کا بیان ہے۔''

(بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص 321)

بالکل واضح ہے کہ 'تعزیے کی برائی' ہونا چاہیے۔

جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''لیکن اس کے برخلاف گولکنڈا میں ان کے معاصر۔'' (تاریخ ادب اردو جلد اول قدیم دور، ص 291)

قاعدے کے حساب سے گولکنڈے ہونا چاہیے۔

دوسری مثال ملاحظہ کریں:

''وہ ایک چڑیا کی طرح گاتا چلا جاتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو جلد اول قدیم دور، ص 333)

''وہ ایک چڑیے کی طرح گاتا چلا جاتا ہے۔''

گوپی چند نارنگ کے یہاں بھی یہ بے نیازی ہے۔ لکھتے ہیں:

''پوری ذمہ داری اور غور وخوض کے بعد کی ہوں گی۔''

''انھوں نے یہ ذمہ داری خاکسار کو سونپی۔''

('املا نامہ' ص 49-39)

'ذمہ داری' کی بجائے 'ذمے داری' ہونا چاہیے۔

'مصرع کی علامت' (املا نامہ ص: 102)

'مصرعے کی علامت' لکھا جانا چاہیے۔

ناوک حمزہ پوری نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ لکھنؤ کے ایک مدیر نے اپنے رسالے میں لکھا:

''اس شمارہ کے ساتھ رسالہ اپنی اشاعت کے ستائیسواں سال میں داخل ہوگیا۔''

جب کہ ہونا چاہیے تھا:

''اس شمارے کے ساتھ رسالہ اپنی اشاعت کے ستائیسویں سال میں داخل ہوگیا۔''

'دعوت' جیسے معتبر اور معیاری اخبار کے ہر شمارے کے پہلے صفحے پر آپ کو یہ تحریر ملے گی۔

''اس شمارہ میں مزید آپ کے لیے۔''

جب کہ ہونا چاہیے تھا:

جب کہ ہونا چاہیے:

''اس 'شمارے' میں مزید آپ کے لیے۔''

گویا املا سے بے نیازی اور لاعلمی آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔

اس کے باوجود امالے جیسے اہم موضوع پر قواعد کی کتابوں میں عموماً کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے اور اس اہم موضوع کو اب تک غیر اہم سمجھا جاتا رہا ہے۔ زبان اور قواعد کے بڑے نکتہ داں رشید حسن خاں بھی امالے کے موضوع پر تقریباً خاموش ہی رہے ہیں۔ امالے کی بجائے غیر واضح انداز میں 'محرف صورت' کہا ہے۔ لیکن اپنی اہم تصنیف 'تفہیم' کے ص 155 (ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل) پر 'امالہ' کے سلسلے میں انھوں نے کچھ باتیں تحریر کی ہیں، مگر وہ نگارش سے متعلق نہیں، بلکہ تلفظ سے متعلق ہیں۔ گویا سمجھا جا سکتا ہے کہ امالے جیسے اہم اصول و قاعدے سے اہل زبان میں بے اعتنائی رہی ہے اور بیشتر تو اس سے واقف بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ اس سے بے اعتنائی ہماری تحریر کو شرمسار کرتی ہے۔

میرے مطالعے کی حد تک دبستان بہار میں ناوک حمزہ پوری ہی ایک ایسے ماہر زباں ہیں، جنھوں نے امالے پر ایک مضمون لکھا اور اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے، ورنہ یہ میدان خالی نظر آتا ہے۔

امالہ : قواعد اور اصول

امالہ فہمی کے لیے ادب نگاروں کا اہل زبان ہونا لازمی شرط ہے۔ اگر وہ اہل زباں ہوں گے تو انھیں خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ اس لفظ میں امالہ مطلوب ہے یا نہیں؟ مثلاً کسی بچے کو بلانا ہوگا تو ایک اہل زبان یہ نہیں کہے گا کہ 'اس بچہ کو بلاؤ'، بلکہ وہ کہے گا 'اس بچے کو بلاؤ'۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ:

'میں پٹنہ جارہا ہوں' بلکہ کہے گا 'میں پٹنے جارہا ہوں'

وہ نہیں لکھے گا کہ 'میخانہ میں دور جام چل رہا ہے'

بلکہ لکھے گا کہ 'میخانے میں دور جام چل رہا ہے۔'

ایسا اس لیے ہوگا کہ وہ اہل زبان ہے، اس کی زبان سے ایسا خود بخود نکلے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس عمل میں اصول اور قواعد کے جاننے سے زیادہ زبان و بیان پر گرفت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اہل زبان جملہ سازی کے وقت الفاظ کے صحیح استعمال پر پوری توجہ دیں۔

امالے کے فن پر گرفت رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصولوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قاعدہ 1: جس اسم کے آخر میں الف ہو تو اس کو یائے مجہول یعنی بڑی 'ے' میں تبدیل کر دیا جائے۔

مثلاً: گھوڑا۔ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔

جوتا۔ اس کو جوتے مارو

باجا۔ باجے والے کو بلاؤ

ڈھیلا۔ اس نے ڈھیلے سے سر پر مارا

ڈراما۔ ڈرامے کی تاریخ روشن ہے۔

مٹکا۔ مٹکے سے دودھ ٹپک رہا ہے۔

سہرا۔ سہرے کی بہار خوب ہے۔

ڈنڈا۔ اسے ڈنڈے مار کر بھگاؤ۔

لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے، ایسا نہیں ہے کہ تمام اسما، جن کے بھی آخر میں 'الف' ہے اس کو یائے مجہول سے بدل کر امالے کے قاعدے کی پیروی کی جاسکتی ہے۔

مثلاً: راجا۔ راجا کو بلاؤ،

(لڑکے کو بلاؤ کی طرح راجے کو بلاؤ نہیں ہوگا)

ایسے عربی الفاظ جن کے آخر میں الف کے بعد ہمزہ ہو، (خواہ وہ ہمزہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے) امالہ قبول نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً:

دعاء، بقاء، فناء، جزاء وغیرہ

قاعدہ 2: جس اسم کے آخر میں ہائے مختفی یا گول 'ہ' ہو تو اس کو بھی یائے مجہول یعنی بڑی 'ے' میں بدلا جائے گا۔ مثلاً:

شیشہ۔ ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے

افسانہ۔ ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

میخانہ۔ اب تو اتنی بھی میسر نہیں میخانے میں
پیمانہ۔ جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں

قاعدہ 3: جن شہروں یا ریاستوں کے نام کے آخر میں 'الف' یا ہائے مختفی یا گول 'ہ' ہو ان میں اکثر کو یائے مجہول یعنی بڑی 'ے' سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً:

مدینہ۔ 'مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ'

مکہ۔ مکے کی روحانیت کا کیا کہنا۔

کلکتہ۔ 'کوئی چھینا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں'

آگرہ۔ 'میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو جاؤں۔' (یادوں کی برات: جوش ملیح آبادی ص 152)

بنگالہ۔ جناب کا تعلق بنگالے میں کس طرف ہے؟
(قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا ص 190)

پٹنہ۔ میں کل پٹنے جارہا ہوں۔

گولکنڈا۔ گولکنڈے میں ہمارے کئی رشتے دار ہیں۔

پونہ۔ وہ پونے میں رہتا ہے۔

کعبے کو شہر مکہ کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس لیے عام طور پر مکے کی جگہ کعبہ ہی استعمال ہوتا ہے۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب.. (غالب)
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (اقبال)

مگر یہ اصول آنکھ بند کر کے تمام شہروں پر نافذ نہیں ہوگا۔

مثلاً: قسطنطنیہ، بخارا، بلیا، رومانیہ وغیرہ۔ یہاں پر لسانی صوابدید کا سہارا لینا ہوگا۔

قاعدہ4: اکثر الفاظ جو اسم ہوں یا نہ ہوں اگر ان کے آخر میں ہائے مختفی یا گول 'ہ' ہو، تو ان کو بھی یائے مجہول یعنی بڑی 'ے' میں بدل دیا جائے گا۔

مثلاً: سانحہ سے سانحے، واسطہ سے واسطے وغیرہ

اسی طرح ہنگامہ، واقعہ، ذریعہ، نظریہ، مقابلہ، نشانہ، فائدہ، وعدہ، نشہ، حصہ، معاملہ، معانقہ، مشاعرہ، مطالعہ، سلسلہ، وغیرہ بے شمار الفاظ اسی ضمن کے ہیں۔

قاعدہ5: رشتے ظاہر کرنے والے کچھ الفاظ جن کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ہو امالہ قبول کرتے ہیں، مثلاً بیٹا، بھانجہ، بھتیجا، سالا، پوتا، نواسہ وغیرہ۔ لیکن ابا، چچا، پھوپھا، ماما، نانا، دادا، بھیا، آپا وغیرہ امالہ قبول نہیں کرتے ہیں۔ ان سب کا استعمال اہل زبان اپنی صوابدید سے کرتے ہیں۔

قاعدہ6: مرکب الفاظ سے بنے ہوئے اسما جن کے بیچ اضافت نہیں ہو اور ان کے آخر میں ہائے مختفی یا گول 'ہ' ہو وہ اکثر امالہ قبول کرتے ہیں۔

مثلاً: شراب خانہ۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق (اقبال)

اسی طرح: میکدہ سے میکدے، دولت خانہ سے دولت خانے وغیرہ۔

مگر یہ قاعدہ بھی ہر جگہ نافذ نہیں ہوگا۔ جہاں 'گول ہ' لفظ کے آخر میں الگ سے آئے، وہاں امالہ نہیں ہوگا۔ مثلاً چراگاہ سے چراگاہے نہیں ہوگا، نماز گاہ سے نماز گاہے نہیں ہوگا۔ ایسے الفاظ کے سلسلے میں بھی اپنی لسانی صوابدید کو روبہ عمل لانا ہوگا۔

عام طور سے یہ تصور ہے کہ الفاظ کے اواخر میں آنے والے الف، ہائے مختفی یا گول 'ہ' کو یائے مجہول میں بدل دینے کے عمل کو ہی امالہ کہتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ امالے کا عمل اس سے بھی آگے ہے

(ساتواں اور آٹھواں قاعدہ ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں بھی وہی قاعدہ ہے یعنی کھڑی آواز کو پڑی آواز میں بدل دینا۔ اس طور سے اسے بھی امالہ ہی کہا جاتا ہے)

قاعدہ 7 : ایسے اسما یا دوسرے الفاظ جن کے آخر میں 'اں' ہو، اس کو 'ئیں' سے بدل کر امالہ بناتے ہیں۔

مثلاً دھواں سے دھوئیں، کنواں سے کنوئیں، رواں سے روئیں، دایاں سے دائیں، بایاں سے بائیں وغیرہ۔

قاعدہ8: وہ صفات عددی جن کے آخر میں 'اں' ہو، ان کو 'یں' میں بدل کر امالے کی شکل دیتے ہیں۔

مثلاً: ساتواں سے ساتویں، بائیسواں سے بائیسویں، پچیسواں سے پچیسویں۔ پچاسواں سے پچاسویں وغیرہ۔

امالے کی ایک اور شکل ہے۔ کتاب سے کتیب بنایا جائے۔ حساب سے حسیب، حجاب سے حجیب، حجاز سے حجیز وغیرہ۔ مگر امالے کا یہ قاعدہ بالخصوص ہماری فارسی میں مستعمل ہے۔

مذکورہ تفصیل اور مثالوں سے امالے کے سلسلے میں بہت حد تک بنیادی باتیں آگئی ہیں، مگر ان قواعد اور اصولوں کو جاننے سے زیادہ لسانی شعور اور الفاظ کے استعمال پر مضبوط گرفت لازمی ہے اور اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ اہل زبان نے مختلف الفاظ کا استعمال کس طور سے کیا ہے۔

■

Dr.Aslam Jawedan
DarulGheyas,
Near Hotel Blue Diamond,
Jamungali,
Sabzi Bagh,Patna 800004, Bihar

امتیاز احمد

اردو زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ

اردو زبان کی تاریخ ایک طرح سے ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ ہے، اسی دور میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بھی توسیع ہوئی، اس دوران ہندوستانی معاشرہ عروج و زوال اور تغیر و تبدل کے جن مراحل سے گزرا اس کا اثر یہاں کی ہر زبان و ادب پر پڑا یعنی تاریخی اور سماجی صورت حال نے کسی بولی اور زبان کو فروغ دیا تو کسی بولی و زبان کی نشوونما کو روک دیا، چنانچہ دسویں صدی کے بعد سے کچھ ایسی تاریخی صورت حال پیدا ہوئی کہ ہند آریائی زبانوں کے گروہ میں اس نئی زبان نے جنم لیا جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کے آغاز کی کہانی اس قوم کی تہذیب وتمدن، معاشرت وثقافت، سیاست اور سماجیات کے ارتقا سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس کی نشوونما کسی خاص لمحے یا وقت میں نہیں ہوتی بلکہ یہ اپنی مستقل شکل اختیار کرنے سے پہلے مختلف مراحل سے گزرتی ہے جس کو رنگ روپ بخشنے اور نکھارنے میں مختلف عوامل اور عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اردو زبان کو بھی وجود میں آنے سے پہلے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ زبان کے اس ارتقائی سفر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی 'کتاب تاریخ ادب اردو، جلد اول' میں لکھتے ہیں:

''مختلف تہذیبی عوامل، رنگارنگ قدرتی عناصر، مسلسل میل جول اور رسوم معاشرت گھل مل کر رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر کسی زبان کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں۔ بولی صدیوں میں جا کر زبان بنتی، اپنی شکل بناتی اور اپنا خدوخال اجاگر کرتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو، ص 1)

مولانا سلیمان ندوی نے بھی زبان کے تشکیلی مراحل کو اپنی کتاب 'نقوش سلیمانی' میں اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔'' (نقوش سلیمانی، ص:100)۔

زبان کے ادبی معیار اور حیثیت کی تاریخ اس زبان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو کو بھی معاشرتی ضرورت اور سماجی اختلاط نے پیدا کیا جس میں دھیرے دھیرے تہذیبی خیالات اور ادبی تخلیقات کے لیے وسعت پیدا ہوتی گئی۔ انہی ضروریات ومقتضیات نے اردو کے وجود کو ممکن بنایا اور اس کے لیے ماحول سازگار بنایا اور اسے ایک ایسے معیار پر پہنچایا کہ اٹھارویں وانیسویں صدی میں متعدد ملکی وغیر ملکی علما نے ہندوستانی کے روپ میں اسے ملک کی عوامی زبان کا لقب دیا۔ اردو زبان کی تاریخ ایک طرح سے ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ ہے۔ اسی دور میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بھی توسیع ہوئی۔ اس دوران ہندوستانی معاشرہ عروج وزوال اور تغیر و تبدل کے جن مراحل سے گزرا اس کا اثر یہاں کی ہر زبان و ادب پر پڑا یعنی تاریخی اور سماجی صورت حال نے کسی بولی اور زبان کو فروغ دیا تو کسی بولی وزبان کی نشوونما کو روک دیا۔ چنانچہ دسویں صدی کے بعد سے کچھ ایسی تاریخی صورت حال پیدا ہوئی کہ ہند آریائی زبانوں کے گروہ میں اس نئی زبان نے جنم لیا جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔

اردو کا اصل مخرج ومنبع کون سی زبان ہے؟ اس کا خمیر کس علاقے کی مٹی سے تیار ہوا؟ اس کا رنگ و روپ کہاں تیار ہوا؟ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس نہ کوئی دستاویزی ثبوت ہے اور نہ ہی کوئی سائنٹفک حوالہ۔ اسی وجہ سے یہ مسئلہ ماہرین لسانیات کے نزدیک کافی پیچیدہ رہا ہے۔ لہٰذا اردو زبان کے دوسری قدیم زبانوں کے ساتھ تقابلی مطالعہ، قواعد، لفظیات، تراکیب اور اس کے لب و لہجے کے تجزیے کی روشنی میں ماہرین لسانیات اور ادبا نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔

سید سلیمان ندوی اپنی کتاب 'نقوش سلیمانی' میں اردو کو سندھ کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق مسلمان سب سے پہلے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک بڑی تعداد میں سندھ میں داخل ہوئے اور اس کو فتح کر کے اسلامی حکومت کے ایک ریاست بنایا۔ مسلمان تقریباً تین سو سال تک سندھ میں قیام پذیر رہے۔ ان کے اور مقامی باشندوں کے اختلاط اور میل جول سے ایک نئی زبان کا وجود ہوا۔ سید سلیمان ندوی اپنی کتاب میں زبان کی پیدائش کے مختلف اسباب ووجوہات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو 762ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔'' (نقوش سلیمانی، ص 252)

سید سلیمان ندوی اپنے نظریے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ گرچہ اس لحاظ سے درست ہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب وتمدن اور معاشرت پر اپنے اثرات مرتب کیے اور وہاں کی سندھی زبان پر بھی اثر انداز ہوئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عربی اور سندھی کے اختلاط سے اردو وجود میں آئی البتہ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں نے اردو کی ترویج وترقی، حلقہ اثر کی وسعت اور اس کو علمی وادبی رنگ وروپ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے جیسا کہ ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی اپنی کتاب 'ہند آریائی اور ہندی' میں لکھتے ہیں:

''اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز وارتقا میں دو ایک صدی کی تاخیر ضرور ہوتی۔'' (ہند آریائی اور ہندی، ص 971)۔

مسلمان جس حیثیت سے بھی ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں انھوں نے اسے اپنا وطن سمجھا اور یہیں کی مٹی میں گھل مل گئے البتہ مسلمان تعداد میں بہت تھوڑے تھے اس لیے وہ اپنی زبان مقامی لوگوں پر نافذ نہ کر سکے لہٰذا انھوں نے یہاں کی کسی مقامی بولی کو اپنایا اور اسے اپنے خیالات واحساسات کا ذریعہ اظہار بنایا اور اس میں عربی وفارسی الفاظ داخل کیے۔ اس طرح مقامی اثرات اور مسلمانوں کے لسانی وتہذیبی اختلاط وامتزاج سے اس بولی نے ایک نیا رنگ وآہنگ اختیار کر لیا جس نے رفتہ رفتہ مختلف ناموں مثلاً ہندوی، ہندوستانی، گجری، دکنی اور ریختہ کے ناموں سے مقبول عام ہوتی ہوئی اردو کا روپ دھار لی۔

اردو کی جائے پیدائش کا دکنی حوالہ دیتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں دکن کو اردو کا اصل منبع ومخرج قرار دیتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی استدلال میں کہتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ کے علاوہ سواحل مالابار اور کارومنڈل پر بھی نمودار ہوئے تھے جن کا مقصد سیر وتفریح کے علاوہ کاروبار اور تجارت کو فروغ دینا بھی تھا جس کے حصول کے لیے سماجی روابط ضروری تھے لہٰذا سماجی روابط اور اختلاط بڑھتے گئے۔ اس سماجی اختلاط اور میل جول نے ایک نئی زبان کے وجود کو ممکن بنایا جو موجودہ اردو کی قدیم شکل تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''برج بھاشا میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ مل ملا کر ایک نئی زبان مروج ہوگئی جو شاہ جہاں کے زمانے میں اردوئے معلی کے مبارک نام سے نامزد ہوئی اور تیمور کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج تک دکھنی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔'' (دکن میں اردو، ص:5)

نصیر الدین ہاشمی نے اپنے نظریے کی تائید میں مسلمانوں کی آمد کے علاوہ دوسرے منطقی اور مستند شواہد پیش نہیں کیے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نظریہ محض قیاس آرائی پر مبنی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دکنی بذات خود ایک زبان ہے جس میں نثری وشعری جواہر پارے موجود ہیں لہٰذا اردو کو دکنی کی قدیم شکل قرار دینا درست نہیں۔

ماہر لسانیات محمد حسین آزاد نے برج بھاشا کو اردو زبان کی بنیاد اور سرچشمہ قرار دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب 'آب حیات' میں لکھتے ہیں: ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے''۔ (آب حیات، ص:16) محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی زبان فارسی اور ترکی تھی اور ہندوؤں کی زبان برج بھاشا اس لیے ان دو زبانوں کے آپسی میل جول اور اختلاط سے اردو زبان پیدا ہوئی۔ حسین آزاد اپنے نظریے کی وجہ سے بہت مشہور بھی ہوئے اور ایک زمانے تک ارباب اردو اور علمائے نقد وتنقید نے اسی کو حرف آخر تصور کیا۔ برج بھاشا دلی کے قرب وجوار میں بولی جانے والی زبانوں میں خاص اہمیت کی حامل تھی۔ یہ آگرہ کی زبان تھی جو کہ مسلمانوں کا پایہ تخت بھی رہا۔ اس کے علاوہ اردو کے قدیم شعری نمونوں خاص کر امیر خسرو کے کلام پر اس کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر محمد حسین آزاد نے یہ قیاس کر لیا کہ اردو کی بنیاد برج بھاشا ہے حالانکہ جب ہم برج بھاشا اور اردو کے بنیادی ڈھانچوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا برج بھاشا سے ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے مثلاً اردو کے تمام اسما، افعال، صفات اور ضمائر الف پر ختم ہوتے ہیں جبکہ برج بھاشا میں 'او' پر ختم ہوتے ہیں۔ برج بھاشا کا تعلق مغربی ہندی کی ان بولیوں سے ہے جو اوبولیاں کہلاتی ہیں جبکہ اردو کا رشتہ الف والی بولیوں مثلاً ہریانی اور کھڑی بولی سے ہے۔

محمد حسین آزاد کے نظریے کو سب سے پہلے محمود شیرانی نے یہ کہتے ہوئے رد کیا کہ اردو اور برج بھاشا کا تعلق ماں بیٹی کا نہیں بلکہ ان کا رشتہ بہن بہن کا ہے۔ محمود شیرانی اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں رقمطراز ہیں:

''ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف ونحو، دوسرے خد وخال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسما وافعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واو پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔'' (پنجاب میں اردو، ص: الف)۔

محمود شیرانی محمد حسین آزاد کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو کی اصل جائے پیدائش پنجاب ہے اور یہ پنجاب سے ہی دہلی میں وارد ہوئی وہ لکھتے ہیں:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔'' (پنجاب میں اردو، ص: ب)

محمود شیرانی اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے کچھ تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان لسانی خصوصیات کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں جو پنجابی اور قدیم اردو کے درمیان مشترک تھیں۔ وہ دونوں زبانوں کی تذکیر وتانیث، واحد وجمع، اسما وافعال اور قواعد پر تقابلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی تذکیر وتانیث اور جمع اور افعال کے تصرف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔'' (پنجاب میں اردو، ص:17)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شیرانی کا نظریہ کسی روایتی قیاس یا محض خیالی مفروضے پر منحصر نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنا نظریہ تاریخی شواہد ودلائل کے پس منظر میں لسانی تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے، جس کی تائید لندن یونیورسٹی میں لسانیات پر تحقیق کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب ہندوستانی فونٹکس میں کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو کا سنگ بنیاد اصل میں مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی جب تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنالیا۔ ان کے علاوہ انگریزی کے مستند عالم ٹی گراہم بیلی، جارج گریرسن نے بھی شیرانی کے نظریے کی تائید کی ہے جبکہ شیر علی سرخوش پہلے ہی اپنے تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔

محمود شیرانی کا یہ نظریہ بنیادی طور پر دو وجوہات کے تحت سے معرض وجود میں آیا۔ ایک یہ کہ اردو نے عربی وفارسی سرمایے سے اخذ واستفادہ کیا ہے۔ ہندوستان کی دیگر بولیوں اور زبانوں کے مقابلے اردو میں عربی وفارسی کے الفاظ کثیر تعداد میں ہیں۔ ان الفاظ کی فراوانی کو دیکھ کر شیرانی صاحب نے یہ خیال کر لیا کہ اردو اسلامی دور میں اسلامی اثرات سے وجود میں آئی اور اس کی ابتدا کا تعلق ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے اقتدار و قیام سے جوڑ دیا۔ یہ وجہ اپنے آپ میں غیر مدلل ہے کیونکہ ہر زبان اپنے دور کی دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ کرتی ہے، الفاظ وکلمات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے اور اس کے قواعد وڈکشن کو فراخ دلی سے قبول کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کا وجود ان زبانوں کے اثرات کی وجہ سے ہوا ہو۔ دوسری وجہ یہ کہ مسلمانوں کا وہ سرپرستانہ اور مربیانہ سلوک وبرتاؤ ہے جس نے اس زبان کو سینے سے لگایا اور نوک پلک سنوار کر اس قابل بنایا کہ اس کے ذریعے شعری ونثری خیالات کا اظہار ہو سکے، اس میں علمی وفنی کتابیں لکھی جا سکیں۔ یہ وجہ بھی غیر عقلی اور منطقی ہے کیونکہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار، سرپرستی اور دہلی میں آمد سے پہلے بھی وہاں ایک زبان موجود تھی اور

بازار میں بولی جاتی تھی۔

مسعود حسین خان اس دور کی مختلف بولیوں کے تقابلی اور لسانی مطالعے کے تناظر میں شیرانی کے نظریے کو غیر مستند قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شیرانی نے قدیم اور دکنی اردو کی جن خصوصیات کی نسبت پنجابی کی طرف کی ہے وہ دراصل دہلی اور اس کے اردگرد کی بولیوں میں موجود تھیں چنانچہ قدیم اردو کا پنجابی پن اس کا ہریانی پن بھی ہے لہٰذا قدیم اردو کے اس ہریانی پن کو نظر انداز کر کے صرف اس کے پنجابی پن پر زور دینا درست نہیں۔

مسعود حسین خان شیرانی کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے اردو کی اصل اور سرچشمہ کو دہلی اور اس کے قرب و جوار کی بولیوں میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق نواح دہلی کی چار بولیوں (ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی) نے اردو کے نوک پلک، لب ولہجہ اور ہیئت وساخت کی تراش خراش میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہریانی اور کھڑی بولیوں نے اردو کی تشکیل اور تعمیر میں اہم کردار ادا کیا جبکہ برج اور میواتی بولیوں نے اس کے معیاری لب ولہجہ اور ہیئت وساخت کو سنوارا۔ لہٰذا قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی سے ہوئی جبکہ جدید اردو کھڑی بولی پر مبنی ہے۔ مسعود حسین خان ان بولیوں اور ان کے قدیم تحریری مواد کے تجزیے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوئی ہے اور جب سولہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہوتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص: 236)۔

مسعود حسین خان اپنی کتاب میں دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے دوسری بولیوں کے ساتھ منطقی اور لسانی تجزیے کے بعد قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''زبان دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع و سرچشمہ ہے اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص: 262)

لفظ پیرامنش سے مراد دہلی اور اس کے نواح کی چار بولیاں ہیں جن میں ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی شامل ہیں۔ کھڑی بولی کی دو شکلیں ہیں ایک وہ جو دوآبہ گنگ وجمن کے بالائی علاقے یعنی سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ میں بولی جاتی ہے جبکہ دوسری شکل گنگا پار کے بجنور، رام پور اور مرادآباد کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔

مسعود حسین خان نے انھی علاقوں میں بولی جانے والی کھڑی بولی کو اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے نظریے کے استدلال میں کھڑی بولی، ہریانی اور دکنی کی صوتی اور صرفی کئی مماثلتیں اور مثالیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

ہریانی اور قدیم دکنی دونوں میں جھ، بھ، چھ، دھ وغیرہ کا تلفظ سہل اور سادہ ہوتا ہے جیسے بھی (بی)، مجھ (مج)۔

ہریانی اور دکنی میں جمع بنانے کا طریقہ مشترک ہے جیسے غریباں، جھوٹاں، اونٹاں۔

دکنی کے ضمائر ہریانی سے زیادہ قریب ہیں جیسے متکلم جمع ہم اور ہمیں حاضر جمع تم اور تمھیں ہریانی، جبکہ تم دکنی۔

دکنی اردو کی طرح کھڑی بولی میں بھی درمیانی 'ہ' گرا دی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی ہیئت کھو دیتی ہے جیسے وہ (وو)، کہاں (کاں)، کبھی (کبی)۔

معیاری اردو کے برعکس کھڑی بولی ڑ اور ڑھ کی جگہ ڈ اور ڈھ کو ترجیح دیتی ہے جیسے بوڑھا (بڈھا)، گڑھا (گڈھا)، پڑھ (پڈھ)، چڑھ (چڈھ)۔

مسعود حسین خان دہلی اور نواح دہلی کی زبانوں کے صوتی وصرفی تقابل کے وقت دکنی کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن اپنے نظریے کو صرف نواح دہلی تک محدود رکھتے ہیں جس سے ایک طرح کا ذہنی تضاد جھلکتا ہے۔ اسی طرح اردو کی ارتقائی شکل کے حوالے سے مسعود حسین نے جتنے بھی صوفیائے کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کے توسط سے انھوں نے شعوری طور پر صرف اور صرف شیرانی کے نظریے کی تردید کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اور نصب العین صرف شیرانی کے نظریے کی تردید تھی جس وجہ سے انھوں نے دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے علاوہ کسی اور بولی پر توجہ نہیں دی۔ اس کا واضح ثبوت خود مسعود حسین خان کے درج ذیل الفاظ سے مل جاتا ہے:

''زبانِ دہلی پورب اور دکن کے علاوہ پنجاب میں بھی اپنا گھر کر رہی تھی جس کا بیّن ثبوت گرونانک، نامدیو اور کبیر جیسے سنتوں کا کلام ہے، یعنی ایک طرف فارسی عربی کے عام مروجہ الفاظ کی آمیزش اور دوسری جانب ان لسانی اثرات کو قبول کرنا جو دہلی کے سرچشمے سے پھوٹ کر ہندوستان کے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص: 68)

اردو کی ابتدا کو دہلی اور نواح دہلی میں تلاش کرنے والے نظریہ سازوں میں شوکت سبزواری بھی ہیں۔ انھوں نے اردو کے متعلق موجودہ تمام نظریات پر مدلل اور سیر حاصل گفتگو کے بعد یہ نظریہ دیا کہ اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اردگرد گیارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'داستانِ زبانِ اردو' میں رقمطراز ہیں:

''ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں، اردو اس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب وشعر کی زبان کا درجہ پایا۔'' (داستان زبان اردو، ص: 39)۔

شوکت سبزواری براہ راست مسعود حسین کے نظریے کی تنقید تو نہیں کرتے لیکن مغربی ہندی کی بولیوں کو ذہنی تجرید اور منطقی اپج قرار دے کر مسترد کرتے ہیں اور اپ بھرنش کو اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں جو دہلی اور میرٹھ میں گیارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے، اس لیے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اپ بھرنش سے ارتقا پا کر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے۔''

(داستان زبان اردو، ص: 79)

ڈاکٹر سہیل بخاری اور پروفیسر گیان چند جین شوکت سبزواری کے نظریے سے متفق نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری 'نقوش' کے شمارہ 102 میں اردو و ہندی پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد کھڑی بولی کو اردو کا اصل ماخذ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ روپوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل لفظ۔۔۔ اس نقطہ نظر سے ہندی اور اردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ، اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے جیسا ہندی زبان کا۔'' (نقوش، شمارہ: 102، ص: 48)۔

پروفیسر گیان چند جین بھی شوکت سبزواری کے نظریے سے متفق نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'حقائق' میں لکھتے ہیں:

''اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ اولاً کھڑی بولی کا آغاز، دوسری کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول جس کا نام اردو ہو جاتا ہے۔'' (حقائق، ص: 063)

پروفیسر صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''میں شوکت سبزواری اور سہیل بخاری سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ لسانیاتی نقطہ نظر سے اردو ہندی اور کھڑی بولی ایک ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کی قدر زیادہ اور تت سم سنسکرت

الفاظ تقریباً نصیں کے برابر ہوتے ہیں لیکن اس خصوصیت کے باعث اردو کھڑی بولی سے علیحدہ زبان نہیں ہو جاتی۔'' (حقائق،ص:853)۔

شوکت سبزواری نے اردو اور کھڑی بولی کے متعلق جو دلائل اور وضاحتیں دی ہیں ان میں کچھ مستند اور منطقی تو ہیں لیکن اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی اور ہندوستانی وغیرہ سے متعلق ان کی بہت سی توضیحات اور مباحث کافی گنجلک، مبہم اور متضاد ہیں۔ کبھی وہ اردو کے ارتقا کو براہ راست کھڑی بولی اور ہندوستانی سے جوڑنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی بول چال کی اپ بھرنش اور قدیم مغربی ہندی کی بولیوں میں اردو کی اصل تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ سہیل بخاری کی تائید پرانی ہے جسے انھوں نے بعد میں باطل قرار دے کر مسترد کیا ہے اور ایک دوسرا نیا نظریہ پیش کیا ہے جس کا تعلق اڑیا سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو سنسکرت سے الگ تھلگ اور آزاد ٹھیٹھ ہندوستانی یا دراوڑی بولی ہے جو جنم جنم سے اس دیس میں بولی جا رہی ہے۔ اب رہی بات کہ آج کل کی سب ہندوستانی بولیاں پراکرتوں سے نکلی ہیں سو یہ ناموں کا پھیر ہے جنھیں کل پراکرت کہتے تھے وہی آج بھاشائیں کہلاتی ہیں۔'' (اردو کا روپ،ص:35)۔

مذکورہ بالا نظریات کے دلائل و شواہد کا جب ہم بچشم غور مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی منطقی و عقلی توضیح کرتے ہیں تو ہمیں دو بنیادی باتیں نظر آتی ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کی آمد سے یہاں ایک نئی زبان کا وجود ہوا۔ سید سلیمان ندوی سے لے کر شوکت سبزواری تک ہر ایک کے استدلال میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔ دوسری یہ کہ اس زبان نے مختلف عہد میں یہاں کی دیگر بولیوں سے اخذ و استفادہ کیا اور ان کے اثرات بھی لیے۔ یہ بات بھی ہمیں ان مذکورہ بالا شخصیات اور ماہر لسانیات کے یہاں پوری شد و مد اور حوالے کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ احتشام حسین اپنی کتاب 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' میں اردو زبان کے ماخذ کے حوالے سے جیولز بلاک، محی الدین قادری زور اور سنیتی کمار چٹرجی کے خیالات پر سیر حاصل بحث کے بعد لکھتے ہیں:

'' جس نئی زبان کا ڈھانچہ عربی فارسی الفاظ اور آوازوں کے اختلاط سے بن رہا تھا اس میں پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی ہر ایک کو شریک سمجھنا چاہیے۔ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی، دوسری کھڑی بولی، اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی۔'' (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص:65)

سید احتشام حسین اپنی دوسری کتاب 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں سید سلیمان ندوی، سہیل بخاری اور شوکت سبزواری کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی ایک بھاشا یا بولی نے اردو زبان کے لب و لہجہ، ہیئت و ساخت اور قواعد و لفظیات کو جنم نہیں دیا بلکہ مختلف بولیوں نے اس کو سنوارنے، نکھارنے اور ادبی شکل عطا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دلی کے چاروں طرف بولی جانے والی کئی بولیوں میں فارسی، عربی کے لفظوں سے ملنے اور مغربی ہندی کی اس بولی میں جسے کھڑی بولی کہا جاتا ہے، نکھری ہوئی شکل اختیار کرنے سے ایک نئی زبان کا ارتقا ہوا۔ ابتدا میں اس پر پنجابی کا اثر زیادہ رہا لیکن دھیرے دھیرے کھڑی بولی ہی اردو کی شکل میں واضح ہوتی گئی۔ تاریخی اسباب سے اپنی ضروریات کے مطابق اس نے فارسی، عربی اور سنسکرت کے ذخیرہ لغات سے بھی کام لیا۔ اس کی موجودہ بنیاد کھڑی بولی ہے مگر ایک زندہ زبان ہونے کے باعث ان سبھی زبانوں کے الفاظ آ گئے ہیں جن سے اس کا ربط ضبط ہے۔'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ،ص 81-71)۔

زبان کی اس فطرت اور نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد حسن آزاد نے بھی اپنی کتاب 'قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں ایک متوازن نظریے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''کسی ایک مذہب کی کوئی ایک زبان نہیں ہوتی۔ مسلمان کے لفظ سے صرف مذہب کی پہچان ہوتی ہے، زبان اور تہذیب کی بناوٹ میں مذہب کے علاوہ دوسرے کئی عناصر شامل ہوتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اردو زبان و ادب کے سلسلے میں مسلمان کے بجائے ترک، ایرانی اور افغان اثرات کا ذکر کیا جائے جو مذہبی نہیں تہذیبی اکائیاں تھیں جن کا ملاپ ہندوستان میں رہنے والی مختلف تہذیبی اکائیوں سے ہوا۔'' (قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ،ص:9)

درج بالا تمام نظریات کے جائزہ اور منطقی توضیح و تفہیم کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی ایک نظریے کو دوسرے پر ترجیح دینا یا دوسرے سے مستند قرار دینا درست نہیں۔ ہمارے پاس ایسے دستاویزی ثبوت اور دلائل نہیں جن کی بنیاد پر کسی نظریے کو ہر طرح کے شک و شبے اور خیالی مفروضے سے مبرا بتایا جا سکے۔ کسی ایک نظریہ کو مستند نہ ٹھہرانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بھی زبان کسی مخصوص لمحے کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ وہ مختلف علاقوں کی بولیوں کی لفظیات، صوتیات، صرفیات اور مارفیمات سے اخذ و استفادہ کرتی ہے اور ان کے اثرات کو بخوشی قبول کرتی ہے۔ اردو زبان بھی ان مراحل و کیفیات سے دوچار ہوئی اور ہندوستان کی مختلف بولیوں مثلاً گجری، دکنی، پنجابی، ہریانی، میواتی، برج اور کھڑی سے مستفید ہوتی ہوئی اردو کی ایک مستقل و معیاری شکل و صورت بنی ہے۔ نیز کسی ایک نظریہ ساز کو دوسرے پر فوقیت اس لیے بھی نہیں دی جا سکتی کہ ہر زمانے اور عہد کے وسائل و ذرائع کی نوعیت اور رسائی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس لیے قوی امکان یہ بھی ہے کہ محمد حسین آزاد کے زمانے میں جتنے مواد اور ذرائع تک رسائی ممکن رہی ہو انھوں نے ان سبھی تک پہنچنے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مسعود حسین کے زمانے میں اس سے زیادہ مواد اور دستاویزات کی فراہمی و حصولیابی سہل تھی تو انھوں نے ان کی روشنی میں اپنا نظریہ پیش کیا۔

حوالہ جات

1 ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993
2 مولانا سید سلیمان ندوی۔ نقوش سلیمانی، مطبوعہ معارف پریس، علی گڑھ، 1980
3 ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی۔ ہند آریائی اور ہندی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1983
4 نصیر الدین ہاشمی: دکن میں اردو، انظام دکن پریس، حیدرآباد، 1924
5 محمد حسین آزاد: آب حیات (ڈیلکس ایڈیشن)، ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 2014
6 حافظ محمود شیرانی: پنجاب میں اردو، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1982
7 پروفیسر مسعود حسین خان: مقدمہ تاریخ زبان اردو (جدید ایڈیشن)، ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ 1954
8 ڈاکٹر شوکت سبزواری: داستان زبان اردو، چمن بکڈپو، اردو بازار دہلی، 1961
9 ڈاکٹر سہیل بخاری، 'اردو کا قدیم ترین ادب' مشمولہ نقوش، شمارہ 102،ص:84، مئی 1965.
10 ڈاکٹر سہیل بخاری: اردو کا روپ، پبلشر بشیر احمد چودھری، 1971
11 پروفیسر گیان چند جین۔ حقائق، نیشنل آرٹ پریس، الہ آباد، 1978
12 جان بیمز۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، مترجم، سید احتشام حسین، دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، 1971
13 محمد حسن۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (اٹھارویں صدی تک)، دوسرا ایڈیشن، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2005

Imtiyaz Ahmad
Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025

عشرت ظہیر

بدنام نظر کی نظموں میں زندگی کی خوشبو

فرانس میں انیسویں صدی کے وسط میں Victor- Hugo کی رومانٹک شاعری اور بورژوا (Bourgeois) سماج کی مادیت پرستی کے خلاف احتجاج کو کچھ نوجوان شعرا نے ناقابل اعتنا سمجھا، پھر بھی وہ لوگ خاطر خواہ انقلاب نہ لا سکے۔ اس تحریک نے پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنے خد و خال کو اختیار کیا۔ نتیجے کے طور پر انتہائی ذاتی احساسات اور تلازمات علامتی پیرائے میں ڈھل گئے یعنی اس معاشرے کے فرد پر جو ضرب لگائی گئی تھی اور اس کی شکست وریخت کا جو سامان پیدا کر دیا گیا تھا، اس کا ردعمل ہوا— اردو میں اس بدلتی ہوئی روش کی طرف حالی نے توجہ مبذول کرائی تھی اور اقبال نے پہلی بار اپنی نظموں کے ذریعے اس صنف میں خاطر خواہ تبدیلیاں کیں۔

اقبال کے اجتہاد کے بعد عملی طور پر نظموں کو جدید سانچے میں ڈھالنے والوں میں میراجی اور ن م راشد اولین توجہ کے مستحق ہیں اور اس سلسلے میں پیش رو ہونے کے ناتے ان کی شاعری اپنے بعد والوں سے کہیں زیادہ ابہام میں پناہ گزیں ہے۔ میراجی اور ن م راشد کے بعد جدید اردو نظم نگاروں کا ایک لمبا اور قابل قدر قافلہ ہے۔ اس قافلے میں ایک اہم اور لائق توجہ نام بدنام نظر ہے۔

بدنام نظر نظم و غزل دونوں کو اپنی شاعری کا وسیلہ بناتے ہیں۔ تاہم ان کا غالب رجحان نظم کی جانب ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'تہی دست' نظموں کے انتخاب پر مشتمل تھا۔ دوسرے مجموعہ کلام 'نزول' میں غزلیں تھیں، لیکن تیسرے مجموعہ کلام 'بارگراں' میں 59 نظمیں ہیں جو 105 صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کے برعکس 45 غزلوں کے لیے کل 50 صفحات مختص ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بدنام نظر کا رجحان و میلان ترجیحی طور پر نظم کی جانب ہے۔ لہٰذا میں اپنے اس مضمون کا دائرۂ مطالعہ نظم پر ہی مرتکز کرتا ہوں۔ یوں بھی نظم اپنی تہہ داری اور پر پیچ کیفیت کے باعث جزئیات کے مطالعے کی متقاضی ہوتی ہے۔

بدنام نظر کی شاعری ایک ایسی زندگی کی نقیب ہے، جہاں زندگی کے حزن اور تفکر ذات کے اظہار کے باوجود زندگی کی رنگ آمیزی، ہلچل اور روشنی مدھم نہیں ہوتی، اور یہ احساس اس لیے بھی مستحکم ہے کہ ان کا گہرا تعلق گاؤں اور تہذیب گم گشتہ سے ہے۔ ان کی نظموں میں سنہری تہذیب ماضی کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ان کی یہ وابستگی ان کی کائنات نظم میں روپ بدل بدل کر وارد ہوئی ہے۔ یہ کبھی ماضی کی راہوں کی سیر کراتی ہے، کبھی عظمت رفتہ کی گم شدگی کا احساس دلاتی ہے، کبھی پیڑ پودے، برگد، سمندر اور گاؤں کے استعاراتی اور علامتی نظام کے توسط سے زندگی کی بہترین قدروں اور وراثت دیرینہ کے کھو جانے کے تاسف آمیز جذبے سے ہمکنار کرتی ہے۔ ان کی نظم 'لیب ٹسٹ' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، یہاں حزن بھی ہے، اور امید کی روشنی بھی جگمگا رہی ہے۔

پیکر، روح، انساں، منظر، موسم، دنیا، ذہن و مذہب اور فرقہ
سب خالق کی تخلیق
الگ لگ اجزا کی لیکن الگ الگ تاثیر
ایک طرف ہابیل
ایک طرف قابیل

زندگی کے روشن احساس اور رنگ آمیزی کے باوجود، عہد حاضر کا درد اور کشمکش حیات انسان کو متفکر اور بے چین بھی کرتا ہے اور وسوسوں میں بھی مبتلا کرتا ہے، کیونکہ مثبت اور منفی قوتوں کا تصادم ہر آن جاری ہے، یہ رکتا نہیں۔ تاہم تمام تر سوالوں اور اندیشوں کے باوجود ہابیل کی زندگی امید کی صورت اجاگر ہے۔

مسجدوں کے منارے زمیں میں دھنسے جا رہے ہیں
سرخ کالا لہو بہہ رہا ہے
لاشیں گلیوں میں سڑنے لگی ہیں
پھر بھی ہابیل وقابیل دونوں میں کوئی بھی مرتا نہیں ہے
دونوں میں کوئی بھی تھکتا نہیں ہے؟

(اقتباس: نظم لہو، آ تنا، اشارے)

بدنام نظر کی نظمیں احساسات کی مختلف النوع تہوں سے مزین ہیں، ان میں مظاہر کائنات اور حیات انسانی کی تصویریں متحرک بھی ہیں اور مجسم بھی۔ بدنام نظر خوبصورت اور دلکش منظرنامے کی تخلیق و تشکیل میں ماضی کی گزرگاہوں میں صدیوں کا سفر طے کرتے ہیں۔ اپنے اس سفر میں وہ نوحؑ کے ضبط محبت، حضرت محمد ﷺ کی زم

مزاجی اور انسانیت نوازی، حضرت حسینؓ کی ایثار و قربانی، گوتم بدھ کی تپسیا، شری رام کی آگیا کاری اور شری کرشن کی مرلی سے ابھرنے والے پریم سندیش کے پس منظر میں انسان کی زریں اور بہترین وراثت گم گشتہ اور اثاثۂ حیات کے زیاں کے احساس کی سناگی کو نظم 'یہاں وہ نہیں ہے' میں مجسم کرتے ہیں۔

یہاں وہ نہیں ہے
ہاں یہ چہرہ اسی کا ہے
گھر بھی وہی، راستہ بھی وہی ہے
مگر یہ تو میں ہوں!
کہ تو قیر کے سیکڑوں ہار پہنے
اس کی مسند پہ جلوہ فگن ہوں
ذرا شامہ کی تسلی بھی کر لو
تو دیکھو گے مٹی میں وہ سوندھی خوشبو نہیں ہے
(اقتباس: نظم یہاں وہ نہیں ہے)

یوں تو بدنام نظر کی نظمیں روح عصر کے سب رنگوں سے مزین ہیں۔ لیکن عہد حاضر کے تفکرات اور رعنائیاں، انسان کی محبت اور درد ان کی نظموں میں ماضی میں ملفوف دکھتی ہیں۔ یعنی وہ کسی موضوع اور کسی درد کے احساس کو موثر طور پر پیش کرتے ہوئے بطور پیراڈوکس در ماضی کو بصورت 'کھل جا سم سم' وا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ماضی بہ صورت نوحہ منعکس نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ بہترین قدروں اور عظمت رفتہ کے آئینے میں عہد حاضر کو عکس ریز کرنے کی قابل تحسین سعی ہے۔ 'ایک نظم' جسے انھوں نے اپنے ماموں جان کے نام معنون کیا ہے، کا استعاراتی نظام ماضی بعید کے نگار خانے کی سیر کراتا ہے۔

طبل جنگ کی تھاپوں پہ بھی رقصاں تھی تو
تیز تلواروں کی جھنکار پہ گایا تو نے
بن گئی میر تو جی بھر کے رُلایا تو نے
بنی اکبر تو زمانے کو ہنسایا تو نے

اس ضمن میں ایک خوبصورت نظم 'دعا' کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ نظم کا پہلا مصرع علامہ اقبال کی نظم 'بچے کی دعا' سے مستعار لیا گیا ہے۔ مستعار لیا گیا مصرع دراصل ایک دور گم گشتہ میں جینے کی صورت ہے۔

''زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری''
مانگتا تھا یہ دعا
شام و سحر بچپن میں
جانے کیا روز تھا، کیا وقت تھا، کیا لمحہ تھا؟
در تاثیر کھلا تھا
کہ خدا عرش بریں سے

چلا آیا تھا زمیں پر
نور اک چمکا کچھ ایسا کہ مرے سینے میں
آگ سی ایک لگی
اور بڑھتی ہی رہی رگ رگ میں

ایک مختصر نظم 'آخری دن سے پہلے' اپنے اسٹرکچر، اپنی بنت اور کشید کردہ ماحول کے اعتبار سے وقت موجود کی حدوں اور بندشوں سے پرے تاریخ کی دور دراز فضاؤں میں لے جاتی ہے۔

زرد شاخوں پہ بیٹھی ہوئی فاختائیں
اپنی چونچوں میں زیتون کی پتیوں کو دبائے
سمندر کی تہہ اور حدیں ناپتی ہیں
کہیں کوئی کشتی نہیں ہے

بدنام نظر کی اکثر نظمیں گم گشتہ قدروں کی یاد میں تاسف کی صورت ابھرتی ہیں اور نئی تہذیب اور ترقی عہد حاضر کو گویا ترقیِ معکوس کی شکل میں اجاگر کرتی ہیں، اور ذہن کو پریشان سوالوں میں محصور کیے دیتی ہیں۔

جگے رہو
اپنی آنکھیں حیران منظروں کے شکم میں گاڑے
تمام قدریں بدل چکی ہیں
مشینیں انسان بن چکی ہیں
گھروں میں تصویریں جھولتی ہیں
بطوطہ اور فاہیان کے نسخے کھو گئے ہیں
کہیں کوئی کاشف الحقائق؟
نہیں
یہاں کچھ نہیں ملے گا
سرنگیں کھودیں مگر سرنگوں کے پار کیا ہے؟
بسیط پانی عریض پانی!
(نظم 'آخری شمع بجھادو' سے اقتباس)

مٹی تہذیب، اور عہد حاضر کے 'عروج آدم خاکی' نے ایک تذبذب اور تشویش کی صورت حال پیدا کی ہے، جس نے پریشان کن خیالوں اور سوالوں میں انسان کو اسیر کیا ہوا ہے۔

سنو زیتون کے پیڑو
زمینیں نائٹروجن، فاسفیٹ اور آکسیجن کھا رہی ہیں
تمھاری کوکھ میں اب بانجھ پن پلنے لگا ہے
تو اپنے جسم کی زینت نہ نوچو
کہ یہ دو چار پتّی
کسی تاریخ داں کے کام آئے گی
(نظم 'بابادِ پارینہ' سے اقتباس)

مظاہر قدرت کے لامتناہی سلسلے، کہسار، ساحل، ریت، جنگل، بارش، سیلاب، سوکھا، دھواں، سایہ، چاندنی اور سمندر، دراصل سربستہ راز ہیں۔ سمندر کی گہرائی ایک رہتسیہ ہے، اس کی تہوں میں حیرت ناک عجائبات اور حیات و موت کے وسیلے ہیں۔ بدنام نظر نے اپنی نظم 'سمندر کتنا گہرا ہے' میں 'سمندر' کو مختلف تناظر میں منکشف کیا ہے۔ زندگی کی مختلف کیفیتیں اور صورت حال کی عکاسی میں 'سمندر' کو بڑی ہنرمندی اور فنکاری کے ساتھ علامتی پیرایے کے توسط سے نت نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

سمندر چپ
سمندر کتنا گہرا ہے
پیاس
لمبی پیاس کا اک سلسلہ
کہسار، ساحل، ریت، جنگل، کھیت، گھر، بارش،
دھواں، سیلاب، سوکھا، دھوپ
سایہ، چاندنی اور ناریل کے پیڑ
پھڑکتے ہونٹوں پہ اک ذائقہ ناعاقبت اندیش
گدگدی جسموں کی، سینوں کے تموج، خواب آنکھوں کے
جزیرے بن رہے ہیں
جزیرے کا تسلسل رشتۂ آبی
پیاس ٹھنڈی پیاس
سمندر سے سمندر تک
(نظم 'سمندر کتنا گہرا ہے' سے اقتباس)

بدنام نظر کا اختصاص یہ ہے کہ وہ نرے الفاظ سے اظہار کے لمبے سلسلے کشید کرنے پر قادر ہیں۔ مذکورہ نظم الفاظ کے لغوی معنی سے پرے کیفیت حیات کی رنگ آمیزی اور آہنگ شعری کا طلسم پیدا کرتی ہے — یہ کیفیت ان کی نظم 'تصویریں' میں بھی ہویدا ہے، ملاحظہ ہو ایک اقتباس۔

ہوا کی بو، سمندر کا نمک، سورج کے قطرے، بدلیوں کا رنگ
سب کے ہاتھ پھیلے ہیں
سکوت قبر، گھر کی چیخ، شہروں کی چمک، دیہات کی
تاریکیاں اور
جنگلوں کا شور
سب کتبوں کی صورت
کھڑے ہیں ہاتھ باندھے!

بدنام نظر کی نظموں کا مطالعہ ادھورا رہے گا اگر ان کی نظموں میں پیڑ پودے اور گاؤں کی منظر کشی اور ان کے توسط سے کشید کی گئی فطری حسیت کو ضبط تحریر میں نہ لایا جائے۔ بدنام نظر عظمت رفتہ یا پیڑ پودوں، چڑیوں، فاختاؤں، کھیت کی پکی پگڈنڈی، جنگل، وادی، پہاڑی،

پنگھٹ اور آم کے باغوں کی باتیں کرتے ہیں تو دراصل پس منظر میں گاؤں ہی ہوتا ہے، کہ گاؤں تو ان سارے مناظر سے ہی مزین ہے— گاؤں اور گاؤں کے مناظر سے بدنام نظر کی گہری وابستگی ان کی نظموں سے عیاں ہے۔

جانے کتنے گاؤں کے پنگھٹ
آم کے باغ
کھیتوں کی کچی پگڈنڈی
اب بھی مجھے یاد کرتی ہیں

(نظم 'تنہائی' سے اقتباس)

نظم 'تماشہ سلامتی کا' کے ذیل کے بند میں شاعر کے لطیف اشارے کے توسط سے گاؤں کا کھلا اور کھلا ہوا منظر نگاہوں میں تازہ ہوجاتا ہے۔

نظر اچانک اٹھ گئی
پڑوس کی منڈیر پر
منڈیر سے چپک گئی تھی اک کبوتری
سفید دھلی دھلی
بارشوں کے قطروں سے ڈری ڈری
ہوائیں اس کے پر سے کھیلنے لگیں
ہوا کے ساتھ میں نے بھی
اپنے جلتے ہونٹ ان پروں پہ رکھ دیے
سر بریدہ انگلیوں سے پر کی نرمیاں ٹٹولنے لگا
بجھی نگاہ سے پڑھا سکون، امن، آشتی

گاؤں اور گاؤں کے مناظر کے تعلق میں بدنام نظر کے یہاں پیڑ پودے بطور خاص اجاگر ہوئے ہیں۔ ایک نظم 'عظیم برگد' بھی قابل ذکر ہے۔ برگد کے پیڑ کی ہندو متھ میں بڑی اہمیت ہے۔ نظم 'عظیم برگد' کو اگر غور سے پڑھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ گاؤں کی پوری تاریخ، تہذیب و تمدن ختم ہوچکی ہے، جسے محسوس کرکے شاعر جھنجھلا اٹھتا ہے اور Fossil کی طرح کھڑے پیڑ کو Carbon Twelve کے ذریعے اس کی عمر، اس کا حسن اور اس کی جسامت اور کلچر جاننے کی شاعر کوشش نہیں کرتا، بلکہ نئی تہذیب کے چولہے اس کو جلا کر خاک کردینا چاہتے ہیں تاکہ پھر کوئی ماضی کے کھنڈر میں جاکر خودکشی نہ کرے۔

عظیم برگد
قدیم برگد
برہنہ سر اور برہنہ تن یوں کھڑا ہوا ہے
کہ جیسے تاریخ کی حقیقت
کہ جیسے اسلاف کی عقیدت
جو ریزہ ریزہ بکھر چکی ہے
جدید دل اور دماغ سے جو اتر چکی ہے
عظیم برگد، عظیم ہوگا، قدیم ہوگا
ہمارا اس سے نہ کوئی رشتہ، نہ کوئی ناتہ
ہمارا ناتہ بس اس سے اتنا ہی رہ گیا ہے
کہ اس کے سوکھے ہوئے بدن کو
کسی چولہے کی آگ کردیں
ہم اپنے اجداد کے نقش کو مٹا دیں
ہڈیاں جلا دیں
خلوص، شفقت، وفا کے سارے دیے بجھا دیں

(نظم 'عظیم برگد' سے اقتباس)

ایک اور نظم 'پیڑ تلے' میں برگد کا تعلق شاعر نے اپنی نوجوانی کے عشق سے جوڑا ہے۔ اس طرح ان کی کئی نظموں میں پیڑ اور خاص طور پر برگد کا پیڑ کئی طرح کی علامتوں اور استعاروں کا کام کرتا ہے۔ اس نظم 'پیڑ تلے' میں پیڑ دراصل ایک وسیلہ ہے، انتظار کے کرب اور تنہائی کا— پیڑ، عالم تنہائی میں لمبی مدت کے انتظار کا گواہ ہے اور مومن کے اس شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کی سی شدت کرب اور احساس نارسائی کی اذیت کو بیان کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔

اسی برگد کے تلے جم گئے ہیں پاؤں مرے
آخری بار جہاں تم سے ملاقات ہوئی
جس جگہ تم نے کہا تھا کہ ابھی آتی ہوں
ایک مدت ہوئی اس بات کو گزرے پھر بھی
میں اسی پیڑ کے سایے میں کھڑا ہوں اب تک

بدنام نظر کی نظموں میں جہاں زندگی کی سوندھی مٹی کی خوشبو اور چاہت کا احساس بسا ہے، وہاں حیات کی مختلف صورتوں اور انسان کی سائیکی میں ملفوف زندگی کی پیچیدگی اور نارسائی کا اظہار بھی مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ ادب و شعر کی پائیداری اور لمبی بازگشت میں ہیومن سائیکی کا بڑا دخل ہے۔ 1955 میں Vladmir Nabokov کا controversial ناول Lolita دراصل ہیومن سائیکی کی بنیاد پر لکھا گیا تھا جس میں ناول کا مرکزی کردار لمبی مدت تک بچپن کے ایک واقعے کے حصار میں نظر آتا ہے۔ بدنام نظر کی نظم 'آنکھیں میری کیا ڈھونڈتی ہیں' ہیومن سائیکی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں شاعر کی متلاشی آنکھیں اپنی محبت، اپنی چاہت کا وہ لمحہ، وہ احساس، زندگی کی مختلف گزرگاہوں اور مرحلوں میں ڈھونڈتی ہیں، جو نارسائی کی دھند میں گم ہے۔

آنکھیں میری کیا ڈھونڈتی ہیں؟
پانی میں یا چٹانوں میں
شبنم کے ننھے قطروں میں
بارودی دہکتے شعلوں میں
گلزاروں میں
یا ریگستانوں میں
محفل میں تنہائی میں

نظم کا ارتقا، انتہا، اختتام، دریا کے بلاخیز اور پرشور بہاؤ کی مانند حیات افروز اور رواں دواں ہے۔ یہ نظم بالآخر ایک گہری سوچ کے لمبے سلسلے پر ختم ہوتی ہے۔

اس چہرے کی متلاشی ہیں آنکھیں میری
جس چہرے میں وہ رہتی تھیں
وہ چہرہ جو اب خود کو بھی پہچاننے سے قاصر ہے نظر
آنکھیں اس کو کیا ڈھونڈیں گی؟

انسان ہمیشہ ذہنی مد و جزر میں گرفتار رہتا ہے، لیکن یہی کیفیت تخلیق کا سبب بنتی ہے، فنکار، حالات، حادثات، عمل اور ردعمل کے دائرے میں ہی نہیں، بلکہ اپنی ذات کے باطن سے بھی الجھتا رہتا ہے، فنکار پر انکشاف ذات نہیں ہوسکتا تو انکشاف کائنات بھی ممکن نہیں— بدنام نظر سمندر کے گہرے باطن کی غواصی بھی کرتے ہیں اور انکشاف کائنات کی صورت ابھرتے بھی ہیں۔ لہٰذا ان کی نظمیں، انکشاف ذات سے انکشاف کائنات کے سفر کی روداد بیان کرتی ہیں۔ مٹی کا ادراک، جینے کی راہ، اگر ایسا ہوا تو، میرے بچے اگر پوچھیں، اور 'ضد' انکشاف کائنات کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

بدنام نظر کا شعری رجحان داخلیت کی طرف ہے، وہ انکشاف ذات اور انکشاف حیات سے اپنی کائنات شاعری کو مزین بھی کرتے ہیں اور معتبر بھی بناتے ہیں، اس عمل کی وسعت میں وہ ایمائیت سے بھی کام لیتے ہیں اور ابہام سے بھی اپنی شاعری میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔

بدنام نظر کا اختصاص یہ ہے کہ وہ حال کے واقعے، احساس یا کیفیت کا اظہار ماضی کے حوالے سے کرتے ہیں، لیکن چونکہ اصل زندگی حال ہے لہٰذا ان کی نظموں میں مستقبل کی تلاش کے اشارے بھی نظر آتے ہیں اور ان نظموں کا تناظر اتنا وسیع ہے کہ اس میں کائنات کی ساری آویزش تحلیل ہوجاتی ہے اور جذبوں کی متاع اور کرب و نشاط بصورت طوفان چاروں طرف سے امنڈتا نظر آتا ہے۔

■

Ishrat Zaheer
House No: 370 A, 4th Floor
Gali No 6 A, Zakir Nagar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob:9801527481
Email.:ishratzaheer2@gmail.com

اشتیاق سعید

احسان سیوانی کو یاد کرتے ہوئے

ممبئی میں رہنے بسنے والے زیادہ تر افرادرات گئے تک جاگنے اور صبح دیر تک سوئے پڑے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، بالخصوص فنونِ لطیفہ نیز ادب سے وابستگی رکھنے والی شخصیات زیادہ تر رات کے آخری پہر ہی بستر کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں۔ خاکسار کا شمار بھی اسی قبیل کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ رات بھر الوؤں کی طرح جاگنا اور دِن چڑھے تک سوتے رہنا۔

ایک دوپہر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ خلافِ توقع موبائل کی گھنٹی گھنگھنائی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا، موبائل اٹھا کے دیکھا تو احسان سیوانی کا نام فلیش ہورہا تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی۔ 'السلام علیکم' مخاطب کی آواز سرسرائی۔ ''میں احسان سیوانی کا چھوٹا داماد بول رہا ہوں۔ آج صبح دس بجے ان کا انتقال ہوگیا۔'' اتنا سنتے ہی کب موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پر گرا مجھے ہوش نہیں۔ ذہن سوچنے لگا ابھی پرسوں ہی تو میں ان سے مِل کر آیا تھا۔ گھنٹے بھر میں ہم نے جانے کتنے سارے منصوبے بنائے تھے۔ وہ اپنی کتاب 'یادوں کے سائے' کی رسمِ رونمائی کرانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے بہتر ٹھکانہ چاہتے تھے۔ پہلی کتاب 'مٹی کی مہک' کی اجرائی تقریب ان کی بڑی بیٹی کے اسکول کے ہال میں بڑی نفاست کے ساتھ منعقد ہوئی تھی۔ وہ ویسا ہی پروگرام چاہ رہے تھے۔ مگر بیٹی کا اسکول اب اس مقام سے تقریباً تین کلومیٹر دور چلا گیا تھا۔ کرائے کی جگہوں کا عالم یہی ہوتا ہے۔ دوسرے دوتین ہال جو آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں وہ ریلوے لائن سے ملحق ہیں لہٰذا ہر دو تین منٹ کے بعد آنے جانے والی لوکل اور میل ٹرینوں کی گڑگڑاہٹ سامعین کی سماعت پر بار بن سکتی ہے۔ میں نے انہیں میرا روڈ میں واقع اندرا گاندھی میونسپل ہاسپٹل کے پچھلے حصے میں پہلی منزل پر قائم کلچرل ہال کے تعلق سے بتایا۔ وہ خوش ہوئے اور کہا وہ ہال میرا دیکھا بھالا ہے چھ آٹھ مہینے قبل میں ایک ہندی کے پروگرام میں وہاں شریک تھا۔ وہ ہال بہتر ہے وہاں اردو والوں کے علاوہ ہندی والے بھی شریک ہوجائیں گے۔ بس میری صحت ٹھیک ہوتے ہی وہ ہال بک کرلو۔ ان شاء اللہ میں دس پندرہ روز میں چلنے پھرنے کے قابل ہوجاؤں گا۔

انھوں نے سیوان کے شعرائے کرام پر ہندی میں مرتب کی ہوئی سمیع بہواروی کی کتاب دِکھائی۔ میں کتاب کی ورق گردانی کررہا تھا اور وہ اس کتاب پر زبانی تبصرہ فرما رہے تھے۔ میں ان کی قوت گفتار اور رفتار پر حیران تھا کہ یہ کم گو آدمی آج کس قدر گفتگو کررہا ہے۔ اسی دوران انھوں نے پورے یقین واعتماد کے ساتھ کہا تھا۔ ''اشتیاق صاحب میں تمھیں سیوان لے چلنا چاہتا ہوں، وہاں کے تمام شعرا وادبا تمھیں جانتے ہیں، سبھوں سے مِل کر تمھیں انتہائی خوشی ہوگی، بالخصوص ڈاکٹر ارشاد احمد اور سمیع بہواروی سے تمھیں ملوانا چاہتا ہوں''۔ افسوس! کہ ان کی یہ خواہش دِل میں ہی رہ گئی۔

احسان سیوانی کی ولادت 11 جولائی 1951 کو موضع بہوارہ، تھانہ بڑہریا ضلع سیوان کے ایک متوسط مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ جن کا آبائی پیشہ کاشتکاری تھا۔ والدِ محترم مولوی اقبال حسین اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس انعام واحسان سے خوش ہوکر نومولود کا نام احسان احمد تجویز فرمایا۔ والدہ حدیث النساء کچھ اردو کی شد بد رکھتی تھیں چنانچہ وہ انھیں کم عمری سے ہی الف سے اللہ پڑھانے لگی تھیں۔ یوں بھی آغوشِ مادر اولاد کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ بہر حال! احسان احمد کی پرورش گاؤں کے پرفضا ماحول میں ہوتی رہی۔ وہ بھی اسی ماحول میں گرتے پڑتے، کھیلتے کودتے مدرسہ جانے کی عمر کو پہنچے تو والدِ محترم نے گاؤں ہی کے مدرسے میں داخل کرادیا۔ اس لحاظ سے ابتدائی تعلیم کا سہرا گاؤں کے مکتب کے سر بندھتا ہے۔ پھر گاؤں سے تقریباً تین کلو میٹر پر واقع بڑہریا کے جی ایم ہائی اسکول سے

1968 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اسکول میں جب بھی کوئی جلسہ منعقد ہوتا تو احسان کو نعت پاک پڑھنے کی دعوت دی جاتی چونکہ ان کی آواز کافی مترنم تھی۔ یہیں سے انھیں شعر گوئی کا بھی چسکا پڑا اور ٹوٹے پھوٹے مصرعے موزوں کرنے لگے تھے۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کی خاطر ڈی اے وی پی جی کالج سیوان میں داخلہ لے لیا۔ حالانکہ والدہ سیوان جانے دینا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پڑھنے کے ذوق وشوق نے انھیں اجازت دینے پر مجبور کر دیا۔ ان دنوں معروف ادیب ڈاکٹر انور سیوانی صدر شعبۂ اردو اور فارسی تھے۔ اسی سبب کالج کا ماحول خالص ادبی تھا۔ انھیں دنوں کالج میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں ترنم اچھا ہونے کی بنا پر احسان کو بھی موقع دیا گیا۔ انھوں نے اپنی مترنم آواز کا وہ جادو جگایا کہ سارے کالج میں جانے پہچانے جانے لگے۔ ڈاکٹر انور سیوانی اپنے دولت کدے پر ماہانہ نشست کا اہتمام کیا کرتے تھے جس میں شہر کے سبھی شعرا کی شرکت ہوا کرتی تھی۔ احسان سیوانی بھی اس نشست میں پابندی سے شریک ہونے لگے۔

احسان سیوانی کی ذہنی پرداخت میں سیوان کا قدرے حصہ ہے۔ سیوان کے اسی کالج سے بی ایس سی کی سند حاصل کر کے برائے ملازمت بمبئی کے مضافاتی علاقہ باندرہ آگئے۔ کیونکہ باندرہ میں ان کے برادر کلاں کی رہائش تھی۔ آپ سائنس کے طالب علم تھے اس لیے جلد ہی انجمن خیر الاسلام کے ادارے میں بحیثیت سائنس اور میتھ ٹیچر ملازم ہوگئے۔ ان دنوں تنخواہ قلیل تھی جیسے تیسے گزارا ہونے لگا۔ قریب چھ ماہ بعد جب ملازمت مستقل ہوئی تو کچھ روپے بھی بڑھے۔ وہ اخراجات کی گاڑی پرانی تنخواہ سے ہی کھینچتے رہے اور بڑھی ہوئی رقم پس انداز کرتے رہے۔ دو سال بعد یہ رقم خاصی ہوگئی، پھر انھوں نے کرلا (مشرق) میں واقع قریش نگر کی پہاڑی پر ایک کمرہ خرید لیا اور باندرہ سے کرلا منتقل ہوگئے۔

میری ملاقات ان سے 1995 میں عارف اعظمی کے توسط سے ہوئی۔ واقعہ یوں ہے کہ میرے ایک بزرگ دوست شعبان اعظمی جو سینٹرل ریلوے کے ماٹونگا ورک شاپ میں بطور الیکٹریشین ملازم تھے، سائڈ بزنس کے طور پر منڈپ ڈیکوریٹر کا بھی کام پھیلا رکھا تھا۔ آپ ڈرامے اور مشاعرے کے بے حد شوقین تھے۔ ایک روز ہم یوں ہی بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جانے کیسے باتوں کے دوران مشاعرے کا ذکر چل پڑا۔ شعبان صاحب کہنے لگے۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب مل جل کر سال میں ایک مشاعرہ تو کر ہی سکتے ہیں“۔ سارے لوگوں نے ان کی بات پر کان دھرا اور باہمی اتفاق سے طے پایا کہ ہم سال میں ایک مشاعرہ کیا کریں گے اور ادارہ سب رنگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اب مسئلہ یہ کھڑا ہوا کہ آخر مشاعرہ کریں گے کب؟ کسی نے تجویز رکھی 15 اگست جشن آزادی کے موقع پر کیا جائے۔ دوسرے نے یہ کہہ کے بات خارج کر دی کہ اگست میں برسات کا موسم ہوتا ہے۔ پھر بات 26 جنوری یوم جمہوریہ پر آگئی۔ شعبان صاحب نے کہا یوم جمہوریہ تو مناسب ہے لیکن اس کے لیے ابھی کئی مہینے باقی ہیں۔ اس پر خاکسار نے عرض کیا بھئی تین چار روز بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے کو ہے۔ کیوں نہ ہم 'عید ملن مشاعرہ' منعقد کریں۔ اس پر سبھی عش عش کر اٹھے اور طے پا گیا کہ عید کے فوراً بعد 'عید ملن مشاعرہ' منعقد کیا جائے گا۔ کرلا مشرق میں واقع قریش نگر سے عارف اعظمی اور راشد کانپوری جو کہ میرے عزیز دوستوں میں سے تھے، ہر روز پابندی کے ساتھ کرلا مغرب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھار عیش کنول بھی آجاتے تھے۔ 'عید ملن مشاعرے' کی خبر ان احباب کی سماعت تک بھی پہنچی، انھوں نے خیر مقدم کیا اور بھرپور تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ اس تعلق سے علاقے کی چند بارسوخ شخصیات سے بھی گفتگو کی گئی۔ انھوں نے بھی دامے درمے سخنے ساتھ رہنے کی ہامی بھری۔ پھر ہم نے اپنے میونسپل کاؤنسلر عبداللطیف لالہ سے مشورہ کیا انھوں نے اخراجات کا بڑا حصہ اپنے ذمے لے لیا، پھر کیا تھا، شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں شہر و اطراف کے تمام بڑے شعرا نے شرکت کی اور مشاعرہ پوری آن بان اور شان کے ساتھ صبح فجر تک چلتا رہا، بڑی واہ واہ ہوئی جس کا نشہ غالباً چھ ماہ تک ہم سب پر طاری رہا۔

آئندہ سال رمضان کا مہینہ آتے ہی 'عید ملن مشاعرہ' کی تیاری شروع ہوگئی، شاعروں کی فہرست مرتب ہونے لگی۔ چند احباب نے مشورہ دیا کہ فہرست میں دو ایک ترنم سے پڑھنے والے شعرا کو بھی شامل کیا جائے، عارف اعظمی نے فوراً احسان سیوانی کا نام لکھوا دیا۔ مشاعرہ ہوا، سیوانی صاحب کو نعت پاک پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ انھوں نے اپنی مترنم آواز کا وہ جادو جگایا کہ سامعین جھوم جھوم اٹھے۔ پھر چند نوخیز شاعروں کے بعد دوبارہ انھیں دعوتِ سخن دی گئی۔ خاموشی سے اٹھے اور انتہائی سادگی سے مائک پر تشریف لائے اور بغیر سلام کلام کیے اس دل پذیر انداز میں تان چھیڑا کہ نوجوان کیا، ضعیف العمر سامعین کے بھی دل عشق و محبت کے سرور سے سرشار بلیوں اچھلنے لگے اور مجمع پر وہ سماں بندھا کہ الاماں! احسان صاحب کو محض ایک غزل پڑھنے کا موقع عنایت کیا گیا تھا مگر سامعین کے اصرار نے ان سے تین غزلیں سن لیں باوجود اس کے ان کی تشنہ لبی بجائے سیراب ہونے کے تشنگی کے صحرا میں ریت پھانکتی معلوم ہوتی تھی۔ مکرر مکرر اور ونس مور کا شور تھا کہ ستاروں سے ٹکرا کر بھیگتی رات کے سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ناظم مشاعرہ نے سامعین سے خطاب کیا اور احسان سیوانی کی توانائی سلب ہو جانے کی دہائی دی۔ وعدہ کیا کہ آئندہ تین چار شعرائے کرام کے بعد پھر انھیں دعوتِ کلام دیا جائے گا۔ تب کہیں جا کر

احسان سیوانی انتہائی ملنسار، سادہ مزاج اور صاف ذہن کے آدمی تھے۔ بناوٹ اور تصنع ان کے مزاج کا حصہ قطعی نہیں رہا۔ انانیت، غرور و تکبر تو شاید انھیں چھو کے بھی نہیں گزرے تھے۔ آپ لگ بھگ چالیس سال انجمن خیر الاسلام، مدنپورہ میں پوری تن دہی اور ایمانداری کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ آپ کا نصب العین قوم کے بچوں میں تعلیم کو عام کرنا اور انھیں تعلیم یافتہ بنانا تھا۔ اس لیے آپ مدن پورہ، ممبئی ہی کے ایک میونسپل نائٹ اسکول میں بھی اپنی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ بعد کو اس اسکول کے پرنسپل بھی ہوئے۔ علاوہ ازیں سہ پہر کے اوقات میں ایک تنظیم کے توسط سے جاری کوچنگ کلاسیس میں بھی معمولی اجرت پر اپنی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔

شور تھا اور مشاعرہ آگے بڑھا۔ جی ہاں! کہنے کو مشاعرہ آگے بڑھا، بظاہر احسان سیوانی نے جہاں چھوڑا تھا وہیں تھا رہا۔ کئی ایک شعرائے کرام آئے اور گئے لیکن پھر وہ گرماہٹ وہ تپش لوٹ نہ سکی۔ حتیٰ کہ شاعرات کے لٹکے جھٹکے اور عشوہ طرازیوں کا بھی جادو نہ چل سکا۔ آخرکار مشاعرے کے صدر محترم رویندر جین نے مداخلت کی اور وہ بغیر دعوتِ سخن کے اٹھ کر مائک پر آئے اور نبی اکرمؐ کی شان میں نعتِ پاک کا نذرانہ پیش کیا ان کے ایک ایک شعر پر لوگ داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگے اور مجمع تہہ و بالا ہوگیا۔ خیر صبح پانچ بجے مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد مسلسل دس برس تک 'عید ملن مشاعرہ' ہوتا رہا اور ہر مشاعرے میں احسان سیوانی کی شرکت یقینی ہوتی تھی۔ بعد کو قانونی پیچیدگیوں نے مشاعروں کی ڈور کاٹ دی مگر تعلق کی ڈور میرے اور احسان سیوانی کے درمیان ان کی آخری سانس تک مربوط اور مضبوط رہی۔

احسان سیوانی انتہائی ملنسار، سادہ مزاج اور صاف ذہن کے آدمی تھے۔ بناوٹ اور تصنع ان کے مزاج کا حصہ قطعی نہیں رہا۔ انانیت، غرور و تکبر تو شاید انھیں چھو کے بھی نہیں گزرے تھے۔ آپ لگ بھگ چالیس سال انجمن خیرالاسلام، مدنپورہ میں پوری تن دہی اور ایمانداری کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ آپ کا نصب العین قوم کے بچوں میں تعلیم کو عام کرنا اور انھیں تعلیم یافتہ بنانا تھا۔ اس لیے آپ مدن پورہ، ممبئی ہی کے ایک میونسپل نائٹ اسکول میں بھی اپنی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ بعد کو اس اسکول کے پرنسپل بھی ہوئے۔ علاوہ ازیں سہ پہر کے اوقات میں ایک تنظیم کے توسط سے جاری کوچنگ کلاسیس میں بھی معمولی اجرت پر اپنی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ غرض کہ صبح چھ بجے گھر سے نکلتے اور رات 11 بجے گھر لوٹتے۔ یہ سلسلہ کرلا سے میرا روڈ کی رہائش کے دوران بھی بدستور رہا۔ یاد رہے کہ کرلا سے مدن پورہ کا فاصلہ محض 12 کلو میٹر تھا جبکہ میرا روڈ کا فاصلہ 50 کلو میٹر ہے اور یہ تعلیم کا دیوانہ روزانہ سو کلو میٹر کا سفر کرتے ہوئے اپنی دیوانگی کو تسکین کے پہلو میں پناہ دیتا رہا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ انھیں روپے پیسوں کا لالچ تھا اور وہ اپنی آمدنی میں اضافے کی خاطر اتنی مشقت اٹھایا کرتے تھے۔ اس بابت عرض ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد نہیں ہے، اولادوں میں محض تین بیٹیاں ہیں، تینوں ہی تعلیم یافتہ ہیں اور تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب اپنے گھر بار کی بھی ہو چکی ہیں۔

احسان سیوانی نے گزشتہ برس حج بیت اللہ کا سفر بھی کر لیا تھا۔ اب وہ اپنے تمام تر فرائض سے سبک دوش ہو چکے تھے، سرکاری وظیفے پر گزر بسر ہوتی تھی۔ آپ طبیعت سے کم آمیز اور کم گو رہے ہیں اس لیے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا نہ کے برابر تھا۔ وہ اپنے تعلق سے برملا کہتے بھی ہیں۔

ہوں میں خاموش تو حیرت کیا ہے
بہت پہلے سے میں کم گو رہا ہوں

میں جہاں تک سمجھتا ہوں کم گوئی بری بات یا کوئی عیب نہیں ہے، یہ تو انسان کی طبعی صفات میں سے ایک ہے، یوں بھی لفاظ یا زیادہ بولنے والا شرفا میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، لوگ باگ ایسے شخص کو دروغ گو تصور کرتے ہیں، ہوتا بھی ہے کہ زیادہ بولنے والا بولتے بولتے کچھ ایسے نازیبا جملے بھی ادا کر بیٹھے جو سننے والے کو ناگوار گزرے۔

لاک ڈاؤن کے زمانے میں احسان سیوانی کورونا سے ایسے خائف ہوئے کہ لوگوں سے فاصلہ بنائے رکھنے کے لیے دو برس تک گھر کے قیدی بنے رہے۔ ان کا فلیٹ عمارت کی پانچویں منزل پر واقع ہے، یہ کبھی نیچے نہیں اترے۔ ممکن ہے اسی سبب انھیں سانس کا عارضہ ہوگیا۔ رہ رہ کے سانسیں پھولنے لگیں۔ لیکن انھوں نے ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا۔ اور جب مرض حد سے بڑھ گیا تب تک دیر ہو چکی تھی۔ جانچ سے معلوم ہوا آپ کے پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ دو ماہ ہسپتال میں آکسیجن پر رہنے کے بعد بھی افاقہ نہیں ہوا۔ آخرش ڈاکٹروں نے انھیں گھر پر ہی رہنے کی صلاح دی اور آکسیجن کا سیٹ اَپ ان کے کمرے میں انسٹال کر دیا۔ دو چار دن میں جب کبھی ان کا ادبی گفتگو کا دل چاہتا مجھے فون کر لیتے اور دس پندرہ منٹ مسلسل بولتے رہتے۔ جب سانس پھولنے لگتی اور دم اکھڑنے لگتا تو خدا حافظ کہہ کے فون بند کر دیتے۔

بہر حال! سیوانی صاحب کا زیادہ تر وقت گھر کی چار دیواریوں کے درمیان لکھنے پڑھنے میں گزرتا رہا۔ شاعری آپ کی سرشت میں شامل تھی۔ آپ دورانِ طالب علمی ہی شعر کہنے لگے تھے۔ مقامی اخبارات میں چھپنے کے ساتھ ساتھ خوش گلو ہونے کے سبب مشاعرے بھی پڑھنے کے مواقع ملتے رہے۔ مشاعروں نے انھیں بطور شاعر ایک شناخت عطا کی، نتیجتاً لوگ باگ انھیں پہچاننے لگے۔

نیوز ٹاؤن پبلشرز کے توسط سے آپ کے دو مجموعے جنوری 2017 میں 'مٹی کی مہک' اور نومبر 2022 میں 'یادوں کے سائے' شائع ہو کر مقبول عام ہوئے۔ دونوں مجموعوں کو بالترتیب بہار اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ آپ ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ 'ادب گاؤں' کی مجلس ادارت میں بھی شامل تھے اور گاہے گاہے کفالت بھی کیا کرتے تھے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے 'ادب گاؤں' میں احسان سیوانی پر ایک مبسوط گوشہ شائع کیا ہے۔

احسان سیوانی نے انسانی زندگی کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے، انسان کے روزمرہ کو شاعری کے سانچے میں کچھ اس انداز سے ڈھالا ہے کہ انسان کا باطن تمام عیوب اور خوبیوں کے ساتھ شفاف شیشے کی مانند عیاں ہو جاتا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں۔

محبت اور اخوت سب تو رخصت ہو گئے گھر سے
بس اک مضبوط رشتہ رہ گیا انسان کا زر سے

اک مختصر دیوان ہے ستر صفحات کا
ہے آخری صفحہ یہ کتابِ حیات کا

احسان سیوانی پہلے شعر میں فرما رہے ہیں کہ محبت اور اخوت کا رشتہ جو ہمارے درمیان سرمایۂ حیات کی مانند اٹل تھا وہ اب جاتا رہا۔ ہم نے اب اپنا اصل اور مضبوط رشتہ زر کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ ایک برہنہ حقیقت ہے جو ہمارے معاشرے کو کمزور کر رہا ہے۔ اسی کے چلتے معاشرے میں برائیاں پنپ رہی ہیں، بھائی بھائی کا دشمن ہوا جاتا ہے، بیٹے باپ کا قتل کیے دے رہے ہیں، بیوی شوہر سے دغا کر رہی ہے، بیٹیاں، بہنیں خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

دوسرے شعر میں احسان سیوانی نے زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں انسانی زندگی کی بساط کیا ہے؟ ستر سال؟؟ یعنی انسان کی زندگی ستر صفحات کا محض ایک مختصر دیوان ہے اور جو بھی سال گزر رہا ہے وہ آپ کی کتابِ حیات یعنی آپ کی زندگی کا آخری صفحہ ہے۔ موت کا کوئی دن معین نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی، کسی بھی وقت تمھارے ہمارے درِ زیست پر دستک دے سکتی ہے۔ آخر کار 12 جون 2023 کی صبح دس بجے موت نے احسان سیوانی کے درِ زیست پر دستک دے ہی دی، دستک کیا دیا ساتھ ہی لے گئی، اب ان کا یہ شعر بار بار ذہن میں گردش کرتا ہے اور دماغ کے خلیوں سے ٹکراتا رہتا ہے۔

اپنا پتہ بتایا نہ کوئی خبر کبھی
ایسا گیا کہ پھر نہیں آیا ادھر کبھی

■

Mr. Ishtiyaque Saeed
B-01, New Mira Paradise,
Geeta Nagar, Phase-2
Mira Road-401107 (Thane) Mumbai
Cell.:9930211461
E-mail: ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

رمیشا قمر

نئی اردو کہانی صارفیت کے اس دور کی تمام نیرنگیوں کی ترجمان بنتی جارہی ہے

پروفیسر صغیر افراہیم

صغیر افراہیم اردو کے ایک اہم نقاد ہیں۔ان کا شمار اردو فکشن کے نمائندہ تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ پریم چند پر انہوں نے خصوصی توجہ کی جس کے نتیجے میں ان کی مشہور و معروف تنقیدی کتاب پریم چند ایک نقیب معرض وجود میں آئی۔تنقید کے ساتھ ساتھ صغیرافراہیم نے تحقیق کی طرف بھی دھیان دیا اور بعض ایسے حقائق بھی سامنے لائے جو پردۂ خفا میں پڑے ہوئے تھے۔غالب اور باندہ سے متعلق ان کی کتاب ان کے تحقیقی کاوشوں کی روشن مثال ہے۔

صغیر افراہیم ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ صغیرافراہیم نے صدر شعبۂ اردو کا عہدہ بھی سنبھالا اور اسی عہدے کے دوران وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر بھی رہے۔آج بھی وہ ایک جریدہ 'سیما' جو ان کی شریک حیات مرحومہ پروفیسر سیما صغیر کی یاد میں جاری کیا گیا ہے، کے مدیر ہیں۔پیش ہیں ان کے انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

رمیشا قمر: سب سے پہلے آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا۔صغیر صاحب افسانوی ادب سے تو آپ کو دلچسپی ہے ہی پریم چند سے آپ کو خصوصی لگاؤ ہے۔ آپ کی کتاب 'پریم چند-ایک نقیب' نے تو واقعی آپ کو پریم چند کا نقیب بنادیا۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے نقادوں نے پریم چند کے فکروفن پر اپنی توجہ مرکوز کی جن میں پروفیسر جعفر رضا اور قمر رئیس کے نام سرفہرست ہیں۔ آپ کا کام کس اعتبار سے اپنے ان پیش روں سے مختلف ہے؟

صغیر افراہیم: پروفیسر جعفر رضا کی تحریروں کو میں آج بھی بے حد پسند کرتا ہوں۔ اور پروفیسر قمر رئیس تو اس معاملے میں میرے رہنما رہے ہیں۔ دونوں کی تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک سہولت بآسانی یہ میسر ہوئی کہ کانپور میں 'زمانہ' کی تمام فائلیں مجھے مل گئیں، اور میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ خود میرے وطن اناؤ میں ان کی اور ان کے احباب کی تمام تحریریں ہندی میں دستیاب تھیں اور چونکہ میں نے انٹرمیڈیٹ تک ہندی میڈیم میں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے انھیں پڑھنے میں مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر جب میں نے اس جانب توجہ دی کہ پریم چند کے یہاں تحریک آزادی وطن کے جانبازوں میں شاہ ولی اللہ کی تحریک مجاہدین کے جاں نثاروں کا عکس محسوس ہوتا ہے تو اس جانب ثاقب کانپوری اور اشتیاق عارف صاحب نے بھرپور رہنمائی کی۔ اس کے علاوہ ہندی کے بزرگ ادیب اور سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا کے جنرل سکریٹری نے دلائل وشواہد کے ساتھ اس جانب نشاندہی کی کہ 'جس طرح مجھے گنیش شنکر ودیارتھی اور کرانت کاری آندولن سے حریت کی راہ ملی اسی طرح پریم چند کو شاہ ولی اللہ اور تحریک مجاہدین سے ملی تھی'۔

تحقیق کے دوران میں نے رسائل وجرائد کی مدد سے اس کا بھی مطالعہ کیا کہ پریم چند نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ان میں اردو افسانوں کی تعداد کتنی ہے اور ہندی کہانیاں کس قدر ہیں۔ اور کتنے ایسے افسانے ہیں جنھیں معمولی ردّو بدل کے بعد شائع کرایا گیا ہے۔ مثلاً 'شکوہ شکایت' ہندی میں 'گلہ' کے عنوان سے چھپا۔ 'معصوم بچہ'، 'بالک' کے عنوان سے 'بدنصیب ماں'، 'بیٹوں والی ودھوا' کے نام سے شائع ہوا۔ 'سکون قلب'، 'شانتی' کے عنوان سے 'انصاف کی پولیس'، 'خدائی فوجداری' کے نام سے۔ 'غم نہ داری بُز بخر'، 'کوئی دکھ نہ ہو تو بکری خرید لو' کے عنوان سے چھپا ہے۔ اسی طرح ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ہوا۔ وہ یہ کہ پریم چند کا صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے والا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' ہے۔ جب کہ اُن کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'عشق دنیا اور حب وطن' ہے جو ماہ اپریل 1908 میں 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا تھا۔ اور اسی سال ماہ جون میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' کے عنوان سے زمانہ پریس کانپور سے چھپا تھا۔ اس میں ترتیب کے اعتبار سے 'دنیا کا سب سے انمول رتن' سرفہرست ہے اور 'عشق دنیا اور حب وطن' آخر میں شامل ہے۔

ر ق: صغیر صاحب آپ کی تنقیدی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ادب کو ترقی پسند نقطۂ نظر سے دیکھنا اور پرکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

ص ا: روز اول سے پریم چند میرے پسندیدہ ادیب رہے، وہ ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزار ہیں۔ احباب اور اساتذہ اس تحریک کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میں نے پی ایچ ڈی بھی ایک طرح سے اسی موضوع پر کی۔ عنوان تھا 'اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل' پروفیسر نعیم احمد نگراں تھے۔ جو مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے زبردست ہم نوا تھے۔ کنور پال سنگھ، قاضی عبدالستار اور شہریار بھی اس تحریک سے وابستہ تھے۔ مشاہدہ، ماحول اور مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس تحریک کا بنیادی موضوع انسانیت کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ یہ تحریک نہ صرف عوام کی امنگوں اور خواہشوں کا احترام کرتی ہے بلکہ صحت مند معاشرے کی تشکیل کو اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔

د ق: صغیر صاحب آپ کن ادبی شخصیات سے بے حد متاثر ہوئے؟

ص ا: طویل فہرست ہے۔ سید محمد علی شاہ اور اشتیاق عارف صاحب جنھوں نے ادب کے مطالعے کی طرف مجھے خاص طور سے راغب کیا۔ پھر احسان آوارہ اور سید نور الدین احمد کا نام لینا چاہوں گا۔ احسان آوارہ شہر باندہ کی معروف شخصیت تھے۔ وہ وہاں بلند پایہ ادبی شخصیات پر مذاکرے ومباحثے منعقد کرتے، غالب کے قیام باندہ کے تعلق سے خاص طور پر انھوں نے مذاکرے کرائے۔ سید نور الدین احمد صاحب عروض وقواعد پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اُن کے ساتھ مل کر 'آئینۂ ہجری' کے عنوان سے ایک کتابچہ سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کی مطابقت پر شائع کرایا جس کی مدد سے سنہ ہجری کی تاریخوں کو جدید انگریزی تقویم سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں چارٹ، اور کیلنڈر کو بے حد آسان شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ انھوں نے اپنی زندگی اور تمام اثاثہ علمی وادبی سرگرمیوں کے لیے وقف کردیا ہے۔ عالیشان ابن سینا اکیڈمی میں نایاب وکمیاب ذخیرہ اس طرح اکٹھا کردیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ خود بھی ہمہ تن علمی وادبی کام میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کی ان گنت صفات میں سے ایک بڑی صفت یہ بھی ہے کہ کسی بھی علمی وادبی نکتے کی تحقیق کے لیے ان کی اکاڈمی میں جانے والا شخص کبھی مایوس نہیں ہوتا، وہ وہاں سے سیراب ہوکر واپس آتا ہے۔ میں مسلسل ان سے استفادہ کرتا ہوں اور وہ بھی بڑے خلوص سے میری ادبی وعلمی رہنمائی کرتے ہیں۔ آج وہ ہمارے لیے مینارِ نور اور قابلِ تقلید ہیں۔

د ق: صغیر صاحب آپ نے فکشن پر زیادہ لکھا، شاعری پر کم، اس کی کوئی خاص وجہ؟

ص ا: شروع سے طبیعت فکشن کی طرف مائل تھی، قاضی عبدالستار کی رہبری ملی۔ پی ایچ ڈی کا موضوع بھی فکشن ہی تجویز ہوا۔ پھر میرے تقریباً تمام دوست فکشن کو ہی پسند کرتے اور لکھتے چنانچہ میرا رجحان بھی اسی جانب زیادہ رہا۔ اس کے باوجود میں نے جگت موہن لعل رواں اور کیفی اعظمی پر کتابیں لکھی ہیں۔ دکنی شاعری خصوصاً دکنی مرثیے کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے پر مبنی میری کتاب 'اردو شاعری: تنقید وتجزیہ' ادبی حلقے میں بے حد پسند کی گئی ہے۔ 'جدید اردو غزل' کے عنوان سے بھی میں نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔

د ق: صغیر صاحب آپ نے معاصر فکشن پر بہت لکھا ہے۔ افسانے اور ناول بھی آپ کے موضوعات میں رہے ہیں۔ آپ کو اردو افسانے پر لکھنا زیادہ اچھا لگتا ہے یا اردو ناول پر؟

ص ا: قاضی عبدالستار صاحب کے حکم کی بنا پر تنقید خصوصاً افسانوی ادب کی تنقید کو میں نے چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ پھر میرے دوستوں میں طارق چھتاری، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، غضنفر، احمد رشید، سب فکشن نگار تھے۔ جن فنکاروں سے بعد میں تعلقات دوستی میں تبدیل ہوئے، اُن میں حسین الحق، انیس رفیع، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، نور الحسنین، بیگ احساس، بھی فکشن رائٹر تھے۔ لہٰذا اپنے احباب کی تحریریں چاہے وہ ناول کی شکل میں ہوں یا افسانوں کی شکل میں، ذوق وشوق سے پڑھتا، اپنی رائے کا اظہار کرتا اور قلم بند کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ افسانہ اور ناول دونوں مجھے پسند ہیں۔ ان پر لکھنے میں مجھے کبھی ان کی طوالت یا ان کی ہیئت حائل نہیں ہوئی۔

د ق: آپ کے معاصرین میں ناول لکھنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان میں سے کئی کا تعلق آپ کے شہر اور آپ کی مادر درس گاہ سے بھی ہے۔ تقریباً ان سب پر آپ نے لکھا ہے مثلاً غضنفر، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، پیغام آفاقی۔ آپ کی نظر میں ہم عصر اردو ناول نگاری میں ان کا کیا مقام ہے؟

ص ا: طارق چھتاری کا ناول ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ لیکن ناول کا جتنا حصہ وہ لکھ چکے ہیں، وہ میرا بغور سنا ہوا ہے۔ مذکورۂ بالا ادیب اس دور کے بڑے فنکار ہیں۔ ان کا اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ، اسلوب اور عمیق مطالعہ ومشاہدہ ہے۔ ناول کی پیش کش اور بنت پر ان کی مکمل گرفت ہے۔ یہ صرف ہندوستان کے ہی نہیں، اردو دنیا کے قابلِ قدر، قابلِ تقلید اور قابلِ ستائش ناول نگار ہیں۔ میں ان پر، ان کے ناولوں پر، مختلف زاویوں سے مستقل لکھ رہا ہوں اور ان شاء اللہ لکھتا رہوں گا۔ ان ناول نگاروں کے فن میں جدت اور ندرت ہے۔ چھا جانے اور گھر کر لینے والا انداز ہے۔

د ق: آپ کے سبھی دوست تخلیق کار ہیں اور تخلیقی میدان میں وہ کافی آگے نکل گئے ہیں۔ آپ اس میدان میں پیچھے کیوں رہ گئے جب کہ آپ خود بھی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں؟

ص ا: ریشا صاحبہ گفتگو کے آغاز میں وجہ بیان کر چکا ہوں کہ میں نے ابتدا میں افسانے ہی لکھے ہیں۔ یہ سلسلہ ہائی اسکول کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ علی گڑھ پہنچنے سے پہلے میرے کئی افسانے شائع ہو چکے تھے۔ شادی سے پہلے سیما کانپور میں، اپنے دورانِ طالب علمی میرے افسانے کو پڑھ چکی تھیں۔ یہ افسانے روزنامہ 'سیاست جدید' اور 'پیغام' کے علاوہ ماہنامہ 'کاوش جدید' میں شائع ہوئے تھے۔ بھوپال میں اشتیاق عارف صاحب نے بھی اپنے اخبار ورسائل میں انھیں جگہ دی تھی۔ افسانوں سے رغبت ہی کی بدولت میں قاضی عبدالستار کے بہت چہیتے شاگردوں میں شامل ہوا اور کئی برس بعد ان ہی کے حکم پر تنقید کی جانب میں نے توجہ مبذول کی۔ وجہ یہ رہی کہ ان کے شاگردوں میں سبھی افسانہ نگار تھے، کوئی نقاد نہیں تھا۔ میری تحریروں میں انھیں تنقیدی وتحقیقی صفات کثرت سے نظر آئیں اور انھوں نے میرا رخ تخلیق سے تنقید کی جانب موڑ دیا۔ سیما کی بدولت جب میرے ریڈیائی افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا تو انھوں نے اجرا کرتے ہوئے اپنے تفصیلی انٹرویو میں نہ صرف رخ بدلنے کی وضاحت کی بلکہ یہ بھی کہا کہ 'صغیر نے تحقیق وتنقید میں آج بڑا مرتبہ حاصل کرلیا ہے، اب اگر وہ افسانے کی طرف رُخ کریں تو مجھے مزید خوشی ہوگی'۔

د ق: صغیر صاحب آپ کی تنظیمی صلاحیت کا اندازہ رسالہ 'سیما' سے ہوتا ہے۔ اس رسالے نے بہت کم وقت میں اپنی جگہ بنالی ہے مگر ایک مدیر کے ناطے یہ بتائیے کہ جو نگارشات آپ کے رسالے کے لیے موصول ہورہی ہیں کیا وہ معیاری ہیں؟

ص ا: الحمدللہ! مجھے بہت اہم اور معیاری غیر مطبوعہ تحریریں مل رہی ہیں اور علمی وادبی حلقے میں بے حد پسند کی جارہی ہیں۔ میں مطمئن ہونے کے بعد ہی انھیں شائع کرتا ہوں ورنہ معذرت طلب کرلیتا ہوں خواہ وہ کتنا بھی اہم اور معروف ادیب ہو۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ایسی صورت میں فنکاروں نے مجھ سے شکوہ نہیں کیا، اور ان کی تحریریں دوسرے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ ترتیب وتنظیم اور زبان وبیان کے سلسلے میں میرے احباب خصوصاً ڈاکٹر عارف حسن خاں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں،

خاص طور سے عروض وقواعد پر مبنی تحریروں یا شعری کلام کے لیے ان کے مشورے بہت اہم ہوتے ہیں۔

دق: صغیر صاحب اب کچھ باتیں کہانی کے متعلق جاننا چاہوں گی۔ نئی اردو کہانی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ اسے کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

ص ا: نئی اردو کہانی صارفیت کے اس دور کی تمام نیرنگیوں کی ترجمان بنتی جا رہی ہے۔ دور حاضر میں انسانی زندگی میں جیسے جیسے تبدیلیاں آئی ہیں، تہذیبی وثقافتی تغیرات رونما ہو رہے ہیں اور اقداری واخلاقی مسائل سامنے آ رہے ہیں۔ نئی کہانی اسی پیکر میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ موضوعات کے تنوع، اظہار کی تیز دھار، الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تخلیقی سطح کی نئی اردو کہانیوں سے میں مطمئن ہوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نئی اردو کہانی نئے فنی تناظر کے پیرائے میں سماجی مسائل کو سننے سے زیادہ دیکھنے، محسوس کرنے، معاشرتی ناہمواریوں سے اُلجھنے اور نت نئے بدلتے ہوئے سیاسی رویوں سے بے باک ہو کر باتیں کرنے نیز انھیں فنی طور پر پیش کرنے کا موثر وسیلہ بن چکی ہے۔ نئی اردو کہانی موجودہ عالمی منظر نامہ کی بگڑتی بنتی تصویر کے حوالے سے اس لیے بھی کارگر ہے کہ یہ صحت مند مکالمے، قائم کرتے ہوئے مدلل اختلاف درج کرا رہی ہے۔

دق: ادب یا فکشن میں تجربے کی کیا اہمیت ہے؟ اردو فکشن خصوصاً اردو ناول میں ادھر کس طرح کے تجربے ہوئے ہیں اور کن ناول نگاروں نے زیادہ تجربے کیے ہیں؟

ص ا: افسانوی ادب فکر و اظہار کے تحریری ادغام کی علمی وفنی صورت کا نام ہے جس کا موثر اور تخلیقی ہونا لازمی ہے۔ اس میں فکر کی وسعت اور عصری زندگی کی ترجمانی کے ساتھ تکنیک اور اسلوب کے تجربات 'امراؤ جان ادا' سے 'دشت سوس' تک ہوتے رہے ہیں۔ آج یہ تجربے زیادہ شدت مگر فنکارانہ ڈھنگ سے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر غضنفر کے تقریباً ہر ناول میں ایک تجربہ ہے۔ 1989 میں منظر عام پر آنے والے ناول 'پانی' میں غضنفر نے ناول کے فریم ورک کو توڑا ہے اور اسے چشمۂ حیات کا اشاریہ بناتے ہوئے ازل سے ابد تک کی حیات کو اس طرح سمیٹا ہے کہ 'پیاس' کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ تکنیک داستان کی ہے جس میں تمثیل، علامت اور استعارے سے خوب کام لیا ہے۔ 'کینچلی' میں بیانیہ کی تکنیک نے روایتی انداز کو مجروح کیا ہے۔ نیز اس میں زندگی کے حقائق کا تہہ بہ تہہ مطالعہ ومشاہدہ جلوہ گر ہے۔

کہانی 'انکل' میں تجرید اور تمثیل کو ہم آمیز کرتے ہوئے شفاف بیانیہ کی شکل دی ہے جو عزم و حوصلے کو ہی نہیں تخلیقیت کو بھی مہمیز کرتا ہے اس میں ڈرامائیت کے ذریعے اسلوب کو ڈرامائی بیانیہ بنا دیا گیا ہے۔ 'دویہ بانی' میں ظالم اور مظلوم، ندی اور نالا، چنولی اور بامھن ٹولہ کے تضاد کو استعارے کی شکل دی ہے۔ یہ استعارہ علم و آگہی، شخصیت کی شناخت اور ذات کے عرفان کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اس میں لفظوں کی تکرار کے توسط سے صوتی آہنگ بیدار کیا گیا ہے۔ مانوس فضا اور ماحول میں اپنائیت کی واضح کیفیت ناول 'فسوں' میں نظر آتی ہے۔ اسے کولاژ کی شکل میں تبدیل کرتے ہوئے کیمپس ناول کی بہترین شکل میں اُبھارا گیا ہے۔ گزرے ہوئے کل کو لمحہ موجود میں منجمد کر کے اس کے امکانات کو بروئے کار لانا، مذکورہ ناول کا فنی کمال ہے۔ اس کا انداز بیان بے ساختہ ہونے کے باوجود عجب کج کلاہی شان رکھتا ہے۔ 'وش منتھن' میں قصے کے اندر قصہ کے ساتھ ڈرامے کے اندر دوسرا ڈرامہ متحرک نظر آتا ہے۔ 'مم' بھی اپنے اسلوبی خصائص کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس میں 'پانی' اور 'پیاس' کے مانوس استعارے کو نئی جہت اور نئی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ 'شوراب' میں خطوط کی تکنیک کو نیا آہنگ دیا ہے۔ 'مانجھی' میں ناول نگار نے دیومالائی اساطیر کو عصری قالب میں ڈھالا ہے۔ اس طرح موضوع، اور زبان و بیان کی پیش کش ان کے تجربات پر مبنی ہے، اور یہ تجربات اپنی مثال آپ ہیں۔

دق: صغیر صاحب ان دنوں آپ کے ایک تحقیقی کارنامے کا بڑا شہرہ ہے۔ آپ نے مرزا غالب کے متعلق کوئی نئی دریافت کی ہے؟ کیا ہے پورا قصہ ذرا تفصیل سے بتائیں؟

ص ا: دراصل میں نے اس نکتے پر اپنی تمام توجہ صرف کی ہے کہ غالب نے لکھنؤ سے کلکتہ کے سفر میں اپنا جو وقت شہر باندہ میں گزارا، اس کی تمام تفصیلات مدلل پیش کی جائیں۔ جو چھوٹی چھوٹی باتیں سامنے آئیں، ان کو میں نے بہ نظر غائر جانچا اور پرکھا اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا۔ دراصل غالب کی شخصیت اور فکر وفن کو سمجھنے کے لیے قیام باندہ کا تفصیلی ذکر لازمی تھا کیوں کہ برسوں سے میرے ذہن میں کئی سوالات اُبھرتے رہتے تھے۔ مثلاً باندہ سے مرزا غالب کا کیا رشتہ اور رابطہ تھا؟ وہ سفر کلکتہ میں منزل سے مختلف راستے پر کیوں گئے؟ سفر سے پہلے اور سفر کے بعد باندہ کے لوگوں سے اُن کا کیا تعلق رہا؟ وہاں تقریباً چھ ماہ کے قیام میں اُن کی کیا مشغولیات رہیں؟ محفلیں کس وسیلے سے سجتیں، شب و روز کیسے گزرتے؟ مقامی لوگوں اور ادیبوں پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس طرح کے بہت سے سوالات تھے جنھوں نے تحیر اور تجسس کو ہوا دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں طویل عرصہ کی تگ ودو میں کامیاب رہا۔

دق: غالب کے حوالے سے واقعی آپ نے ایک اہم کام سرانجام دیا ہے۔ اختصار کے ساتھ اب تک کی گئی قلمی کاوشوں اور مستقبل کے اپنے منصوبوں اور ارادوں سے آگاہ فرمائیے؟

ص ا: اب تک میری 26 کتابیں اور اُن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تین سو سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک اور بیرون ملک معتبر رسالوں میں چھپے ہیں۔ مجھ پر اور میرے فن پر کئی ادیبوں کی ضخیم کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ مثلاً 'جہان صغیر افراہیم'، 'صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور'۔ ملک کے کئی اہم اداروں میں مجھ پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ابھی مجھے بہت پڑھنا اور لکھنا ہے، میں برابر نئے نئے زاویوں سے سوچتا رہتا ہوں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ایک علمی، ادبی اور اشاعتی مرکز 'خیابان ادب' کے نام سے قائم کیا ہے۔ پروردگار سے دُعا کرتا رہتا ہوں کہ صحت وسلامتی کے ساتھ میرے منصوبوں اور ارادوں کو کامیاب کرے۔

دق: صغیر صاحب ادبی انعامات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ص ا: ہوس نہیں۔ اللہ نے بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی دے گا۔ جن لوگوں کو اعزازات سے نوازا جاتا ہے، میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ گلہ وشکوہ سے گریز کرتا ہوں۔ غیبت کی محفلوں سے دُور رہتا ہوں۔ گروہ بندی کا قائل نہیں۔

دق: صغیر صاحب نئے قلم کاروں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ص ا: مطالعے کی عادت ڈالیں، بحث ومباحثے میں حصہ لیں اور مثبت فکر کے ساتھ لائحہ عمل تیار کریں۔ بہت جلد سب کچھ پالینے کی بیماری کو آس پاس نہ آنے دیں۔ مادری زبان کو ماں کا درجہ دیتے ہوئے اس سے محبت کریں۔ اپنی تحریر کو بار بار پڑھیں اور جہاں محسوس کریں وہاں تصحیح سے گریز نہ برتیں۔ جب تک خود مطمئن نہ ہوں، شائع ہونے کے لیے نہ بھیجیں۔

صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے اپنی کامیابی کا پورا یقین رکھیں۔ محنت ومشقت کبھی ضائع نہیں جاتی ہے۔

دق: صغیر صاحب! آپ نے میرے لیے وقت نکالا، میرے سوالوں کے تشفی بخش جواب دیے، میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کو سلامت اور صحت مند رکھے اور آپ اسی طرح اپنی کاوشوں سے اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ کرتے رہیں۔ خدا حافظ۔

■

Dr.Ramisha Qamer(Dr.Qamerunnisa)
H.No 189 , Near Mahindra Showroom
Sedam Toad Kalaburagi -
585105 (Karnataka)

دارالادب برہان پور میں
نظمیہ شاعری

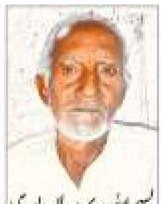

بسم اللہ عدیم برہان پوری

باب دکن، برہان پور کا ادبی و شعری اسکول مستند مانا جاتا ہے اور اس کا شہرہ بھی ہے۔ اس اسکول کے سربراہ مولانا عثمان خاں راغب ہاشمی کا شعری رشتہ خدائے سخن میر تقی میر سے ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم بہ عنوان 'فغانِ زندگی' ہے۔ یہ بیس اشعار پر مشتمل ہے، جو غزل کے فارم میں قافیہ ردیف کے ساتھ نظمائی گئی ہے۔ اس کا مطلع و مقطع اور تین اشعار درج ذیل ہیں۔

تو شریک حال ہے تو شادماں ہے زندگی
ورنہ ایک مجموعۂ آہ و فغاں ہے زندگی
ایک چھلاوا ہے ادھر آئی ادھر چلتی ہوئی
مٹنے والی موج دریائے رواں ہے زندگی
صدمۂ رنج والم سے مجھ کو کیوں کر ہو نجات
لمحہ لمحہ کے لیے مجھ پر گراں ہے زندگی
درحقیقت زندگی اپنی ہے بیداری کا نام
ہم اگر سوتے رہے تو رائیگاں ہے زندگی

یہ ایک طویل نظم ہے جو زندگی کی مختلف کیفیات کے عکس کو پیش کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم 'نوائے وقت' بہ زبانِ شاعر معاشرتی نظام میں ستیزہ کاری، ظلم و تر ہیب کے عناصر کے تدارک کو نوائے وقت بنا کر زبوں حالی کے سد باب کی ترغیب دیتی ہے۔ ملاحظہ کریں۔

غم کی دنیا میں محشر خیز شورِ دار و گیر
جس کو دیکھوں پنجۂ جور و ستم میں ہے اسیر
سر پہ ہر انساں کے اب بھی سایۂ افلاس ہے
مفلسی ہے، تیرہ سامانی ہے بیم و یاس ہے
بستیاں غم کی نظر آئیں جدھر اٹھی نظر
دل میں ہے ہنگامۂ محشر بپا شام و سحر
اک زمانہ ہے حوادث کے مرض میں مبتلا
جاں بلب سب ہیں کوئی کرتا نہیں اس کی دوا

مولانا موصوف کے تلامذۂ ارشد میں قابل ناز اردو نظم کا ایک ایسا شاعر بھی رہا ہے جو اپنے دورِ حیات میں بے حد معروف و مقبول تھا۔ انھوں نے ایک نظم جو 1846 ناگپور کے عظیم الشان مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ اس نظم کو سن کر 'طورِ درخشاں' کے مدیر طرفہ قریشی بھنڈاروی نے خصوصیت کے ساتھ 'میرا ماحول' عنوان دے کر شائع کیا تھا۔ اس طویل نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔

کفِ جبرئیل میں تاجِ سعادت ہے جہاں میں ہوں
بشر شایانِ اعزازِ خلافت ہے جہاں میں ہوں
ازل سے فرق پر چترِ فضیلت ہے جہاں میں ہوں
الوہیت بداماں میری فطرت ہے جہاں میں ہوں
ہر شئے سے نمایاں حسنِ فطرت ہے جہاں میں ہوں
حقیقت آئینہ دارِ حقیقت ہے جہاں میں ہوں
کہاں آغاز لے آیا میرا بختِ رسا مجھ کو
شریک قسمتِ عالم مشیت ہے جہاں میں ہوں

واجب التعظیم، مستند استاد راغب ہاشمی کے فرزند برکات احمد خاں جو گروہ راغب کے جانشین تھے، اور عریضہ نویسی کے پیشے سے لے کر موصوف اپنے والد بزرگ گوار کی ادبی سرگرمیوں میں قدم بہ قدم ہم رکاب رہے ہیں۔ لائق تحسین اس فرزند دلبند نے برہان پور کے ادبی محاذ پر اپنی زیرک مزاجی کے مثالی نقوش بنائے ہیں۔ جو کم و بیش 80 سال تک نقشِ نگیں کی طرح نمایاں رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں شعر برہان پور کی سرزمین پر یہ فرد جلیل راغب ہاشمی کے نام سے معروف رہا ہے۔

ان کی ایک غزل بہ عنوان 'امتحانِ زندگی' کے چند اشعار پیش ہیں۔

صحیفے دے کے بھجوایا گیا ہوں
یہاں آخر میں جھٹلایا گیا ہوں
نیاز و ناز کے ہر امتحاں میں
بہر صورت کھرا پایا گیا ہوں

مولانا راغب ہاشمی کے تربیت یافتہ تلامذہ میں حضرت حمید اللہ خلیق ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ دارالادب برہان پور کے شعرا میں محمود درانی، شفیق راز، قیصر انصاری، گردوں فاروقی ہیں۔ فنِ سخن گوئی میں ان اصحاب نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے شعری کلام کے طلسمی جمال کے عرصۂ دراز تک اہل قلم، اہل ہنر گرویدہ رہے ہیں۔ نیا ادب اور بدلتی ہوئی ادبی فضا کے باوجود ان تمام نے اپنے ادبی شعری رجحان کو روایتی شعری تہذیب کا پاسدار بنائے رکھا۔ مثال کے طور پر گداز ریشمی لہجے کے ہر دل عزیز شاعر محترم خلیق برہان پوری نے کثیر تعداد میں نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی ایک نظم 'رقاصہ' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دل شکستہ غم سے افسردہ جبینِ تابناک
دامنِ صبر و رضا دستِ ہوس سے چاک چاک
آمدِ انفاس میں الجھا ہوا تارِ نفس
چتونیں کہتی ہوئی خاموش رودادِ قفس
اُف یہ دیوی اور رقاصہ کے روپ میں
اک شگفتہ پھول زر کی شعلہ افشاں دھوپ میں
اس کو ملنا چاہیے تھا حورِ دنیا کا خطاب
اس کو ہونا ہی نہ تھا اسٹیج پر یوں بے نقاب

اس رنجور دل شاعر کے تفکر کی یہ سوزش کی رو آگے بڑھ کر ناخواندہ خواتین سے یوں ہم کلام ہوتی ہے۔

پاک سیرت محترم خاتون اے عالی صفات
آج کچھ کہنا ہے تجھ سے سن بگوشِ التفات
عالمِ انسانیت میں تیری ہستی فرد ہے
تیرے کوچے میں شکوہِ شہریاری گرد ہے
درحقیقت ہے تری آغوش ایک تعلیم گاہ
زندگی کی جس میں ملتی ہے نئی اک شاہراہ
قوم کی بگڑی ہوئی حالت بنا سکتی ہے تو
قسمتِ خوابیدہ صدیوں کی جگا سکتی ہے تو
علم کی دولت سے تیری روح ہے ناآشنا
تو سمجھ سکتی نہیں نسوانیت کا فلسفہ

خلیقی زمرے سے تعلق رکھنے والے شاعر اور مدرس جناب ناصر شاہی نے دورِ حاضر کے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر چند نظمیں، ہائیکو اور سانیٹ بھی تخلیق کیے ہیں، جو ان کے غیر مطبوعہ ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ یہاں کے مقامی اردو ادبی حلقوں کی فضا میں اس جدید اصنافِ سخن کا رواج عام نہ ہونے کے سبب موصوف نے غزل ہی کے دامن میں پناہ لی، اس کے پیچ و خم سنوارتے رہے۔ آپ ہی کے ہم ذوق، ہم پیشہ، دیرینہ دوست رشید آثار صاحب نے وافر تعداد میں مختلف النوع کیفیات سے مملو نظمیں تخلیق کی ہیں۔ لیکن آپ نے اب تک نظموں کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کرانے کی پہل نہیں کی ہے اور موصوف کے شاگردوں نے آپ کا شعری مجموعہ (لمس کی

خوشبو) نہایت عمدگی سے شائع کیا ہے۔

خلقی گروہ سے وابستہ خلیل خانقاہی نے بھی اپنی معلمی کی خدمت سے منسلک رہتے ہوئے طفلی نظموں سے دبستانِ اردو میں اضافہ کیا ہے۔ مجموعہ بھی 'سہانے گیت' (رحمانی پبلی کیشن، مالیگاؤں مہاراشٹر) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسی طرح راقم (بسم اللہ عدیم) نے بھی دلچسپ، من موہک معلوماتی نوعیت کی خاطر خواہ نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ 'سنہرے خواب'، 'تتلی کے پر' جیسے دو مجموعے بھی شائع کرائے ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ 'لفظوں کی کائنات' بھی منظر عام ہو چکا ہے۔

گہوارۂ ادب برہان پور کا ایک اور ادبی حلقہ ناسخ لکھنوی کے سلسلے سے وابستہ ہے۔ الفاظ کے دروبست، شعری محاسن اور نفاست کے معاملے میں سلسلہ ناسخ لکھنوی کے اس مقلد گروہ نے مذکورہ جملہ خوبیوں کو یہاں کے ادبی ایوان میں مقدم رکھا ہے۔ اس اسکول کے نگار خانے میں ہنر غازی پوری کے نقشِ قلم کی جولانی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس ادبی نگار خانے کے نغز گو حضرات کے سرپرست، اتفاق رائے سے منشی علیم اللہ خیالی مقرر ہوئے۔

منشی علیم اللہ خیالی صاحب نے متعدد اصناف سخن میں اپنی پختہ گوئی کے جواہر ریزے ہنرمندی سے بکھیرے ہیں۔ آپ نے گراں قدر ادبی وشعری خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے دورِ حیات میں جاری ادبی شعری نشستوں کی صدارت کے ساتھ کئی مشاعروں کے ذریعے سامعین کو بھی اپنے کلام بلاغت کی فصاحت سے محظوظ کیا ہے۔ ادبی رسائل وجرائد، اخبارات، گلدستوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ نظموں پر مشتمل ان کا مختصر مجموعہ 'دورِ جدید' بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ آپ کا زیادہ تر کلام طباعت سے محروم رہا۔ آپ کے شاگرد، تلامذہ کا حلقہ انتہائی وسیع تھا۔ شہر برہان پور کے علاوہ اطراف میں برار، خاندیش اور مختلف شہروں تک آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے۔ اہم شاگردوں میں علی محمد اوج، شکر اللہ جلالی، امام علی خاں حاذق بنارسی، میر شجاع الدین، منشی حکیم اللہ حیرت (خلفِ خیالی)، محمد صدیق ذکی، حشمت اللہ ریاضی (جانشین خیالی)، حبیب اللہ شرر، محمد قاسم لطافت، منشی علیم اللہ ہلالی، ظہور حسین رضی، محمد اسماعیل فہمی (مترجم تاثر رحیمی)، منشی عبدالستار مضطر، جاوید انصاری (مصنف تاریخ زرنگار برہان پور) ہیں۔

برہان پور کے دبستانِ اردو ادب میں حشمت اللہ ریاضی (برادرم خرد جانشین خیالی) نے بھی استادی کے درجے پر پہنچ کر اپنی شعری بصیرت کا فنکارانہ ثبوت دیا ہے۔ حشمت اللہ ریاضی کے بعد اس گروہ کی سربراہی میں فاضل انصاری کی ادبی وشعری نگارشات اہمیت کی حامل ہوئی ہیں۔ حضرت ریاضی کی جانشینی اختیار کرنے کے بعد آپ نے علاقے کے نوجوان ابھرتے شاعروں کو ادبی نمائندگی کا اہل بنایا ہے، اور مبتدیوں کے کلام کی تندہی سے اصلاح کرتے ہوئے انہیں نکھارا ہے۔ اس میں اول درجے پر کلاسکی ترنم کے خوش گلو نمائندہ شاعر اختر آصف، شعری مجموعہ آزاد پرندے کے خالق اور عزیز انصاری (آکاش وانی مدھیہ پردیش بھوپال کے پروڈکشن اسسٹنٹ) کے علاوہ ایڈوکیٹ سراج انصاری، ہزل گو واحد انصاری، عبدالخالق ساگر، ندیم فاضلی (شعری مجموعہ روشنی)، زاہد وارثی، تفضیل تابش اہم نام ہیں۔ بہرحال مرحوم فاضل انصاری خالص شاعر مزاج فرد تھے۔ نیز پختہ شعور کے ساتھ شعری محاسن اور نئے ادبی نکات پر بحث وتمحیص کرنا انہیں ازحد مرغوب تھا۔ کیونکہ آپ عمیق مطالعے کے حامل سخنور تھے۔

فضل حسین صابر پیشے کے اعتبار سے ایک خطاط اور ماہر سنگتراش تھے۔ آپ نے اردو ادب کے نظمیہ ڈکشن میں قابل قدر لحاظ سے مخمس کا نظمیہ پہلو اپنایا جو روایت کی لکشمن ریکھا کی طرف داری کو نمایاں کرتا ہے۔ اس ریکھا کی حد میں رہ کر جب بار الم سے بولا جاتے ہیں تو تسکین قلب کی خاطر یوں گویا ہوتے ہیں۔

دشمن ہے آسماں اُدھر اور اِدھر زمیں
افسوس اس جہاں میں ٹھکانہ کہیں نہیں
اک جان رہ گئی ہے فقط اور کچھ نہیں
باتیں تھیں پیار کی نہ محبت کی تھی نظر
احساس نام کو نہ تھا بے حس تھے اس قدر
لیکن خدا کا شکر، یہ پیدا ہوا اثر
کل تک جو ہنستے رہتے تھے صابر کے حال پر
آج اس کی داستانِ الم سن کے رو دیے

محمد غلام حسین بہ تخلص شمیم اشرفی گردشِ آلام، معاشی فکر کی اذیت کو سہنے کے باوجود سحر دامانی کو تھامے اپنے اکہرے بدن کے ساتھ توانا شعری متاع سے دارالسرور برہان پور کے ادب میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ ان کا شعری سلسلہ شمشاد لکھنوی سے شروع ہو کر اس تاریخی ادبی شہر میں حاذق گروہ کا فروغ رساں ہوا ہے۔ اس طرح جانشین استاد فضل حسین صابر کے خواجہ تاش علامہ سید مطیع اللہ راشد کے فیضانِ سخن سے جلا پاتے رہے ہیں۔ آپ ہی کے آئینۂ سخن سے اس شہر کا نام اردو ادب کی دنیا میں عظمت کا باعث بنا ہوا ہے۔

شمیم اشرفی کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے لیکن خصوصیت کے حامل صرف چند اشخاص کے نام درج کرتا ہوں۔ جن میں عبدالباقی پیرزادہ، عبداللطیف شاہد، تسنیم انصاری، نعیم خادمی اور نئے ادبی رجحان، جدید فکر کے شاعر کلام آذر بھی شامل ہیں۔

مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر ضلع برہان پور کی اردو ادب کے لحاظ سے یہ نامکمل، تشنہ اور ایک ہی شعری صنف سے متعلق ایک ہلکی سی جھلک ہے۔

اب سے تقریباً 58-57 سال پہلے ایم عرفان صاحب نے پندرہ روزہ 'شعلۂ حیات' بھوپال (مدھیہ پردیش) کا اردو نمبر یکم اکتوبر 1964 کو شائع کیا تھا۔ یہ 142 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں تقریباً 127 صفحات بھوپال کے لیے مختص تھے، اور بقیہ 15 صفحات مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں جیسے کھنڈوہ، ساگر اور برہان پور پر نہایت قلیل معلومات تھیں۔ اس نمبر کے بعد ماہنامہ آجکل دہلی نے اگست ستمبر 1972 میں اردو نمبر شائع کیا دوسرے صوبوں کی طرح مدھیہ پردیش میں اردو موضوع پر سید قمرالحسن صاحب نے (22 تا 28 صفحاتی) مضمون لکھا۔ امید تھی کہ آنجناب کا یہ مضمون مدھیہ پردیش کے ادبی تعارف میں بھرپور ہوگا۔ کیونکہ، موصوف مرحوم ایک قابل قدر بھوپال کے صحافی تھے مگر اس مرتبہ بھی مدھیہ پردیش اپنی ادبی خدمات کے ذکر سے محروم رہ گیا۔ کچھ سال گزرنے بعد شاہد ساگری نے 'عکس کہکشاں' پیش کیا وہ بھی مدھیہ پردیش کا ادھورا ادبی تعارف تھا۔ چوتھا موقع مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو ملا۔ کثیر سرمایہ صرف کر کے اکادمی نے ایک ضخیم کتاب (984 صفحات پر مشتمل) 'مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال' شائع کی تھی جو کچھ معلومات اس میں درج ہوئیں، ان پر اکادمی نے شعوری طور سے سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی۔ اس طرح مدھیہ پردیش کا ادبی تعارف آج بھی نامکمل ہے۔

جب مدھیہ پردیش صوبے کی تشکیل نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی دو ضخیم کتابیں 'تذکرۂ گلزار' مؤلف جگن ناتھ پرساد مصر فیض (مطبع نول کشور) اور برج کرشن کول بیخبر نے 1931 میں انڈین پریس الٰہ آباد سے شائع کروائی تھیں۔ ان دونوں کتابوں کا ذکر یا حوالہ نہ ہی 'شعلۂ حیات' میں آیا اور نہ ہی 'آجکل' میں آیا۔ علاوہ اس کے اکادمی کی مطبوعہ کتاب میں بھی درج نہ ہوسکا۔ دورِ حاضر میں مدھیہ پردیش سے دو ایسے ادبی جریدے (کاروانِ ادب، بھوپال۔ انتساب، سرونج) شائع ہوتے ہیں جو یہاں کے اردو ادب کا تعارف بہ حسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

■

Bismillah Adeem Burhanpuri
Sant Kabeer Marg,
Juheriwada Mahajnapeth,
Burhanpur-450331 (M.P)
Mob.: 9630174593 ,9754242468

جن کتابوں نے متاثر کیا

ثناء اللہ صادق تیمی

یہ کہنا تو یقیناً نادرست ہوگا کہ میں نے بہت مطالعہ کیا ہے لیکن یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے کہ اپنے اساتذہ کی مفید تربیت اور کارگر رہنمائی کی وجہ سے مطالعہ کرنے کی ایک صالح عادت سی پڑ گئی، اور مختلف مرحلوں میں مختلف قسم کی کتابیں مطالعے کا حصہ بنتی رہیں۔ میری دلچسپی ادب، دینیات، سیاست اور صحافت میں رہی ہے اور میرا مطالعہ بھی زیادہ تر انہی موضوعات کے گرد گھومتا رہا ہے۔ مطالعے سے جہاں علم میں وسعت پیدا ہوتی ہے وہیں فکر ونظر کے نئے زاویے بھی روشن ہوتے ہیں اور انسان واقعی فکری ترقیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مطالعہ روح کی غذا بھی ہے اور تشنگان علوم کے لیے سب سے بہتر راستہ بھی۔ ذہین ترین لوگ بھی جب مطالعے سے رشتہ توڑ لیتے ہیں تو خود کو دہرانے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ مطالعہ ایک صاحب علم کو ہمیشہ تر و تازہ رکھتا ہے اور اس کے ذخیرۂ معلومات کے صندوقچے کو کبھی خالی نہیں ہونے دیتا۔

مطالعے کے اپنے بالکل شروعاتی مرحلے میں مجھے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی 'پاجا سراغ زندگی' نے بہت متاثر کیا۔ یہ علی میاں کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ندوہ کے نئے بچوں کے سامنے کیے تھے اور انھیں نہایت سہل اور دردمند اسلوب میں زندگی کے حقائق سمجھائے تھے۔ کسی طالب علم کو اگر ابتدائی مرحلے میں ایسی کتابیں مل جائیں تو اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ زندگی کے اس مرحلے میں علی میاں میرے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان کی کئی ساری کتابیں پڑھیں جیسے جب ایمان کی بہار آئی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، نقوش اقبال اور بھی دوسری کتابیں لیکن پاجا سراغ زندگی کا اثر گہرا رہا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی' بہت چاؤ سے پڑھی بلکہ کہنا چاہیے کہ کم کتابیں ہوں گی جنھیں ہم نے اس قدر محبت اور لطف سے پڑھا ہوگا۔ مولانا نے اپنی زندگی کے واقعات کمال ہنرمندی سے رقم کیے ہیں، مولانا کا اسلوب سادہ لیکن پرکار ہے اور تحریر کی شگفتگی اخیر اخیر تک باندھے رہتی ہے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ہم نے کافی حوصلہ لیا۔ بزرگوں کو اس لیے بھی پڑھنا چاہیے کہ وہ ہمیں مہمیز کرتے ہیں۔ ایک اقتباس آپ بھی دیکھیں "4 بجے اسکول سے چلا آ رہا ہوں۔ سہ پہر کا ناشتہ بلکہ کھانا انتظار کر رہا ہے، آتے ہی کھانے پر نہیں بلکہ آئے ہوئے اخباروں پر گرتا ہوں، انھیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں، جب کہیں کھانے کو ہاتھ لگاتا ہوں، کھاتا جاتا ہوں، اور ساتھ ساتھ آئی، ڈی، ٹی (لکھنؤ کا انگریزی روزنامہ) پڑھتا جاتا ہوں۔ ایک مثال ہوئی اسی پر قیاس دن رات کی پڑھائی کا کر لیجیے، اور پڑھائی بھی کیسی؟ اندھا دھند، نہ کافی روشنی کا دھیان، شام کا جھٹپٹا ہو یا صبح کا دھندلکا، آنکھوں پر زور دے دے کر بس پڑھے چلا جا رہا ہوں۔ اور نہ اس کی سدھ کہ پڑھتے وقت سیدھا بیٹھ جاؤں، اندھا دھند لیٹا ہوا ہوں یا چت پڑا، کہ کتاب آنکھوں کے سامنے اڑی ہوئی ہے۔

(آپ بیتی ص 105)

مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر سے کان بچپن سے آشنا تھے، ان کی کتابوں میں 'غبار خاطر' نے کافی لطف دیا۔ ویسے ہم نے 'ترجمان القرآن' بھی اس ارادے سے پڑھا کہ مولانا کے ذوق قرآنی سے مستفیض ہوں اور یقین جانیں کہ اس میں ہمیں بڑی سعادتیں حاصل ہوئیں۔ ترجمان القرآن کے مقدمے اور اس کے انتساب نے بطور خاص متاثر کیا۔ تذکرہ کا اسلوب ہر چند کہ بلند آہنگ نظر آتا ہے لیکن اس کے مباحث کی گہرائی اور ایک خاص طرز فکر و عمل کی کارفرمائی نے کتاب کو ہمارے لیے کافی دلچسپ بنائے رکھا۔ احمد بن حنبل، ابن تیمیہ اور شاہ اسماعیل کی زندگی اور کارناموں کو مولانا آزاد کے گہربار قلم نے جس طرح پیش کیا ہے اس پر دیر تک سر دھنتا رہا۔ تذکرہ کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جنھیں ہم نے کئی کئی بار پڑھا اور ہر بار ایک نئے لطف کی کیفیت رہی۔ مولانا کی زندگی سے دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' بار بار پڑھی، ان کی 'انڈیا ونس فریڈم' بھی اسی دھن اور لگن سے پڑھی البتہ ان پر لکھی گئی کتابوں میں عبدالرزاق ملیح آبادی کی 'ذکر آزاد' نے بہت متاثر کیا۔ ملیح آبادی کا بے تکلف اسلوب اور قلم برداشتہ لکھنے کی صلاحیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد کے فکر و فن پر لکھی گئی کتابوں میں

ملک زادہ منظور احمد کی 'مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن' نے متاثر کیا۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب نے مولانا آزاد کے فکر وفن کا اچھا جائزہ لیا ہے اور بہت حد تک مولانا کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی یوں تو کئی کتابیں مطالعے میں آئیں لیکن سب سے زیادہ 'خطبات مدراس' نے متاثر کیا۔ سید صاحب نے چند خطبات میں رسول اللہ کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو جس جامعیت سے بیان کر دیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے۔ اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ کم کم ہی کوئی مجموعہ سامنے آتا ہے۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی جائے تو مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی 'الرحیق المختوم' سے بھی کافی متاثر ہوا۔ مولانا نے جہاں کوشش کی ہے کہ سیرت کے بیان میں حقائق کا التزام رکھا جائے وہیں ان کا اسلوب علمی ہونے کے باوجود کافی دلچسپ، پرکشش اور سلیس ہے۔ مجھے قاضی سلیمان منصور پوری کی 'رحمت للعالمین' نے بھی متاثر کیا لیکن اس سے استفادے کے لیے آدمی کے اندر ایک خاص معیار ہونا چاہیے کیونکہ مصنف نے بہت تحقیق وتفتیش سے کام لیا ہے اور ایک جامع سیرت مرتب کی ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری کا مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' زمانے تک میرے سرہانے رہا۔ کلیم صاحب کی شاعری نے تو متاثر کیا ہی، اس سے کسی درجہ کم ان کی نثر نے متاثر نہیں کیا۔ اس کتاب کا مقدمہ ہو یا پھر ان کی دوسری نثری کتابیں میری نظر میں بہترین نثر کا درجہ رکھتی ہیں جیسے 'ابھی سن لو مجھ سے'، 'پہلو نہ دکھے گا تو گوارا نہیں ہوگا' وغیرہ۔

کلیات اقبال سے ایک روحانی سا تعلق رہا ہے، اس کی بہت سی نظمیں، غزلیں اور اشعار یاد ہیں، دیوان غالب کا حال بھی کلیات اقبال سے کچھ الگ نہیں۔ یہ دونوں شعری سرمایے میرے لیے ہمہ وقتی توشے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ اردو کے نثری سرمایوں میں خطوط غالب نے کافی متاثر کیا ہے۔ غالب نے تب جس قسم کی نثر کا نمونہ پیش کیا وہ اپنے آپ میں کسی معجزے سے کم نہیں لگتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ آدمی اپنے وقت سے آگے تھا۔ غالب نے کہا بھی تو ہے۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

شبلی نعمانی اپنی علمی وفکری بوقلمونی کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب کی روانی اور شگفتگی سے متاثر کرتے ہیں۔ شبلی کی 'الفاروق' اور 'سفرنامہ روم ومصر وشام' نے خاصا متاثر کیا۔ البتہ ان کے مقالات کا اثر زیادہ گہرا رہا خاص طور سے اس حصے کا جس کا تعلق ادب سے ہے۔

جوش کی 'یادوں کی بارات' نے یہ سکھایا کہ باتیں کیسے دلچسپ بنائی جاتی ہیں اور الفاظ کیسے برتے جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں 'گنجہائے گراں مایہ' اور 'آشفتہ بیانی میری' نے خاصا متاثر کیا۔ ندا فاضلی کی شاعری نے بھی اپنی طرف کھینچا لیکن اس کی نثر نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ ندا کی کتابوں میں 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باہر' زندگی کو جس طرح سامنے لاکر رکھ دیتی ہے، اس کا جواب نہیں۔ یہاں مجھے دو اور شاعروں کا ذکر کرنا چاہیے جن کی شاعری سے بڑھ کر ان کی نثر نے مجھے متاثر کیا۔ جون ایلیا کے مجموعہ کلام 'شاید' کا دیباچہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی شاعری چونکاتی ہے لیکن ان کی نثر نے نہ صرف یہ کہ سوچنے پر مجبور کیا بلکہ یہ راز کھولا کہ وہ کتنے بڑے عالم تھے اور زبان وبیان کے ساتھ علوم وفنون پر ان کو کیسی دسترس حاصل تھی۔ مجھے عصر حاضر کے مقبول عام شاعر منور رانا اپنی شاعری سے کچھ اتنا متاثر نہیں کرتے لیکن ان کی نثر میں ایک تازگی اور جدت کا احساس ہوتا ہے۔ 'بغیر نقشے کا مکان' اور 'چہرے یاد رہتے ہیں' اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ ان کے یہاں تشبیہات واستعارات کا نظام زیادہ تر سامنے کی محسوس چیزوں پر استوار ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور ہمیں تحیر آمیز فرحت وانبساط سے نوازتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں اور بطور خاص ان کے خاکوں میں مجھے ہمیشہ ایک دوسری قسم کی لذت محسوس ہوئی ہے، وہ جس خوبی اور ظرافت سے شخصیت کی خوبی وخامی کو بیان کر جاتے ہیں اور ایک مکمل نقشہ کھینچ دیتے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہے۔ 'آدمی نامہ' اور 'سو ہے وہ بھی آدمی' اس سلسلے کی میری پسندیدہ کتابیں ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا یہ کمال ہے کہ وہ خامیوں کو بیان کرتے ہوئے بھی شخصیت کو پڑھنے والے کی نگاہ میں گرنے نہیں دیتے، ان شخصیات کی خامیاں اس طرح سامنے آتی ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان خامیوں سے مل کر ہی تو انسان انسان بنتا ہے۔

شیخ محمد اکرام کی 'آب کوثر'، 'رود کوثر' اور 'موج کوثر' میری بہت ہی پسندیدہ کتابیں ہیں، میں نے جن کتابوں کو پڑھتے ہوئے قوت اور لذت دونوں بیک وقت محسوس کی ان میں یہ تینوں کتابیں سرفہرست ہیں۔ مجھے ان تین کتابوں کو پڑھتے ہوئے وہی لذت محسوس ہوئی جو عربی ادیب ومصنف احمد امین کی فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی۔ یہ کتابیں ماضی کی علمی تاریخ کے ساتھ ساتھ متوازن تجزیے کی بہترین مثالیں ہیں۔

اردو کے تنقیدی سرمایے میں مجھے احتشام حسین کی 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' اور کلیم الدین احمد کی 'اردو شاعری پر ایک نظر' نے متاثر کیا۔ کلیم الدین احمد تو اپنے دوٹوک انداز کی وجہ سے پسند آئے کہ وہ کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے اور سیدھے طریقے سے فیصلہ کن انداز میں اپنی رائے رکھ دیتے ہیں، ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا تنقیدی انداز متاثر کرتا ہے۔ احتشام حسین کے علمی اسلوب میں تجزیاتی بصیرت متاثر کرتی ہے۔

سعادت حسن منٹو کو دنیا ان کے افسانوں کی وجہ سے یاد کرتی ہے۔ یہ سچ بھی ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ خود مجھے ان کے کئی افسانے بہت پسند ہیں جیسے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو اور 'کالی شلوار' لیکن میں ذاتی طور پر ان کی دو کتابوں سے خاص طور پر متاثر ہوں اور وہ کتابیں ہیں۔ 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر'۔ یہ مختلف شخصیات پر لکھے گئے ان کے خاکے ہیں اور کیا کمال کے خاکے ہیں۔ ان میں بطور خاص تین گولے، اشوک کمار، عصمت چغتائی اور 'چراغ حسن حسرت' پر لکھے گئے خاکے بھلائے نہیں جاسکتے۔ منٹو واقعی جادو نگار قلم کا مالک ہے۔

اردو ناولوں کی بات کروں تو ان کے مطالعے کی عادت ڈپٹی نذیر احمد کے 'توبۃ النصوح' سے لگی اور مجھے کہنا چاہیے کہ اس وقت اس ناول نے میرے ذہن ودماغ پر اچھا خاصا اثر ڈالا۔ سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ ناول میں نے تب پڑھا تھا جب میں جے این یو میں تھا اور بہت ساری چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ میں بغیر کسی تردد کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس ناول نے ہفتوں میرے ذہن پر قبضہ جمائے رکھا اور میں اسی کے ساتھ جینے پر مجبور رہا۔ 'شیلا گرین' کا کردار میرے ذہن سے تادیر چپکا رہا۔

اسی زمانے میں میں نے کئی ناول پڑھے، ان میں عصمت کا 'ٹیڑھی لکیر'، عزیز احمد کا 'گریز' اور کرشن چندر کا 'شکست' ان ناولوں نے مختلف وجوہات کی بنیاد پر متاثر کیا اور یہ سمجھ میں آیا کہ نفسیاتی الجھنیں کس طرح سلجھائی جاتی ہیں اور بعض ان مسائل کو تخلیق کار کس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جن کا بیان کرنا آسان نہیں۔

کتابیں تو اور بھی پسند آئیں اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا لیکن مذکورہ کتابیں وہ ہیں جنھوں نے بطور خاص اپنے دیرپا اثرات چھوڑے اور کسی نہ کسی زاویے سے متاثر کیا۔

■

Sanaullah Sadiq Taimi
Simultaneous Interpreter
Haram Makki, Makka AlMukarrama
Kingdom of Saudi Arabia

سنیما
فریب نظر یا فریب حقیقت

محمد شاہد حسین

سنیما ایک عوامی ذریعہ ابلاغ ہے جس کا حلقہ وسیع سے وسیع تر اور جس کا اثر شدید دیرپا ہے۔ اس میں ایک سادی سی چادر، روشنی اور سائے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، پھر بھی اس بے وقعت سے مثلث نے پوری دنیا کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ اس کی مقبولیت اور دلکشی پہلی نمائش سے عصر حاضر تک جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ وقت نے نہ جانے کتنے تہذیبی و ثقافتی وسیلوں کو زیر وزبر کیا لیکن سنیما کی دلکشی اور مقبولیت کا دائرہ دریائے ناپیدا کنار کے مانند برقرار ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی قصہ یا واقعہ صرف پڑھا یا سنا ہی نہیں جاتا بلکہ وقوع پذیر ہوتا ہوا دیکھا بھی جاتا ہے اور دیکھا ہوا سنے یا پڑھے ہوئے سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

سنیما ایک ایسا ذریعہ ترسیل ہے جو تصویر اور آواز کے ذریعے ترسیل کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ میڈیا دیکھنے اور سننے کا میڈیم ہے۔ کہانی فلم میں بھی ہوتی ہے اور ناول میں بھی، ناول کو پڑھ کر کہانی کی تفہیم ہوتی ہے لیکن فلم کو پڑھا نہیں جا سکتا اس کی تفہیم صرف دیکھ کر اور سن کر ہوتی ہے۔

سنیما میں بنیادی مسئلہ تصویروں کے حرکت کرنے کا تھا۔ پردے پر حرکت ہوتی تصویریں قطعاً حرکت نہیں کرتی ہیں، یہ فریب نظر ہے کہ وہ حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ رنگین، کالی یا سفید (ٹرانسپیرنٹ) فلم کی پٹی پر ساکت تصویروں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ہر تصویر میں تھوڑا تھوڑا فرق ہوتا ہے یعنی ایک تصویر میں ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے تو دوسری تصویر میں تھوڑا اور آگے بڑھا ہوا ہے۔ یہ تکنیک اگلی تمام تصویروں میں برقرار رہتی ہے۔ پروجیکٹر ایک کے بعد دوسری تصویر کو چوبیس تصویر فی سکینڈ (جسے ایک فریم کہا جاتا ہے) کی رفتار سے پردے پر پھینکتا ہے تو یہ تصور ابھرتا ہے کہ تصویریں حرکت کر رہی ہیں۔

فلم کا کیمرہ فلم کی ایک لمبی پٹی پر فی سکینڈ چوبیس تصویریں اتارتا ہے۔ ہر فریم پر تصویر اترنے کے بعد فلم کی لمبی پٹی اپنے آپ کھسکتی رہتی ہے چونکہ فلم کا کیمرہ اسی رفتار سے منظرکشی کرتا ہے جس رفتار سے پروجیکٹر چلتا ہے۔ اس لیے تصویر کا سلسلہ یکساں رفتار سے ظاہر اور غائب ہوتا رہتا ہے۔ یہ رفتار کافی تیز ہوتی ہے اسی لیے تصویر متحرک نظر آتی ہے۔ حقیقی تصویر ایک ڈاک ٹکٹ سے ذرا بڑی ہوتی ہے۔ مگر جب ان کا عکس پردے پر پھینکا جاتا ہے تو یہ کئی سو گنا بڑی نظر آنے لگتی ہے۔ ان تصویروں کا عکس دکھانے کے لیے سنیما آپریٹر کے کیبن سے روشنی کی ایک طاقتور شعاع پردے پر پھینکی جاتی ہے۔

تصویر متحرک ہوجانے کے بعد دوسرا مسئلہ آواز کا تھا۔ ابتدا میں متحرک فلمیں خاموش ہوا کرتی تھیں۔ نیچے ان کے ٹائٹل لکھے ہوئے آجاتے تھے۔ چند سازوں پر مشتمل آرکسٹرا دھنیں بجاتا رہتا تھا۔ لیکن صحیح معنوں میں فلمیں فردوس گوش اس وقت بنیں جب آواز کو فلم میں فوٹوگرافی کی شکل میں ہی ریکارڈ کیا جانے لگا اور یہ اس وقت ممکن ہوا جب فلم کی پٹی کے بائیں کنارے ساؤنڈ ٹریک بھی پرنٹ ہونے لگا۔

تصویر کے متحرک ہوجانے اور آواز کو اس میں داخل کردینے سے ہی فلم مکمل نہیں ہوجاتی بلکہ اسے مکمل کرنے کے لیے بہت سے پیچیدہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے جیسے اسکرپٹ لکھنا، مکالمے لکھنا، اداکاری، ڈائریکشن، ساؤنڈ ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ وغیرہ۔ اس میں سب سے پہلا مرحلہ ہوتا ہے اسکرپٹ نگاری کا۔ فلم یا ٹیلی ویژن کے لیے جو بھی پروگرام بنایا جاتا ہے خواہ وہ تیس سکینڈ کا ہی کیوں نہ ہو اس کے لیے پہلے اسکرپٹ تیار کی جاتی ہے۔ بغیر اسکرپٹ کے کوئی بھی پروگرام آگے کے مرحلے سے نہیں گزر سکتا۔ لہٰذا اسکرپٹ کسی پروگرام کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے اسکرپٹ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سنیما داستان گو کی طرح ہزاروں لوگوں کو کہانی سنانے کا جدید ترین طریقہ ہے۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے کسی کہانی کار کو کہانی سوچنی پڑتی ہے۔ پھر کہانی کار پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کو کہانی سناتا ہے جو اسے فلمانے کے امکانات پر غور کرتے ہیں اور خاص طور سے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کیا یہ کہانی ناظرین کو پسند آئے گی۔ اگر وہ کہانی فلمانے پر راضی ہوجاتے ہیں تو کہانی کار اسکرپٹ تیار کرنا شروع کرتا ہے۔ اسکرپٹ اسکرین پلے کی شکل میں لکھی جاتی ہے۔ اسکرین پلے کی ہیئت ڈرامے کی سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اسٹیج کی نہیں بلکہ پردۂ سیمیں کی ضروریات کو ذہن میں رکھ کر لکھا جاتا ہے یعنی مناظر کے تسلسل کو ذہن میں رکھا جاتا ہے۔

اسکرپٹ لکھنے سے پہلے اسکرپٹ نگار کو اپنے موضوع پر ریسرچ کر لینا چاہیے۔ ریسرچ کے ذریعے اسکرپٹ سے متعلق بنیادی معلومات اکٹھا کی جاتی ہیں۔ اچھی طرح ریسرچ کر لینے کے بعد اسکرپٹ لکھنا آسان ہوجاتا ہے۔ تخلیقیت پیدا ہوتی ہے اور اس سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ بغیر ریسرچ کے اسکرپٹ لکھنا اکثر ذہن پر بار ہو جاتا ہے۔ جلد اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک فرحت بخش تخلیقی عمل ہونے کے بجائے ایک پریشان کن مرحلہ ہوجاتا ہے۔ ان تمام چیزوں سے بچنے کے لیے ریسرچ کے دوران دو قسم کی معلومات اکٹھا کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پروگرام کو کس طرح ترتیب دیں۔ دوسرے موضوع کے بارے میں مکمل معلومات۔

کسی منصوبے یا تجویز کو آگے بڑھانے سے پہلے

اسکرپٹ نگار کے ذہن میں یہ بات صاف رہنی چاہیے کہ پرنٹ میڈیا اور ویژول میڈیا میں بنیادی فرق ہوتا ہے اور یہ فرق بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہنا مختلف ہے دکھانے سے۔ جب آپ کچھ کہتے یا لکھتے ہیں تو الفاظ کے ذریعے موضوع کی صراحت کرتے ہیں اس میں ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو سننے والے یا پڑھنے والے کے ذہن میں وہی تصور پیدا کرے جو آپ ترسیل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس طریقہ کار میں الفاظ کا استعمال فن کارانہ طریقے سے کیا جاتا ہے جو پڑھنے یا سننے والے کے تخیل کو متحرک کر دیں۔ لیکن جب اسکرپٹ نگار فلم یا ٹیلی ویژن کے لیے کچھ لکھتا ہے تو کہنے پر کم توجہ دیتا ہے بہ نسبت دکھانے کے۔ گو کہ یہاں بھی الفاظ کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔ لیکن یہ اہمیت فنی کے بجائے تکنیکی ہوتی ہے۔ یہاں پیغام کی ترسیل آواز اور تصویر سے ہوتی ہے مگر پڑھنے والے کو نہیں بلکہ دیکھنے والے کو۔ یہاں اسکرپٹ نگار کے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سے الفاظ استعمال کرے بلکہ اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کون سی تصویر تخلیق کرے۔ چنانچہ اسکرپٹ نگار کو چاہیے کہ وہ جو منصوبہ تیار کر رہا ہے پہلے اسے متحرک تصویروں کے ذریعے اپنے دماغ میں ترتیب دے۔ بلکہ اسے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے کہنے کے بجائے دکھانے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔

اسکرپٹ نگار کو مکالمے اور بیانیہ لکھنے میں بھی مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ گو کہ ٹیلی ویژن اور فلم میں مکالمے اور بیانیہ کی اولین اہمیت نہیں ہوتی کیونکہ ان میں اکثر اجسام کو پیش کر دینا کافی ہوتا ہے۔ انھیں بیان نہ بھی کیا جائے تو صورت حال مکمل ہو جاتی ہے اور پلاٹ آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر بھی مکالمے اور بیانیے کے بغیر کسی منصوبے کا مکمل ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بیانیے اور مکالمے کے خوبصورت الفاظ اور الفاظ کی بہترین ترتیب سے پیدا ہوئی غنائیت پھر انھیں ادا کرنے میں آواز کا زیر و بم، لہجے کی شیرینی اور گداز کسی منصوبے یا تجویز کو مؤثر اور پرکشش بناتے ہیں۔ یہ کرداروں کی شخصیت کو استحکام بخشتے ہیں۔ الفاظ کرداروں کے اندر زندگی پیدا کرتے اور انھیں متحرک بناتے ہیں۔ الفاظ ہی سے کسی رول میں اصلیت و واقعیت پیدا ہوتی ہے۔

اسکرپٹ مکمل ہو جانے کے بعد اسکرپٹ نگار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر اسے بلا لیا جاتا ہے۔ اب یہاں سے ڈائریکٹر کا کام شروع ہوتا ہے اور ساری توجہ اسکرپٹ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہیں ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ مل کر وہ سارے انتظامات کرتے اور ان تمام ساز و سامان کا بندوبست کرتے ہیں جو شوٹنگ کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہیں پورے پروڈکشن کا طریقہ کار اور پروگرام طے ہوتا ہے۔ اسکرپٹ میں جتنے کردار ہوتے ہیں اسی لحاظ سے ان کا انتخاب اور ان سے معاہدہ ہوتا ہے۔ اسکرپٹ میں دیے گئے مقامات یا سین کی مناسبت سے مقام کا انتخاب کر کے ان کا معائنہ کیا جاتا ہے کہ کیا وہ پروڈکشن کی ضروریات کے لیے مناسب ہیں۔ کیا یہاں پروڈکشن میں استعمال ہونے والے آلات کو استعمال کیا جا سکے گا اور پروڈکشن ٹیم کی ذاتی ضروریات کی چیزیں فراہم ہو سکیں گی۔ اگر اسکرپٹ کسی عالیشان سیٹ کی مانگ کرتی ہے تو تفصیلات کے مطابق اسے بنایا، سجایا اور سنوارا جاتا ہے۔ اسکرپٹ نگار جہاں جزئیات کو مکمل کرنے کی تاکید کر دیتا ہے وہاں صرفے اور وقت پر دھیان دیے بغیر جزئیات کو مکمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تمام تیاریاں مکمل کر لینے کے بعد شوٹنگ کا کام شروع ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کم سے کم وقت میں شوٹنگ مکمل ہو جائے کیونکہ یہ بہت مہنگا اور گنجلک کام ہوتا ہے۔

شوٹنگ کے لیے عموماً تین سے سات لوگوں کے عملے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہوتے ہیں۔

1 ڈائریکٹر۔ اس شخص پر اسکرپٹ کو فلم، ویڈیو یا آڈیو ٹیپ پر منتقل کرنے کی ذمے داری ہوتی ہے۔
2 اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔ اس پر کام کا کافی بوجھ ہوتا ہے کیونکہ یہ ڈائریکٹر کا دست راست ہوتا ہے۔
3 کیمرہ آپریٹر اور لائٹنگ ڈائریکٹر۔ یہ کیمرے کو استعمال کرتا اور روشنی کا انتظام کرتا ہے۔
4 ساؤنڈ انجینئر۔ یہ فرد آواز کو ریکارڈ کرنے کی ذمے داری نبھاتا ہے۔
5 گوفر۔ یہ لائٹ ڈائریکٹر کا پہلا نائب ہوتا ہے۔
6 گرپ۔ یہ عام لیبر اسسٹنٹ ہوتا ہے۔
7 پروڈکشن اسسٹنٹ۔ یہ پروگرام کا عام اسسٹنٹ ہوتا ہے جو عام انتظامات میں مدد کرتا ہے۔

اسکرپٹ کی شوٹنگ مکمل کرنے کے لیے ان لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت وقت صرف کرنا ہوتا ہے۔ فلم میں ڈائریکٹر کی حیثیت ایک جہاز کے کپتان کی سی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاز کو کس سمت میں لے جانا ہے۔ عموماً ڈائریکٹر فلم کو اس سمت میں لے جاتا ہے جو اس نے فلم کے اسکرپٹ نگار کے مشورے سے طے کیا ہوتا ہے۔

شوٹنگ مکمل ہو جانے کے بعد ایڈیٹر کی باری آتی ہے۔ وہ شوٹنگ کی ہوئی فلم کی ایڈیٹنگ کرتا ہے۔ ایڈیٹنگ کا کام مرصع سازی سے کم نہیں۔ سونے کا ڈلا خواہ کتنا ہی قیمتی ہو نہ اس میں کوئی حسن ہوگا نہ اسے استعمال کیا جا سکے گا جب تک مرصع ساز اسے تراش خراش کر نگینوں کو جڑ کر اسے زیور کی شکل نہ دے دے۔ کچھ یہی صورت حال شوٹنگ کی ہوئی فلم یا ٹیپ کی ہوتی ہے۔ ایڈیٹر زائد چیزوں کو کاٹ چھانٹ کر الگ کرتا ہے۔ مختلف چیزوں کو جوڑ کر ربط و تسلسل پیدا کرتا ہے۔ کسی چیز کو ایک مقام سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھتا ہے۔ دو تین زاویے سے لیے گئے شاٹ کا موازنہ کر کے سب سے مناسب شاٹ کا انتخاب کرتا ہے۔ اس طرح ایڈیٹر خام مال کو تیار مال میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کے لیے ایڈیٹر اسکرپٹ کی اس ماسٹر کاپی کو اپنے ساتھ رکھتا ہے جس پر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یا پروڈکشن اسسٹنٹ نے نوٹ لکھے ہوتے ہیں۔ اگر فلم میں ڈائریکٹر کی حیثیت جہاز کے کپتان کی ہوتی ہے تو ایڈیٹر جہاز کا انجینئر ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پروجیکٹر اور کیمرہ وغیرہ سائنس دانوں نے ایجاد کیا۔ لیکن اس کو استعمال کرنے اور اس سے ایک نئے فن کو جنم دینے کا سہرا کچھ جدت پسند اور تیز قوت متخیلہ رکھنے والے پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں اور تکنیشیوں کے سر جاتا ہے۔

متحرک تصویریں سائنس دانوں کے لیے ایک کھلونا تھیں لیکن فن کاروں نے اپنی ذکاوت اور گہری بصیرت سے اسے تحریک دے کر عوام کے لیے الہام بنا دیا، کیونکہ ان کے ذریعے حقیقی زندگی کے خد و خال اور مناظر فطرت کے ہو بہو نقشے پیش کیے جانے لگے۔ جب سنیما نے پھلنا پھولنا شروع کیا اس وقت تھیٹر خصوصاً یورپی تھیٹر اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو کو اسٹیج پر پیش کر رہا تھا۔ فلم کا مقابلہ کرنے کے لیے تھیٹر والوں نے بہت ہاتھ پیر مارا، اسٹیج پر پورا پورا جہاز بنا دیا، بازار لگا دیے، مختلف قسم کی دکانیں سجا دیں لیکن وہ فلم کے ایک کلوز اپ کا جواب پیش نہ کر سکے مثلاً موت کی سزا کا منظر تھیٹر میں صاف طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مقتل میں مجرم کا سر جلاد کے سامنے جھکا دیا جاتا اور پردہ گر جاتا۔ لیکن فلم میں ایسا نہیں ہوتا۔ سر نیچے ہوا، جلاد کی تلوار چمکی اور سر لڑھکتا ہوا دور جا پڑا۔ فلم کی اسی ساحرانہ پیش کش اور فریب حقیقت نے عوام پر جادو کر دیا اور وہ اس کے دیوانے ہو گئے۔

ابتدا میں تصویر ساکت سے متحرک ہوئی تو یہی بہت

بڑا عجوبہ تھا۔ ابتدائی فلموں میں نہ کوئی واقعہ ہوتا تھا نہ کہانی، لیکن یہی دیکھنے کے لیے لوگ ٹوٹ پڑتے تھے کہ ریل پردے پر کیسے دوڑ رہی ہے۔ ہر چیز کا فطری عمل کیسے ہو رہا ہے۔ متکلم فلموں کی ابتدا ہونے پر جب ہر چیز اپنے فطری عمل کے ساتھ ساتھ فطری آوازیں بھی نکالنے لگی، ریل سیٹی بجانے، جہاز گڑگڑانے اور انسان ہنسنے، رونے اور چیخنے چلانے لگا تو تعجب اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔

سوال یہ بھی ہے کہ فلم کے آغاز کی محرک کیا چیزیں ہیں۔ دراصل خوب سے خوب تر کی تلاش انسانی ذہن کا خاصہ ہے۔ یہی جذبہ تمام ایجادات کا محرک ہے۔ بہرحال سنیما کے آغاز کے محرک میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش کو بروئے کار لانے کا جذبہ، مالی فائدہ حاصل کرنے کی سعی، تفریح فراہم کرانا اور ترسیل کا ایک نیا ذریعہ حاصل کرنا شامل تھا۔

اس ضمن میں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ سنیما ایک ایسا ذریعہ ترسیل ہے جس میں اطلاعات، تفریحات اور ہدایات شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ فلم بڑے پیمانے پر تفریح فراہم کرتی ہے لیکن تفریح تفریح میں یہ بہت سی اہم باتیں بھی ترسیل کر دیتی ہے۔ پھر سماج کو صحت مند تفریح فراہم کرنا بھی تو کچھ کم اہم نہیں۔

مزید یہ کہ فلم تعلیم و تدریس کا بھی ذریعہ ہے۔ کسی نہ کسی قسم کی تعلیم ہر فلم سے ملتی ہے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی، زیادہ تر تعلیمی فلموں کا مقصد ہوتا ہے پرسوئیڈ کرنا۔ فلم تہذیبی و ثقافتی تعلیم کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ پھر یہ کہ فلم کسی شے کے حسن کو اس سے بھی بہتر انداز میں پیش کر سکتی ہے جیسی کہ حقیقتاً وہ ہے۔ جس کے لیے ہزاروں الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلم کیمرہ اسے ایک جھلک یا ایک شارٹ میں پیش کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی فلم کیمرہ ہمیں وہ بھی دکھا دیتا ہے، جس کو بیان کرنے سے الفاظ قاصر رہتے ہیں، البتہ فلم کیمرہ ایک چیز نہیں دکھا سکتا کہ انسان کیا سوچ رہا ہے۔

ابتدا میں سنجیدہ فکر رکھنے والے کچھ نقادوں نے فلم کو آرٹ تسلیم ہی نہیں کیا۔ کسی فلم کو تیار کرنے کے لیے تین طاقتیں مل کر کام کرتی ہیں: موجد، فن کار (ہدایت کار) اور سرمایہ دار۔ آپس میں ان کا تعلق روح اور جسم کا ہے۔ ان تینوں نے مل کر فلم کی صورت میں بیسویں صدی کے سب سے بڑے عوامی آرٹ کو جنم دیا۔ اگر عوام اس آرٹ اور اس کے تفریحی پہلو سے مطمئن نہ ہوتے تو یہ آرٹ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔

اس مسحور کن اور مقبول ترین ذریعہ ابلاغ کی ابتدا 28 دسمبر 1895 کو لومیئر برادرس نے سنیما آٹوگرافی کے ذریعہ پیرس کے گرانٹ کیفے کے بیسمنٹ میں کی اور اس خوف سے کہ ان کی اس ایجاد کی ندرت ختم نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں مصروف ان کے مدمقابل ایسی ہی کوئی چیز لے کر میدان میں نہ آ جائیں۔ انھوں نے جلد سے جلد دولت و شہرت حاصل کر لینے کا منصوبہ بنایا۔ لہٰذا پیرس کی نمائش کے فوراً بعد لومیئر برادرس نے ایجنٹوں کی ایک ٹیم سنیما آٹوگرافی کے ساتھ اہم ممالک کے مختلف مراکز میں نمائش کی غرض سے بھیجی۔ ان ایجنٹوں کو یہ سخت ہدایت تھی کہ وہ اس مشین کا راز کسی پر منکشف نہ کریں خواہ وہ بادشاہ ہو یا خوبصورت عورت۔

لومیئر کی ٹیم میں دو گروہ ہوتے تھے۔ ایک گروہ کیمرے کے ذریعے نمائش کے لیے نیا نیا مواد تیار کرتا تھا، دوسرا گروہ سنیما آٹوگرافی کے ذریعے فلم کی نمائش کر کے دولت اکٹھا کرتا تھا۔ لومیئر برادرس کی ایسی ہی ایک ٹیم نے Felicien Trewey کی سربراہی میں (جو کہ لومیئر برادرس کا دوست تھا) 20 فروری 1896 کو لندن میں اپنا شو کرنا شروع کیا۔ پہلے اس کا شو آنجہانی پالوٹکنیک میں شروع ہوا پھر امپائر تھیٹر میں منتقل ہو گیا۔ لومیئر برادرس کی ایک اور ٹیم نے سنٹ پیٹر برگ میں اسی سال 17 مئی سے فلم دکھانا شروع کیا۔

ہندوستان میں بھی لومیئر برادرس کی ایک ٹیم نے 7 جولائی 1896 کو بمبئی کے واٹسن ہوٹل کے ہال میں فلم دکھانے کی ابتدا کی لیکن 14 جولائی سے ناولٹی تھیٹر میں منتقل ہو گئے۔ ناولٹی تھیٹر میں صرف تین دن کے شو کا اعلان ہوا تھا لیکن برسات کے باوجود تیرہ دن تک چلتا رہا۔ اس گروپ کے پاس چوبیس فلمیں تھیں جس میں 'دی سرپنٹ'، 'ارائیول آف اے ٹرین'، 'لندن گرل ڈانسر' اور 'واٹرنگ دی گارڈن' شامل تھیں۔ ان ابتدائی فلموں میں صرف چند مناظر ہوا کرتے تھے۔

ہندوستان میں پہلے سے ہی پارسی تھیٹر کے توسط سے تجارتی تھیٹر کی مستحکم روایت قائم تھی۔ لہٰذا ہندوستانیوں کا ان فلموں سے متاثر ہونا فطری تھا۔ اس سلسلے میں سکھا رام بھاٹوڈیکر کو سبقت حاصل ہے۔ وہ پہلے ہی سے فوٹوگرافی کے پیشے میں تھے۔ لومیئر برادرس کی فلموں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لندن سے مووی کیمرہ و پروجیکٹر منگایا اور گھوم گھوم کر کھلی جگہوں پر باہر سے درآمد کی ہوئی فلموں کی نمائش کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے کیمرے سے بمبئی کے ہینگنگ گارڈن کی ایک کشتی کے مقابلے کو فلمایا اور لندن بھیج کر اس کی پروسیسنگ کروائی۔ ان کا دوسرا موضوع سرکس کے بندروں کی ٹریننگ تھا۔ اس کے علاوہ آر۔ پی پرانجپئے کیمبرج سے ریاضی میں امتیازی نمبر حاصل کر کے لوٹے تو ان کے استقبالیہ جشن کو بھی انھوں نے فلمایا۔ 1903 میں سکھا رام نے Edward VII کی تاج پوشی کی رسم کے جشن کو بھی فلمایا اور بہت شان و شوکت کے ساتھ پیش کیا۔ لہٰذا ان کا شمار پہلے راہ نما نمائش کرنے والوں میں ہونے لگا۔ ان کی کامیابی کے پیش نظر دوسرے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ امریکہ اور یورپ سے آنے والے مشن فلم پروجیکٹر وغیرہ اپنے ساتھ لانے لگے اور باہر سے درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں بھی بڑے پیمانے پر فلمیں بننے لگیں۔ مگر سنیما کی تاریخ لکھنے والے امریکن اور یورپین مصنفین نے ایشیا خصوصاً ہندوستان کو بری طرح نظرانداز کر دیا۔

اس اختصار کی تفصیل یہ ہے کہ Bradech and Brasillach نے اپنی کتاب 'ہسٹری آف موشن پکچر' (1935) میں جاپانی سنیما پر چار اور ہندستانی سنیما پر صرف ایک پیراگراف لکھا۔ Rotha نے اپنی کتاب 'دی فلم ٹل ناؤ' (1930-1951) میں جاپان کو چار اور ہندستان کو صرف ایک پیراگراف دیا۔ Knight نے اپنی کتاب 'دی لائیولی اسارٹ' میں جاپان کو پانچ صفحے اور ہندستان کو دو جملے دیے۔ جبکہ ہندستان اس وقت پوری دنیا میں متحرک فلمیں بنانے میں دوسرے نمبر پر تھا۔ 'انڈین فلم' کے مصنفین نے اس کی فہرست اس طرح دی ہے:

جاپان	پورے سال میں	516
ہندستان	؍؍	292
امریکہ	؍؍	288
ہانگ کانگ	؍؍	240
اٹلی	؍؍	137
روس	؍؍	130
فرانس	؍؍	126
برطانیہ	؍؍	121

لیکن جب ستیہ جیت رے اور آپراجیتو کی فلموں نے عالمی پیمانے کے بڑے بڑے ایوارڈ جیتے تو پھر کسی تاریخ نویس کے لیے ہندستان کو نظرانداز کرنا مشکل ہو گیا۔

1947 کے بعد ہندستانی سنیما مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرتا رہا۔ کبھی ٹیکس کا بوجھ بڑھا، کبھی سینسر کا شکنجہ کسا مگر کوئی بھی چیز اس کی ترقی میں حائل نہ ہو سکی، آج بھی یہ عوامی تفریح کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔

■

Prof. Mohd Shahid Husain
603/7, Shahjahanabad Apt
Sector-11, Plot.: 1, Dwarika
New Delhi- 110075
Mob-9891673443
Email-mshusain.jnu@gmail.com

اردو اور ہندوستانی سنیما

شکیل احمد خان

اردو، ہندوستان کے مزاج اور خمیر میں شامل ہے۔ اردو اخوت و محبت کی زبان ہے اور اتحاد و اتفاق کی علامت بھی، وطن دوستی، وطن پرستی، مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی، اس کا ادب، اس کی شاعری اسی کی ترجمان ہے۔ اس میں ہندوستان کی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، معاشی و معاشرتی، اخلاقی و اقداری، اقتصادی و ثقافتی، مذہبی و ملّی، قومی و وطنی وغیرہ جیسے عناصر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اردو زبان صرف فلموں میں ہی نہیں بلکہ الیکٹرانک، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں ایک بہت بڑا سانحہ پیش آیا، تقسیم وطن کا، لیکن اس فرقہ وارانہ تقسیم نے ہندوستانی سنیما اور اردو زبان کو بہت زیادہ متاثر نہیں کیا۔ بلکہ اردو نے تو اپنی ہندوستانیت کو ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، یہ زبان تو ہندوستانی مشترکہ تہذیب و تمدن کے آب و گل کی خوشبو سے ہندوستانی فضا کو معطر کرتی رہیں۔

جہاں تک ہندوستانی سنیما کا تعلق ہے، سنیما نے ایسے وقت میں اپنا ارتقائی سفر شروع کیا جب اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سنیما کو پہلی کلامیہ فلم 'عالم آرا' کی ریلیز کے ساتھ اردو نے ہی بولنا سکھایا۔ اس فلم سے پہلے کی ہندوستانی سنیما کی تاریخ خاموش فلموں کی رہی ہے۔ 'عالم آرا' 1931 میں ریلیز ہوئی یہ وہی دور تھا جب اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات داخل ہو رہے تھے اور یہی دور ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں جدید سنیما کا ارتقائی دور مانا جاتا ہے، ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں اسی دور میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی شدت اختیار کر رہی تھی۔ 1936 میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا، اردو کے بے شمار ادیب، شاعر اور دانشور اس ادبی تحریک سے متاثر ہوئے۔ یہی وہ وقت تھا جب مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اپنی آزادی کی تحریک کو تیز تر کر دیا، اور 'انگریزو! بھارت چھوڑو' کا نعرہ دیا۔ اور اسی کے ساتھ اردو کا ایک نعرہ 'انقلاب زندہ باد' نے پورے ہندوستانی ماحول کو گرم کر دیا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب ہندوستانی سنیما، تحریک آزادی اور ترقی پسند تحریک دونوں سے ایک ہی وقت میں متاثر ہو رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور متاثر کہانی کار، نغمہ نگار، فلمساز اور ہدایت کار فلم انڈسٹری سے اپنا تعلق جوڑتے جا رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم محبان اردو منشی پریم چند، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، وشوامترا عادل، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، نجم نقوی، راجہ مہدی علی خان، عصمت چغتائی، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، راما نند ساگر ضیا سرحدی وغیرہ اور ایسے کتنے ہی اہم نام ہیں جو ہندوستانی فلموں سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔ فلموں کے لیے اردو ادیبوں کے لکھے مکالمے نہ صرف بہت پر اثر ہوا کرتے بلکہ اپنا دیرپا اثر چھوڑ جاتے، اور بعض اوقات تو ضرب المثل بن جاتے۔ مثلاً فلم پاکیزہ سے ''آپ کے پاؤں دیکھے بہت حسین ہیں انھیں زمین پر مت اتاریئے گا، میلے ہو جائیں گے۔'' فلم وقت سے ''جن کے گھر شیشوں کے ہوں، وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے'' وغیرہ اس طرح کے بے شمار اردو کے مکالمے آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں اور یاد کیے جاتے ہیں۔ یہی نہیں جب بھی ہندوستانی سنیما میں اردو ادب کا ذکر ہوگا، فلمی نغمہ نگاری سے خالی نہ ہوگا، جس کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے، اگر مختصراً ذکر کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب سے وابستہ کئی بڑے شاعروں نے ہندوستانی فلموں کو بے حد معیاری اور مقبول ترین گیت دیے ہیں۔ ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جان نثار اختر، نجم نقوی، راجہ مہدی علی خان، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، قمر جلال آبادی، شکیل بدایونی اس طرح کئی ایسے اردو کے نامور شعرا ہیں جنھوں نے فلمی نغموں میں اردو ادب کا معیار برقرار رکھا۔ یوں تو ابتدا سے ہی اردو ادب کا گہرا رشتہ ہندوستانی سنیما سے رہا ہے، اور جب بھی اردو اور ہندوستانی فلموں کا ذکر آئے گا ذہن میں اردو مکالموں کے الفاظ اور نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ نہ جانے کتنے ہی اداکاروں کی حرکات و سکنات، اداکاری جذبات سے پُر مناظر ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔

ہندوستانی سنیما اور اردو کے متعلق جب بھی ذکر ہوگا، منشی پریم چند کا نام سر فہرست ہوگا۔ جیسا کہ ان کے ناول سیوا سدن پر سب سے پہلے 'بازارِ حسن' کے نام سے 1934 میں ایک فلم بنی۔ اسی طرح 1941 میں ان کی اردو کہانی 'عورت کی فطرت' پر فلم بنی، فلم کا نام 'سوامی' رکھا گیا تھا۔ 1946 میں ناول 'چوگانِ ہستی' پر 'رنگ بھومی' کے نام سے فلم بنائی گئی اسی طرح فلم 'گئودان' جو کہ اردو ادب میں پریم چند کا شاہکار ناول تسلیم کیا جا چکا ہے۔ منشی جی کی ایک کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' جس پر مشہور فلم ساز اور ہدایت کار ستیہ جیت رے نے فلم بنائی۔ جو منشی پریم چند کی کہانیوں پر بنی فلموں میں سب سے زیادہ عمدہ اور مقبول ترین فلم رہی۔ منشی پریم چند کا نام ہندوستانی فلموں سے وابستہ تو رہا ہی ہے لیکن اردو اور ہندوستانی سنیما ذہن میں آتے ہی 'امتیاز علی تاج' کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ ان کے اردو ادب کا شاہکار ڈراما 'انارکلی' پر 1953 میں مشہور اور کامیاب فلم

بنائی گئی۔ بعدازاں اسی موضوع کو بڑے پیمانے پر ہندوستانی فلموں کے مشہور ہدایت کار کے آصف نے 'مغلِ اعظم' کے نام سے پیش کیا، یہ ایک زبردست کامیاب اور بہترین فلم تھی، اس فلم نے اپنے زمانے میں کئی ریکارڈ قائم کیے۔ اردو کا زندہ جاوید شاہکار اور پہلا مکمل معاشرتی ناول 'امراؤ جان ادا' جس کے مصنف مرزا ہادی رسوا تھے، اس ناول پر مشہور فلمساز اور ہدایت کار مظفر علی نے ایک کامیاب اور عمدہ فلم سب سے پہلے 1981 میں بنائی، اور اس میں اس زمانے کے لکھنؤ کے نوابی اور ادبی ماحول کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس فلم میں نغمے موسیقی وغیرہ سب ہی عمدہ اور بہترین ہیں۔ اس فلم سے متاثر ہوکر کمال امروہی نے بھی ایک فلم 'پاکیزہ' کے نام سے بنائی جس کا مرکزی خیال بھی وہی تھا جو امراؤ جان ادا کا ہے۔

ایسے ہی اردو ادب کا ایک اور اہم ادیب 'خواجہ احمد عباس' جو ایک زمانے میں فلم کمپنی 'بمبئی ٹاکیز' میں بحیثیت فلم پبلی سٹی انچارج منسلک رہے، اسی دوران انھوں نے ہندوستانی سنیما کو کئی یادگار فلمیں دی، انھوں نے سب سے پہلے خود اپنی ہدایت میں اپنی پہلی فلم 'دھرتی کے لال' بنائی جو 1945 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اسی طرح ان کی کہانی پر 'بمبئی ٹاکیز' نے فلم 'نیا سنسار' بنائی۔ عباس صاحب نے اس کے علاوہ خود کئی فلمیں بنائی، جو کامیاب نہ ہو سکیں، لیکن جو فلمیں انھوں نے راج کپور کے لیے لکھیں وہ بے حد کامیاب ہوئیں اور ایسے ہی اردو ادب کا بہت بڑا نام کرشن چندر جن کی ہندوستانی فلموں سے پوری طرح وابستگی رہی ہے، انھوں نے سب سے پہلے 'من کی جیت' نامی فلم کی کہانی لکھی جو ڈبلیو زیڈ احمد کی ہدایت کاری میں 1945 میں نمائش کی گئی، اس فلم کی ایک اور خاص بات یہ رہی ہے کہ اس میں اردو کے نامور انقلابی شاعر 'جوش ملیح آبادی' نے نغمے لکھے۔ اس کے بعد بھی کرشن چندر نے بہت سی فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور منظر نامے لکھے، ان کی یہ ادبی اور فلمی خدمات یکساں طور پر اردو ادب اور ہندوستانی سنیما میں مقبول رہیں۔ اس میں ایک اور اردو ادب کا اہم نام 'راجندر سنگھ بیدی' ہے، انھوں نے کئی فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور منظر نامے لکھے اور خود بھی فلمیں بنائی۔ جس میں ان کی سب سے اہم فلم 'دستک' ہے، جس کے اداکاروں اور موسیقار کو ملکی سطح کے اعزاز سے نوازا گیا اور خود راجندر سنگھ بیدی کو حکومت ہند نے 'پدم شری' سے نوازا۔ فلم 'دستک' کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے 'پھاگن'، 'آنکھیں دیکھی'، 'اپنی دھرتی اپنا دیس'، 'نواب صاحب' وغیرہ فلمیں بنائیں۔ راجندر سنگھ بیدی کا اردو کا مختصر و مقبول ناول 'ایک چادر میلی سی' جسے مشہور فلمساز و ہدایت کار کمال امروہی نے بہت پسند کیا اور 1986 میں راجندر سنگھ بیدی کے انتقال کے بعد ایک اچھی فلم بنائی جو کافی پسند کی گئی۔ بیدی کی ایک کہانی 'گرم کوٹ' پر بھی عمدہ فلم بنائی گئی۔

مرزا غالب اردو کا ایک ناقابل فراموش نام، اردو زبان و ادب کے عالمی شہرت یافتہ شاعر، غالب کی زندگی کے واقعات اور ان کے خطوط کی مدد سے مشہور فلمساز و ہدایت کار سہراب مودی نے 1954 میں ایک کامیاب فلم بنائی۔ جس کی کہانی، اردو ادب کے مشہور ادیب 'سعادت حسن منٹو' نے تحریر کی تھی مگر درمیان میں ہی منٹو پاکستان ہجرت کر گئے، ان کے بعد اس کہانی کو راجندر سنگھ بیدی نے پائے تکمیل کو پہنچایا، اس فلم کے منظر نامے اور مکالمے خود راجندر سنگھ بیدی نے تحریر کیے۔ یہ فلم بے حد مقبول و کامیاب ہوئی، اور اس فلم کی غزلیں بھی بے حد مقبول تھیں۔ ایک اور اہم نام 'امرتا پریتم' جو کہ پنجابی زبان کی شاعرہ تھی، لیکن ان کی تمام تخلیقات اردو زبان میں شائع ہوئی، ان کا شاہکار ناول 'پنجر' بھی اردو میں شائع ہوکر کافی مقبول ہوا۔ اس ناول پر بھی ہندوستانی فلم انڈسٹری نے ایک کامیاب فلم بنائی۔ اردو فکشن اور ہندوستانی سنیما ایک ایسا باب ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بے شمار ایسے فلمی اسکرپٹ نگار ہیں جن کی پرورش اردو فکشن کے سائے میں ہوئی تھی۔ جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی مقبول داستانوں، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا، وغیرہ نہایت کامیاب اور اردو تہذیب پر مبنی فلمیں ہیں۔ ایسی سیکڑوں مثالیں ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں موجود ہیں۔

اردو اور بالی ووڈ کا نام آتے ہی ہمارے ذہنوں میں اردو مکالمے اور نغمے مع دھن گونجنے لگتے ہیں۔ شاعری لکھی جاتی، پڑھی جاتی، سنی اور سنائی جاتی تھی۔ لیکن ہندوستانی سنیما کے ذریعے اردو شعر و ادب کو ایسا پیرایۂ اظہار مل گیا جو فائن آرٹس کا خوبصورت سنگم تھا۔ ہندوستانی فلموں کا پہلا نغمہ

دے دے خدا کے نام پر گر تجھ میں دینے کی طاقت ہے
یا مجھ سے کچھ لے لے اگر لینے کی طاقت ہے

اردو شعر و ادب جس کا خمیر ہندوستان ہی میں تیار ہوا، جس کی ابتدا امیر خسرو کے ہندوی کلام سے ہوتی ہوئی میر، غالب و مومن سے اپنے دامن کو گنگا جمنی تہذیب کے گلشن سے پھول و خوشبو لیے ہندوستانی سنیما کو معطر کرتی رہی۔ اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف کے بغیر ہندوستانی فلموں کا تصور ممکن نہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ کہ دبستان لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کے سارے اردو شاعر و ادیب اپنی روایات کے ساتھ ہندوستانی فلموں میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ان اردو شعرا کی غزلیات، نظمیات، قطعہ، رباعی وغیرہ اردو شاعری کے سبھی فارم اپنی تکنیکی خوبیوں کے ساتھ مل جل کر ہندوستانی نغمگی کو اس کی شکل و صورت عطا کرتے ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں مسلم معاشرے کی عکاسی بھی ایک پہلو ہے جس کو فلموں میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا، جو ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ فلموں میں مسلم کردار ہو کہ غیر مسلم کردار دونوں کی زبان و بیان میں اتنی یکسانیت ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فلم پاکیزہ ہو، چودھویں کا چاند ہو، میرے ہمدم میرے دوست ہو یا کہ دیوداس ہو، ان فلموں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کی زبان و بیان میں مماثلت سے انکار ممکن نہیں۔

اردو زبان و ادب نے ہندوستانی سنیما کی ایک اہم ہستی 'گلزار' صاحب کو بلندیوں تک پہنچایا، اور کہا جاتا ہے کہ خود گلزار صاحب کی بدولت اردو وہاں وہاں پہنچی جہاں اس کی رسائی تو ممکن تھی، لیکن لوگوں نے راستہ نہیں بننے دیا۔ غرض یہ کہ اردو اور گلزار دونوں کو جدا جدا دیکھنا غیر ممکن ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ 1998 میں فلم 'دل سے' کا ایک گیت جسے گلزار صاحب نے لکھا تھا۔

جن کے سر ہو عشق کی چھاؤں
پاؤں کے نیچے جنت ہوگی

اور مزید آگے لکھتے ہیں کہ

وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح
ہے جس کی زباں اردو کی طرح
مری شام و رات مری کائنات
وہ یار مرا سیاں سیاں

یہ وہی فلمی نغمہ نگار گلزار صاحب ہیں جنھوں نے 'اردو' کو زبان یار کا بہترین وصف بتایا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان و ادب نے ہندوستانی سنیما کے ذریعے ہمارے پورے معاشرے پر کافی مثبت اثرات ڈالے ہیں۔ اردو اپنی تہذیب کے ساتھ ہندوستانی سنیما کا ایسا حصہ بن چکی ہے، جسے جدا کرنا یا اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

■

Dr.Shakeel Ahmad Khan
Department of URDU
Government Vidarbha Institute of
Science& Humanities
Amravati-444 604 (M.S)

شہباز ارشد

اردو ڈرامے کی ابتدا

(مختلف نظریات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق محققین کے یہاں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اردو کا پہلا ڈراما کس کو قرار دیا جائے؟ یہ بات محققین کے درمیان ایک لمبی مدت تک موضوع بحث رہی ہے، اور اردو کے نامور محققین نے اس سلسلے میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں جو دلائل سے مزین بھی ہیں۔ تاہم دور مابعد کے محققین نے ان میں سے بعض نظریات کو اپنے دلائل سے رد بھی کیا ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں میری کوشش رہے گی کہ اپنے مطالعے کی روشنی میں ان تمام نظریات کو ترتیب وار آپ کے سامنے پیش کروں۔

پہلا نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا اور آغاز سے متعلق پہلا نظریہ یہ ہے کہ نواز کبیشر نامی شاعر نے فرخ سیر کے زمانے میں برج بھاشا میں 'شکنتلا' کے نام سے ایک ڈراما لکھا تھا جس کا سنہ تصنیف بابائے اردو مولوی عبدالحق (1870-1961) کی تحقیق کے مطابق 1716 عیسوی ہے۔ یہی اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ اردو ادب کے بہت سے محققین جن میں پنڈت برج موہن، رام بابو سکسینہ، مولوی سید محمد، سید بادشاہ حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی وغیرہ شامل ہیں، اس نظریے کے قائل ہیں۔ دراصل ان محققین کا ماننا ہے کہ 'نواز' نامی شاعر کی یہ تصنیف کالی داس کی کتاب 'شکنتلا ناٹک' کا ترجمہ ہے یہ ڈراما پہلے برج بھاشا میں لکھا گیا تھا، پھر فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد پروفیسر جان گل کرسٹ کی خواہش پر مرزا کاظم علی نے 1801 میں اس کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اسلم قریشی لکھتے ہیں:

''ایک زمانے میں نواز نامی ایک شاعر نے، جسے ملک الشعرا (کبیشر یا کبیشور) کا خطاب ملا تھا، ایک کتاب 'سکنتلا ناٹک (بہ سین مہملہ)' تحریر کی اور پھر فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں شعبہ اردو کے پروفیسر جان گل کرسٹ کے ایما سے مرزا کاظم علی جوان نے 'شکنتلا ناٹک' تالیف کیا۔ بعض محققین نے شکنتلا ناٹک کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیا ہے اور نواز یا نواج کو اردو کا پہلا ڈراما نگار تسلیم کیا ہے۔''[1]

متذکرہ بالا نظریہ اپنی جگہ پر، لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ نواز کبیشر کی تصنیف 'شکنتلا ناٹک' نہ تو کالی داس کی کتاب 'شکنتلا ناٹک' کا ترجمہ ہے اور نہ ہی اس میں ڈراما کی ہیئت موجود ہے، بلکہ نواز کی تصنیف کالی داس کی کتاب 'شکنتلا ناٹک' کے مغایر ہے۔ دوسری بات یہ کہ نواز ہندی کا شاعر تھا نہ کہ اردو کا، اس لیے نواز کو اردو کا پہلا ڈراما نگار تسلیم کرنا قطعاً درست نہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب مذکورہ بالا قول کی تردید میں لکھتے ہیں:

''بعض لوگ نواز کے شکنتلا ناٹک کو اردو کا پہلا ڈراما کہتے ہیں۔ مگر نواز ہندی کا شاعر تھا اور ہندی تلفظ کے مطابق 'نواج' تخلص کرتا تھا۔ وہ کچھ دن اورنگ زیب کے بیٹے اعظم کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں فورٹ ولیم کالج کے ناظم علی جوان اور للو لال نے 1801 میں کیا۔ وہ ایک مسلسل قصے کی صورت میں ہے جس کو کسی طرح ڈراما نہیں کہہ سکتے۔''[2]

مذکورہ بالا دلیل سے یہ واضح ہو گیا کہ نواز کبیشر نامی شاعر کی تصنیف 'شکنتلا ناٹک'، کالی داس کی کتاب 'شکنتلا ناٹک' کا ترجمہ نہیں ہے اور نہ ہی ڈرامے کی ہیئت میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نواز ہندی کے شاعر تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نواز کبیشر اردو کا پہلا ڈراما نگار نہیں ہے اور نہ ہی 'شکنتلا' اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ علاوہ ازیں سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' میں نواز کبیشر کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نواز کی کتاب کالی داس کی تصنیف 'شکنتلا ناٹک' کا ترجمہ نہیں ہے۔

دوسرا نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

''چونکہ اس سے پہلے ڈراما کا اور کوئی نشان یا پتہ نہیں ملتا اس لیے قرائن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ڈراما کا پہلا نقش 'افسانہ عشق' تھا جو رہس یا اوپیرا کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور اس طرح اردو کے سب سے پہلے ڈرامہ نگار واجد علی شاہ تھے''[3]

متذکرہ بالا اقتباس سے دوسرا نظریہ یہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی معروف مثنوی 'افسانہ

عشق' میں ڈرامے کے بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں، اور اس کا انداز پیش کش بھی ڈرامائی ہے، لہٰذا نواب صاحب کی مثنوی اردو کا اولین ڈراما ہے اور واجد علی شاہ اردو کا پہلا ڈراما نگار۔ اس نظریے کے قائل اردو ڈرامے کے مشہور و معروف نقاد عشرت رحمانی اور امتیاز علی تاج ہیں، جب کہ ڈاکٹر تاتارخان، واجد علی شاہ کی مثنوی 'افسانۂ عشق' کو سرے سے ڈراما ہی تسلیم نہیں کرتے، چہ جائے کہ اردو کا اولین ڈراما۔ خان صاحب کا ماننا ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی مثنوی 'افسانۂ عشق' جسے عشرت رحمانی نے اپنی کتاب 'اردو ڈراما کا ارتقا' میں اردو کا پہلا ڈراما لکھا ہے وہ ڈراما نہیں ہے، بلکہ اس کا انداز تو 'اوپیرا یا رہس' کا سا تھا۔

ڈاکٹر تاتارخان لکھتے ہیں:

'افسانۂ عشق' کو ڈرامے کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کا انداز اوپیرا یا رہس کا سا تھا۔''[4]

لیکن خاں صاحب کی اس بات پر کئی اعتراضات کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہی ہوتا ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی مثنوی 'افسانۂ عشق' جسے خود نواب صاحب نے اسٹیج کرایا تھا، اور جس کو عشرت رحمانی نے اردو کا پہلا ڈراما مانا ہے، اگر اسے صرف اس لیے اولیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز اوپیرا یا رہس کا سا تھا تو انھیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ افسانۂ عشق ہی کیا، اندر سبھا امانت اور اردو ڈرامے کے ابتدائی دور کے بہت سے ڈرامے کو ڈراما ہی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ خود امانت لکھنوی نے اپنا ڈراما 'اندر سبھا' کو ڈراما نہیں کہا ہے، کیونکہ اس زمانے میں کسی نے اس صنف کو ڈرامے کا نام نہیں دیا تھا۔ اس لیے تاتارخاں کی یہ بات کچھ درست نہیں لگ رہی ہے۔

تیسرا نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق ایک معروف نظریہ یہ بھی ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی تخلیق 'رادھا کنہیا کا قصہ' اردو کا پہلا ڈراما ہے اور واجد علی شاہ اردو کا پہلا ڈراما نگار۔ معروف محقق مسعود حسن رضوی ادیب اس نظریے کے قائل ہیں۔ انھوں نے ایک لمبی مدت کی ڈرامائی تحقیقات کے بعد اپنی دو تصنیفات 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' اور 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' نذر قارئین کی ہیں۔ ثانی الذکر تصنیف میں موصوف نے اودھ کے نواب، واجد علی شاہ کی رنگین طبیعت اور اس رنگینیت کی وجہ سے وجود میں آنے والی مختلف دل فریبی اور دل لگی کی ایجادات کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے اور پھر اخیر میں اپنے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی تصنیف 'رادھا کنہیا کا قصہ' ہی اردو کا پہلا ڈراما ہے، اور واجد علی شاہ اردو کا پہلا ڈراما نگار۔ ادیب صاحب 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لیے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولی عہدی کے دنوں میں رادھا کنہیا کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو، اردو کا پہلا ڈراما ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔''[5]

آگے لکھتے ہیں:

''بہرحال جس طرح اردو کا پہلا ڈراما لکھنے اور اردو ڈرامے کا پہلا کھیل تیار کرنے کا فخر واجد علی شاہ کے لیے ہے...''[6]

اس کتاب میں مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں رام لیلا اور راس لیلا کا رواج زمانہ قدیم سے ہی موجود ہے۔ نواب واجد علی شاہ نے اسی رام لیلا اور راس لیلا کے طرز پر رہس کی ایجاد کی اور اسے ڈرامائی انداز میں اسٹیج پر پیش کیا۔ اردو ڈرامے سے متعلق چونکہ یہ پہلی کوشش تھی جس میں تمام تقاضوں کا التزام قریباً ناممکن تھا، اس لیے واجد علی شاہ کی اس کاوش میں بہت سی کمیاں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے اردو کے کچھ نقادوں نے واجد علی شاہ کے 'رادھا کنہیا کا قصہ' کو اردو کا پہلا ڈراما ماننے سے صاف انکار کیا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر عطیہ نشاط 'رادھا کنہیا کا قصہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ایک قصہ کو کرداروں کے ذریعہ پیش کرنے کی یہ کوشش ڈرامے کی ابتدائی منزل ہے اور اسی لیے ان کی اس کوشش کو اردو ڈرامے کا پہلا قدم کہا جا سکتا ہے لیکن اس ابتدائی کوشش کو ڈراما نہیں کہا جا سکتا ہے۔''[7]

میرا ماننا ہے کہ کسی بھی صنف کے لیے اس کے ابتدائی زمانے میں سارے فنی لوازمات کا تقاضا درست نہیں۔ ڈرامے کے علاوہ اردو ادب کی اور بھی اصناف ہیں جن کے ابتدائی ادوار میں وجود میں آنے والے ان کے اولین نقوش اپنے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، لیکن اس کے باوجود ان اصناف کے نقوش اول کو اردو میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ کیا 'مراۃ العروس' ناول کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود اسے اردو کا پہلا ناول مانا گیا ہے نا؟ اس لیے ڈاکٹر نشاط کا 'رادھا کنہیا کا قصہ' کو اردو کا پہلا ڈراما ماننے سے سرے سے انکار کرنا واقعی تعجب خیز ہے۔ کیونکہ جن وجوہات کی بنیاد پر انھوں نے 'رادھا کنہیا کا قصہ' کو ڈراما ماننے سے انکار کیا ہے وہ ساری وجوہات تو ابتدائی دور کے اکثر ڈراموں میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر عطیہ صاحبہ کا اعتراض راقم کے خیال میں زیادہ وزن نہیں رکھتا ہے۔

چوتھا نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ابھر کر سامنے آیا ہے کہ ڈراما 'راجہ گوپی چند اور جلندھر' اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ اس نظریے کے قائل ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ڈاکٹر عطیہ نشاط اور بعض دیگر حضرات ہیں۔ دراصل 1953 میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے بمبئی یونی ورسٹی میں اپنی ڈاکٹریٹ کا مقالہ 'اردو تھیٹر' کے عنوان سے جمع کیا تھا۔ بعد میں یہ مقالہ چار جلدوں میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا اور خوب شہرت پائی۔ اس تصنیف میں موصوف نے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اردو میں ڈراما نگاری کی روایت پرتگالی مبلغین سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح اردو تھیٹر کے آغاز کا سہرا بھی انھوں نے پرتگالیوں کے سر باندھا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں نامی نے نواب واجد علی شاہ کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں، اور لطف تو یہ کہ وہ امانت کو بھی ڈراما نگار تسلیم کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

موصوف لکھتے ہیں:

''اردو تھیٹر کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کی ابتدائی ساخت و پرداخت کا تعلق ان باشندگان پرتگال سے ہے جو 1498 میں بغرض تجارت ہندوستان آئے تھے۔ دراصل یہی لوگ ان کے جانشین 'ماڈرن انڈین اسٹیج' کے بانی اور ہراول دستے کے ہیرو ہیں۔ جب یورپ، امریکہ، روس، چین اور جاپان میں 'ماڈرن اسٹیج' کا نام نہ تھا اس وقت پرتگالی مبلغین دکن اور شمالی ہند میں اردو ڈرامے اسٹیج کرتے تھے''[8]

ڈاکٹر عطیہ نشاط اپنی کتاب 'اردو ڈراما: روایت اور تجربہ' میں نامی کے قول کی تائید کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجہ گوپی چند اور جلندھر اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ یہ ڈراما اب دستیاب نہیں ہے۔ نہ اس کی کہانی وغیرہ کی تفصیل کہیں ملتی ہے۔''[9]

بتاتے چلیں کہ محققین نے اپنے دلائل و براہین سے اس نظریے کی خوب تردید کی ہے، اور کچھ ایسے مضبوط اعتراضات وارد کیے ہیں جنھیں دیکھ کر یقیناً ایسا لگتا ہے کہ یہ اردو ڈرامے کی ابتدا کے سلسلے میں کوئی مضبوط نظریہ نہیں ہے۔

پانچواں نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق سب سے اہم نظریہ یہ ہے کہ 'اندر سبھا' سے اردو ڈرامے کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ لہٰذا 'اندر سبھا' ہی اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ تاہم یہاں محققین میں یہ مسئلہ بھی موضوع بحث رہا ہے کہ آیا مداری لال کا 'اندر سبھا' کو اولیت حاصل ہے یا پھر امانت لکھنوی کے 'اندر سبھا' کو۔ واضح رہے کہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں دو الگ الگ ہم عصر اندر سبھائیں پائی جاتی ہیں، 'اندر سبھا امانت' اور 'اندر سبھا مداری لال'۔ جس کی وجہ سے اولیت کے سلسلے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات مداری لال کی 'اندر سبھا' کو اردو کا پہلا ڈراما مانتے ہیں تو بعض امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' کو۔ اردو ادب کے اکثر محققین جنھوں نے 'اندر سبھا' کو اردو کا پہلا ڈراما مانا ہے، اُن میں رام بابو سکسینہ، مولانا عبدالسلام ندوی، سید بادشاہ حسین اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ ان محققین کا ماننا ہے کہ امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' اردو کا پہلا ڈراما ہے نہ کہ مداری لال کی اندر سبھا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ اندر سبھا مداری لال کی سنہ اشاعت کا علم نہ ہونا ہے۔ کیونکہ اندر سبھا مداری لال جو دستیاب ہوسکی ہے اس میں اس کا سنہ اشاعت درج نہیں اور کسی تصنیف کا زمانی تقدم وتاخر بھی متعین ہوسکتا ہے جب اس کا سنہ اشاعت معلوم ہو۔ اس لیے مذکورہ بالا محققین اور کچھ دیگر محققین بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ اندر سبھا امانت کو اندر سبھا مداری لال پر زمانی تقدم حاصل ہے اور اندر سبھا امانت اردو کا پہلا ڈراما ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب، جن کی اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق اپنی ایک الگ رائے اور تحقیق ہے اور جس پر انھوں نے دو ضخیم کتابیں 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' اور 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' بھی تصنیف کی ہیں، وہ بھی کئی جہات (کلی طور پر نہیں) سے امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' کو اردو کا پہلا ڈراما تسلیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ادیب صاحب، 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' کے 'دیباچہ' میں لکھتے ہیں:

''اندر سبھا اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے، لیکن اس سے اس کی تاریخی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو عوامی اسٹیج کے لیے لکھا اور کھیلا گیا، وہ پہلا ڈراما ہے جسے عام مقبولیت نے ملک میں شہر شہر اور اودھ میں گاؤں گاؤں پہنچا دیا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو چھپ کر منظر عام پر آیا اور سیکڑوں مرتبہ شائع ہوا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو ناگری، گجراتی اور مرہٹی خطوں میں بھی چھاپا گیا۔''[10]

مسعود حسن رضوی ادیب کے اس قول سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ بھی اندر سبھا امانت کو اردو کا پہلا ڈراما مانتے ہیں۔ تاہم ان کا ماننا ہے کہ اندر سبھا امانت کو اردو ڈرامے میں اولیت حاصل تو ہے لیکن صرف اور صرف عوامی اسٹیج کی حیثیت سے۔ جب کہ ان کے نزدیک اردو کا پہلا ڈراما 'رادھا کنہیا کا قصہ' ہی ہے۔

چھٹا نظریہ

'اردوئے معلیٰ' کے قدیم اردو نمبر، شمارہ 9 میں، اردو کے مشہور ادیب خواجہ احمد فاروقی کا ایک مضمون بعنوان 'اردو کا قدیم ترین ڈراما' چھپا تھا۔ اس میں فاروقی صاحب نے ایک قدیم مخطوط، جس میں ڈرامے کا ڈیڑھ سین موجود ہے، پیش کر کے اس کو اردو کا پہلا ڈراما بتایا ہے۔

فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک میرا علم ہے، اردو کا کوئی ڈراما ان تاریخوں سے پہلے کا نہیں ملتا۔ اگر یہ اولین ڈراما نہیں تو اردو کے قدیم ترین ڈراموں میں ضرور شامل ہے۔''[11]

اخلاق اثر، فاروقی کے اس نظریے کی حمایت میں تحریر کرتے ہیں:

''اس لیے اردو کا پہلا اور قدیم ترین ڈراما موجودہ تحقیق کی روشنی میں خواجہ احمد فاروقی کا تلاش کردہ ہے۔''[12]

فاروقی صاحب کی اس نئی تحقیق سے اردو ڈرامے میں ایک نیا باب کھلا تھا، خود فاروقی صاحب اس سلسلے میں مزید تفصیلات اور تحقیقات میں لگے ہوئے تھے، اور وہ اس سلسلے میں انگلستان بھی جانے والے تھے، لیکن اسے اردو ڈرامے کی بدقسمتی ہی کہیے کہ اس سے پہلے کہ فاروقی صاحب انگلستان جاتے، موت کا فرشتہ انھیں کہیں اور لے کر چلا گیا اور اس طرح اس نئی تحقیق کا سفر اپنی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی ختم ہوگیا۔

ساتواں نظریہ

اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق ڈاکٹر مسیح الزماں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ 'خورشید' اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے ہی ڈراما 'خورشید' کو پہلی بار بڑے اہتمام کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ اپنے مرتبہ ڈراما 'خورشید' کے مقدمے میں انہوں نے لکھا ہے:

''رستم وسہراب 1871 میں اسٹیج ہوا۔ اگر خورشید کے اسٹیج کیے جانے کے کچھ دنوں پہلے اسی کمپنی اور اسی ڈائرکٹر کے اہتمام میں اردو کا ڈرامہ اسٹیج کیا جاچکا ہوتا تو مرزبان خورشید کے دیباچے میں ہرگز نہ لکھتے کہ ''زبان ہندوستان میں آج تک کوئی کھیل یا ناٹک لکھا گیا دیکھنے میں نہیں آیا۔'' اس لیے تھیٹر کے اس دور میں خورشید کی اولیت تسلیم کرنی چاہیے۔''[13]

مذکورہ بالا نظریات کے علاوہ بعض محققین نے اردو ڈراما کی ابتدا سے متعلق اور بھی کچھ نظریات پیش کیے ہیں۔ تاہم ان نظریات میں مضبوطی کا فقدان ہے لہٰذا ہم ان سے قطع نظر کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی اپنی جگہ صحیح، مدلل اور مکمل ہیں۔ اور اس وجہ سے ان میں سے کسی بھی نظریے کو نظر انداز کرنا مشکل ہے، لیکن اب تک جتنے حقائق سامنے آئے ہیں ان کی بنیاد پر یہی کہا جاسکتا کہ 'اندر سبھا' ہی اردو کا پہلا باضابطہ ڈرامے ہے جو ڈراما کے تقاضوں پر بہت حد تک کھرا اترتا ہے اور نواب واجد علی شاہ کی مثنوی 'رادھا کنہیا کا قصہ' کو اگرچہ 'اندر سبھا' امانت پر زمانی تقدم حاصل ہے لیکن وہ شاہی اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا جہاں عوام الناس کی پہنچ ناممکن تھی اس لیے اسے اردو کا پہلا ڈرامہ کہا جاسکتا ہے۔

حواشی

1 اردو ڈرامے کا تاریخی وتنقیدی پس منظر، ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، ص 274

2 دیباچہ، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ، 1957، ص 6,7

3 اردو ڈراما کا ارتقا: عشرت رحمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2020، ص 146،

4 اردو ڈراما اور ابراہیم یوسف: ڈاکٹر محمد تاتار خان، شالیمار پرنٹرز اینڈ پبلی کیشنز، حیدرآباد، 1998، ص 248

5 دیباچہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ 1957، ص 12

6 ایضاً، ص 171

7 اردو ڈراما: روایت اور تجربہ، ڈاکٹر عطیہ نشاط، نصرت پبلشرز لکھنؤ، 1973، ص 57

8 اردو تھیٹر۔ جلد اول، ڈاکٹر عبد العلیم نامی، انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن پریس کراچی، 1962، ص 118

9 اردو ڈراما: روایت اور تجربہ، ڈاکٹر عطیہ نشاط، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، 1973، ص 307

10 دیباچہ، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج: سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ، 1957، ص 7,6

11 اردو کا قدیم ترین ڈراما: خواجہ احمد فاروقی، اردوئے معلیٰ۔ قدیم اردو نمبر، ص 256

12 اردو کا پہلا ڈراما، اخلاق اثر، پاشا پریس بھوپال، 1978، ص 7،

13 خورشید، مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں، ص 13,12

■

Dr. Shahbaz Arshad
Khaja Bandanawaz University
Gulbarga- 585104 (Karnataka)
Mob.:6281262057
Email.: arshad@kbn.university

محمد دانش غنی

کوکن میں ادب اطفال کی صورتِ حال

کوکن کے اہالیانِ اردو نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اردو زبان سے ہم رشتگی ان کے معاشی مسائل کو حل بھی کر سکے گی یا نہیں؟ وہ تو محض اپنی محبت اور ارتباطِ دلی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن اردو سے لگاوٹ نے انھیں محروم اور مایوس بھی نہیں ہونے دیا چنانچہ آج بھی ہزاروں خاندان صرف اردو زبان کی بدولت روزگار سے جڑے ہوئے ہیں۔ خطۂ کوکن سے علم و ادب میں ممتاز ہستیاں اٹھیں جنھوں نے اپنے نام اور کام سے پورے کوکن کو مقام امتیاز عطا کیا۔ شعر و افسانہ، تحقیق و تنقید، تعلیم و تہذیب، معاشرت اور سیاست وصحافت میں کتنے ہی نام روشن ہیں جن پر نہ صرف خطۂ کوکن کو ناز ہے بلکہ تاریخِ اردو زبان و ادب کا بھی ایک حصہ بنے ہوئے ہیں۔ یوں بھی خطۂ کوکن کو قدرت نے صورت و سیرت اور ذہانت و دولت کی بیش بہا نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے پہاڑ، جنگل، ندی نالے، کھاڑیاں اور دریا... آم، ناریل، سپاری، چیکو، کاجو، ساگوان، بانس، نیلگری، مرغ و ماہی اور چاول وغیرہ کی پیداوار بھی عطیۂ پروردگار اور انعام الٰہی کی مظہر ہے۔ یہاں حسنِ فطرت انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے خطۂ کوکن کے شعرا و ادبا نے اپنی طرزِ معاشرت، عادات و اطوار، تاریخ و واقعات اور حسنِ فطرت جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ بچوں کی جسمانی اور ذہنی عمر، شخصی انفرادیت، دلچسپی، خواہشات، تحیر خانۂ ادراک، اکتسابی صلاحیت اور شخصیت کے مکمل فروغ کو دھیان میں رکھتے ہوئے بچوں کا ادب تخلیق کیا ہے۔

آزادی سے پہلے بچوں کے ادب پر کوئی قابلِ ذکر کام اگرچہ دکھائی نہیں دیتا لیکن آزادی کے بعد کی ساتویں دہائی میں اس سمت توجہ ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور ادبِ اطفال کا رجحان بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ متعدد شاعروں اور ادیبوں نے بچوں کے لیے تھوڑا بہت لکھنا شروع کیا لیکن بچوں کے ادب سے باقاعدہ وابستگی رکھنے والا ایک نام بدیع الزماں خاور کا ہے۔ شری پاد جوشی نے انھیں 'کوکن کا مغنّی' کہا ہے۔ خاور صاحب ایک مدرس تھے۔ عمرِ عزیز کا بڑا حصہ ننھے منوں کی محبت میں گزارا چنانچہ ان کی نفسیات، ان کی زبان اور ان کے پسندیدہ موضوعات سے انھیں بڑی واقفیت تھی اور پھر وہ خود بھی ایک قادرالکلام شاعر تھے اس لیے انھوں نے اسمٰعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر اور راجہ مہدی علی خاں کے زیر اثر اپنے طرز پر بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں جن میں بطور خاص حب الوطنی، اخلاق وشرافت، کردار و سیرت اور تعلیمی رجحانات کو مدِ نظر رکھا۔ ان کی نظموں میں زورِ بیان، تسلسل، بچوں کی سوجھ بوجھ اور زبان کا سادہ پن بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ یہ نظمیں نہ صرف خطۂ کوکن بلکہ پورے بھارت میں ذوق وشوق سے پڑھی گئیں۔ خاور صاحب نے بچوں کے لیے 'میرا وطن ہندوستان (1973) '، 'امرائی (1976)'، 'ننھی کتاب (1983) ' اور 'موتی پھول ستارے (1984) ' کے نام سے خوبصورت نظموں کے چار مجموعے دیے۔ اس طرح خطۂ کوکن سے بچوں کے ادب میں اٹھنے والا پہلا معتبر نام بدیع الزماں خاور کا ٹھہرتا ہے۔

خطۂ کوکن سے دوسرا اہم نام عبدالرحیم نشتر کا ہے۔ عبدالرحیم نشتر ہندوستان کی جدید اردو شاعری کا ایک نمایاں نام ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے، بچوں کی نظموں کے پانچ مجموعے، ایک رپورتاژ، اردو افسانے پر ایک تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے کے علاوہ جدید اردو غزل کے دو انتخاب، ودربھ کی ادبی وشعری روایت سے متعلق نصف درجن کتابچے، کوکن اور پونے کی اردو تعلیم پر تین تحقیقی تصانیف اور برصغیر کے موقر رسائل و جرائد میں

ان گنت تخلیقات نظم ونثر شائع ہوچکی ہیں۔ 1960 کے بعد سے تاحال اردو کے اہم ترین رسالوں اور اخباروں میں ان کا نام کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتا ہے۔ دراصل ان کا تعلق علاقۂ وِدربھ سے ہے۔ 1986 میں تلاشِ روزگار کے سلسلے میں کوکن آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ چونکہ وہ پیشۂ تدریس سے وابستہ تھے اس لیے ان کا ادب اطفال کی طرف توجہ دینا بھی فطری تھا۔ یوں تو وہ بچوں کے شعری ادب کی طرف 1990 میں متوجہ ہوئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز ہی بچوں کے لیے نظمیں لکھنے سے ہوا۔ اس وقت جب کہ دہلی سے کھلونا اور پھلواری شائع ہوتے تھے۔ ناگپور سے فیض انصاری کی ادارت میں 'چاند' اور شفیقہ فرحت کی ادارت میں 'کرنیں' شائع ہوا کرتا تھا۔ غالباً یہ 1953 تا 1955 کی بات ہے۔ یہی وقت تھا جب عبدالرحیم نشتر نے بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی۔ شروع میں عبدالرحیم نشتر کی نظمیں 'انقلاب' ممبئی کے بچوں کے صفحے پر جگہ پاتی رہیں۔ انقلاب میں بچوں کے صفحے کے ایڈیٹر چاچا ناصر نے اس وقت عبدالرحیم نشتر کو آل مہاراشٹر بچوں کی انجمن کا سکریٹری مقرر کیا اور کئی دفعہ انھوں نے انقلاب کے بچوں کے صفحے کی ترتیب کی ذمے داری انھیں سونپی۔ چنانچہ اس زمانے کے 'انقلاب' ممبئی کے بہت سے صفحات عبدالرحیم نشتر کے ترتیب دیے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی خوب لکھا۔ ان کی نظمیں بچوں کے معروف رسائل میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لیے بعض اہل قلم اور اہل نظر نے انھیں بنیادی طور پر بچوں کا شاعر کہا ہے۔

عبدالرحیم نشتر کی نظموں کے پانچ مجموعے 'بیچارے فرشتے (1994)'، 'کوکن رانی (1997)'، 'موتی چور کے لڈو (2005)'، 'گل چھرے (2007)' اور 'بچوں کا سنسار (2021)' کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ تمام مجموعوں کی شاعری 'گنگناؤ مرے اشعار مچلتے جاؤ' کے مصداق ہے۔ ان نظموں میں شاعر کا بچوں کے بارے میں جو مشاہدہ ہے اور بچوں کی نفسیات کا جو عرفان اسے حاصل ہے، وہ اتنا اچھوتا، اتنا پیارا اور اتنا دل آویز ہے کہ طبیعت خود بہ خود کسی نظم کو منتخب کرکے گنگنانے پر مائل ہوتی ہے۔ ایک اور بڑی خوبی نظموں کی یہ ہے کہ یہ سبق آموز ہیں۔ خدا کی یاد تازہ کردیتی ہیں۔ اس کی صناعی کی طرف توجہ کو مرکوز کرتی ہیں۔ بچوں کو انسان بن کر جینے کی راہ دکھلاتی ہیں۔ ان میں خودشناسی، خوداعتمادی اور شعور کی بالیدگی پیدا کرنے میں معاون نظر آتی ہیں۔ حوصلوں کا درس دیتی ہیں۔ مستقل مزاجی کی تعلیم دیتی ہیں۔ کامیابیوں کے گر سکھاتی ہیں۔ قدرت، دنیا اور انسان کی پہچان کراتی ہیں۔

اقبال سالک نوجوان شاعر ہیں لیکن انھوں نے خود کو بچوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ لہٰذا ان کی پیاری پیاری اور خوبصورت نظمیں رسائل وجرائد میں نظر آجاتی ہیں۔ 'پہلا قدم' ان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں کا مجموعہ ہے جو 2014 میں رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں کے زیراہتمام شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں انھوں نے زیادہ تر ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جن سے قاری اکثر وبیشتر گذرتا ہے لیکن یہ نظمیں اُن میں نئی کیفیات وسرشاری پیدا کرتی ہیں۔ آسان اور سلیس زبان، چھوٹی بحریں اور مترنم الفاظ کے ساتھ ان نظموں کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ ان میں بچپن صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔

ساغر ملک کا تعلق بھیونڈی سے ہے اور وہ بھی اسکول میں ٹیچر رہ چکے ہیں۔ بچوں کے درمیان رہتے سہتے اور انھیں سمجھتے سمجھاتے آئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کہانی کے میڈیم سے بچوں کی شخصیت اور کردار سازی میں ایک موثر کردار ادا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہانی کو اپنی پسندیدہ صنف قرار دیا اور بہت سی دلچسپ کہانیاں لکھیں۔ ساغر ملک کی شہرت ان کی کہانیوں کی پہلی کتاب 'سفید کوا (1984)' سے ہوئی اور اب تک وہ بچوں کے لیے پانچ بہت اچھی کتابیں دے چکے ہیں جن میں 'قاتل سائنسداں (1988)'، 'کہانیاں (1990)' اور 'کچے گھر کی دھوپ (1990)' شامل ہیں۔ ان کتابوں میں ساغر ملک نے بچہ بن کر بچوں کی عمر اور مزاج کے مطابق پیاری پیاری، نصیحت آموز اور کردار ساز کہانیاں انھیں کی زبان اور پیرائے میں بیان کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کہانیوں میں بچوں کی افتادِ طبع، پسند ناپسند اور ان کی نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں کے کردار بچوں کے جانے پہچانے جانور اور پرندے یا پھر سادہ لوح اور بھولے بھالے انسان ہیں جن کی بدحواسیاں اور کارکردگیاں پرلطف مناظر سجاتی اور خوشگوار مزاح پیدا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ہر کہانی بچوں کو ایک سبق دیتی ہے، ایک پیغام پہنچاتی ہے اور ان پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ ان کے یہاں بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا ایک مجموعہ بھی ملتا ہے جو 'کرنیں' کے نام سے 1983 میں شائع ہوا تھا جس میں بچوں کے لیے اخلاقی اور سبق آموز نظمیں شامل ہیں۔

ایم مبین اپنی کہانیاں اور ڈراما نگاری کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کی اپنی ایک شناخت بھی ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بڑی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی نگارشات کو ہندی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ بچوں کے تمام رسائل میں ان کی تخلیقات پابندی سے شائع ہوتی ہیں۔ انھیں کہانی لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے۔ دل پذیر اندازِ بیان، موثر زبان اور کسا ہوا بیانیہ ان کی کہانیوں کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے کامیاب ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ یہ ڈرامے بھی کہانیوں کی طرح سبق آموز اور دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ 'مال مفت (1998'، 'گدھے کی چوری (2005)'، 'پپو پاس ہوگیا (2006)'، 'ہزار روپے کا نوٹ (2008)'، 'میرا نام کرے گا روشن (2011)'، 'رانگ نمبر (2012)'، 'گبر سنگھ نے ای میل کیا (2013)، 'دان دھرم (2018)، 'گونگا سچ ((2019)، 'ابراہیم گاردی (2019)' اور 'کھول دو (2020)، وغیرہ ان کے ڈراموں کے مجموعے بچوں کی نفسیات اور سوجھ بوجھ کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'جھنگا پہلوان نے کرکٹ کھیلا (2006)، 'انمول ہیرا (2007)، 'جادوئی چراغ (2007)، 'ڈیجیٹل جنگل (2022) اور 'مشن اوزون (2023)، ایم مبین کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ 'سرکٹی لاشیں (2004)، 'زحل کے قیدی (2004)، 'انگوٹھا (2013)، 'اے وطن تیرے لیے (2014)' اور 'خلائی سفر (2021)' جیسے ناول انھوں نے بچوں کے لیے لکھے ہیں۔ ان کا تسلسل ان کی تازہ فکری اور غضب کی تخلیقی صلاحیت کا غماز ہے۔ انھیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے گرد وپیش بکھری ہوئی اور پھیلی ہوئی کہانیوں میں سے بچوں کے لائق کسی ایک موضوع کو منتخب کرلیتے ہیں اور پھر نہایت سادہ انداز میں شروع کرکے تحیر خیز واقعات کی کسی ہوئی ترتیب کے ساتھ بڑی دلچسپ انداز میں بیان کردیتے ہیں۔ ان کہانیوں اور ڈراموں کے مجموعے ادب اطفال کے لیے بیش قیمت تحفے ہیں۔

صادقہ نواب سحر ایک مدت سے لکھ رہی ہیں۔ وہ ایک مقبول ومعروف فکشن نگار ہیں، ان کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ ہندی جگت والوں میں بھی ان کا نام بڑی اہمیت اور عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ بھی بچوں کی کامیاب اور پسندیدہ ادیب ہیں۔ تعلیم وتدریس میں عمر گزاری۔ مہاراشٹر کی اردو ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابیں تیار کرنے کا انھیں طویل تجربہ حاصل ہے۔ نصابی ضرورتوں کے تحت لکھتی رہی ہیں اس لیے نہایت غور وفکر، ہوش وحواس اور آہستہ روی کے ساتھ لکھتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ بچوں کے لیے

کیا اور کیسے لکھا جائے۔ حالیہ برسوں میں صادقہ نواب سحر نے بچوں کے ادب میں وقیع اضافے کیے ہیں۔ 'کھلونوں کے درمیاں' صادقہ نواب سحر کا بچوں کے لیے یک بابی ڈراموں کا مجموعہ ہے جسے تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی نے 2012 میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ اسٹیج ڈراموں کی خصوصیات سے معمور ہے۔ ہر ڈرامہ بہ آسانی اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔ بچوں سے متعلق دل چھو لینے والے موضوعات کو چوکس تجسیم اور جاندار اور اثر آفریں مکالموں کے ساتھ بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈراموں کے سارے کردار جانے پہچانے اور ارد گرد کے ہی کردار ہیں۔ اسی وجہ سے ننھا قاری ان میں دلچسپی لیتا ہے۔ ڈراموں کے مناظر کی فضا بندی میں ہنر مندی نظر آتی ہے۔ مکالمے کردار کی عمر، پیشہ اور اس کی نفسیات اور عادات و اطوار کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ صادقہ نواب سحر نے اچھی اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ یوں بھی کہانی لکھنے میں وہ خاصی مشاق ہیں۔ بچے، عورتیں اور بڑے بوڑھے سبھی ان کی کہانیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کے نثری ادب میں وہ ایک ممتاز و معتبر مقام رکھتی ہیں۔ نوعمر طالب علموں کو ننھی منی کہانیوں اور نظموں کے سہارے پڑھایا جاتا ہے۔ نرسری میں نظموں کی اہمیت اسی لیے ہے۔ صادقہ نواب سحر اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے انھوں نے بچوں کی بڑی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ 'پھول سے پیارے جگنو' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جو 2003 میں شائع ہوا تھا۔ مجموعے میں شامل ساری نظمیں نہایت کامیاب اور مفید و موثر ہیں۔ بچوں کے سبھی رسالوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔

غنی غازی بچوں کے مقبول اور پسندیدہ ادیب ہیں۔ وہ جب تک ممبئی میں رہے ماہنامہ 'نقش کوکن' سے جڑے رہے اور دلچسپ، مزے دار، سبق آموز کہانیاں تخلیق کرتے رہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'ریت کے گھروندے (1984)'، 'مٹی کے گھروندے (1986)'، 'شبنم کے موتی (1987)' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں جو نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہیں۔ غنی غازی نے 'مردہ گھر' کے نام سے بچوں کے لیے ایک ناول بھی تحریر کیا تھا جو 2016 میں نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ، ممبئی کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ 'مردہ گھر' کی کہانی شروع ہوتے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ کہانی کی دلچسپی اور قاری کا تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ غنی غازی کی کہانیاں من گھڑت نہیں ہوتیں، وہ بچوں میں سائنسی شعور جگاتی ہیں۔ بچوں کے مزاج، رجحان اور زبان کی انھیں اچھی آگہی ہے۔ خیالات کو صفائی اور چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان ایک موثر وسیلہ ہے اور وہ کہانی پن کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔

غنی غازی بچوں کے مقبول اور پسندیدہ ادیب ہیں۔ وہ جب تک ممبئی میں رہے ماہنامہ 'نقش کوکن' سے جڑے رہے اور دلچسپ، مزے دار، سبق آموز کہانیاں تخلیق کرتے رہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'ریت کے گھروندے (1984)'، 'مٹی کے گھروندے (1986)'، 'شبنم کے موتی (1987)' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں جو نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہیں۔

مسرت بانو شیخ بھی ادب اطفال کا ایک معروف نام ہے۔ وہ بھی پیشۂ تدریس سے وابستہ رہی ہیں اسی لیے ان کی نگارشات ادب اطفال کے تقاضے پوری کرتی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ نہایت تیزی سے اُبھی تھیں۔ ان کے ڈرامے ماہنامہ نرالی دنیا، گل بوٹے انقلاب اور دوسرے رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہورہے تھے،لیکن اب وہ ایک عرصے سے خاموش ہیں۔ مسرت صاحبہ نے بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ان ڈراموں نے اسکول اسٹیج پر بڑی شہرت اور مقبولیت بھی حاصل کی۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ عمدہ اور مکالمے برجستہ ہیں۔ انھوں نے بچوں کے مزاج اور ذہنی استعداد کا بھی خیال رکھا ہے۔ ڈراموں کے دو مجموعے 'ہم ایک رہیں گے (1997)' اور 'آدھا ادھورا (2001)' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

شکیل شاہجہاں مہسلہ (رائے گڑھ) کے ایک کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے بچوں کے لیے کچھ ڈرامے تحریر کیے تھے۔ بعد میں ان ڈراموں کا مجموعہ 'قطار میں آیئے (1994)' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ تمام ڈرامے بچوں کے ذہن اور مزاج کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے تھے۔

نور جہاں نور بچوں کی نفسیات، ان کی ترجیحات، ذہنی سطح اور زبان دانی کی بہترین پارکھ تھیں۔ ان کی نظمیں، کہانیاں، مضامین اور ڈرامے ماہنامہ نرالی دنیا، گل بوٹے، انقلاب اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں جن میں لفظوں کا برمحل استعمال، بچا تلا انداز اور متاثر کن پیرایۂ اظہار پایا جاتا ہے۔ مدیر گل بوٹے محترم فاروق سید کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محترمہ دو کتابوں کی مصنفہ بھی تھیں اور یہ دونوں کتابیں گل بوٹے پبلی کیشنز ممبئی کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھیں لیکن ان کتابوں کے نام اب مدیر گل بوٹے کے حافظے میں محفوظ نہیں ہیں۔ بس انھوں نے اتنا ہی بتایا کہ ان کتابوں میں سے ایک بچوں کی نظموں کا مجموعہ تھا اور دوسری کتاب بچوں کے ڈراموں پر مشتمل تھی۔

نوگل بھارتی بھی بچوں کے لیے لکھتے رہتے تھے۔ ان کی دلچسپ اور سلیس نظمیں اور کہانیاں اکثر اخباروں کی زینت بنتی رہتی تھیں جنھیں ہم اپنے بچپن میں لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے۔

انجم عباسی ایک طویل عرصے تک تدریس سے جڑے رہے اس لیے انھیں بچوں کے ادب میں بھی خاص دلچسپی ہے۔ انھوں نے نہ صرف بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھیں بلکہ بچوں کے لیے مراٹھی زبان کی کئی اچھی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا۔

محمد حسین پرکار بھی اردو کے ساتھ مراٹھی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ترجمے کی لسانی اور تہذیبی اہمیت سے واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مراٹھی اور اردو کی لسانی اور تہذیبی روایت کو قائم رکھنے میں اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔ محمد حسین پرکار نے مراٹھی شاعری اور ڈراموں کے اردو میں کامیاب تجربے کیے ہیں۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی حیات پر مبنی وی واشرواڈکر کا لکھا گیا ڈرامہ 'ویر بھتالی دھرتی لا' کو اردو روپ دے کر مراٹھی اردو کے لسانی رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

شیریں دلوی اردو صحافت کا ایک معروف نام ہے لیکن بچوں کے ادب سے بھی ان کی دلچسپی کچھ کم نہیں ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی کالم لکھے جو روزنامہ ہندوستان میں 'ان دنوں' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ نسوانی جذبات، خیالات و تاثرات اور صفات سے رچی

ہوئی اس ادیبہ نے چھوٹے بچوں اور نوخیز لڑکیوں کے لیے بڑی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے کالم پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔

عامل کھٹیلوی (محمد اقبال خان دیشمکھ) کا تعلق بھی صحافت کے پیشے سے رہا ہے۔ وہ ایک زمانے میں ہفت روزہ 'کوکن کی آواز' کے نائب مدیر تھے۔ بچوں کے لیے انھوں نے 'چاند تارے (2005)' پیش کیا تھا۔ کہانیوں کے اس مجموعے میں بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ عامل کھٹیلوی کے پاس کہانی نویسی کا نہایت پر اثر فن موجود ہے۔ وہ اپنے فن کو ادبِ اطفال کی طرف مرکوز کردیں تو بچوں کے ادب کو ایک اچھا کہانی کار مل سکتا ہے۔

نظام فیضی، آدم نصرت، ملک تاسے، قاضی فراز احمد، مغل اقبال اختر، تسنیم انصاری، صابر مجگانوی، تاج الدین شاہد، بکر سیمابی اور جویریہ قاضی خطۂ کوکن کے ایسے قلم کار ہیں جن کے یہاں بچوں کے معیار اور ان کے فطری ذوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ اخلاقی نظم ونثر پائی جاتی ہیں جو بچوں کے رسائل میں شائع بھی ہوئی ہیں۔ یہ نظم ونثر بچوں کو خیر کی جانب مائل کرتی ہیں۔ ان کے خوابیدہ جذبات کو مثبت انداز سے بیدار کرتی ہیں۔ غور وفکر کی دعوت اور صالح اقدار کو فروغ دیتی ہیں۔ شاہد مہسلائی، سعید کنول، مبشر کنول، تبسم منظور ناڈکر، فیروزہ تسبیح، نگینہ ناز اور دوسرے چند قلمکاروں نے بھی ادبِ اطفال میں حصہ لیا ہے لیکن بیشتر شعرا و ادبا نے نظمیں، ڈرامے، کہانیاں، تعلیمی مضامین، تاریخی کارنامے پہیلیاں، لطیفے غرض جو کچھ بھی لکھا یا ترجمہ کیا ان کے مطالعے سے امید تو بندھتی ہے کہ خطۂ کوکن میں بچوں کا ادب اس معیار کا ہے کہ بزرگ بچوں کے مستقبل سے بات کرسکتے ہیں۔

خطۂ کوکن میں بچوں کے ادب کی روایت کو جاندار بنانے میں ماہنامہ 'نقش کوکن' ممبئی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ رسالہ ادبِ اطفال کو بچانے اور سنبھالنے میں تاریخی کردار کا حامل ہے۔ اس ضمن میں محترم محمد شفیع پورکر کے ہفت روزہ اخبار 'کوکن کی آواز' نے بھی لائقِ تحسین کردار ادا کیا ہے۔ نئے قلمکاروں اور قارئین کی ایک کھیپ تیار کی۔ مرحوم محمد شفیع پورکر کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ بچوں سے قریب ہوئے اور بچوں کو اپنے قریب کیا۔ انھوں نے ہمیشہ بچوں کا ادب لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ انھوں نے 'کوکن کی آواز' کے آدھے صفحے کو بچوں کے لیے مختص کرکے 'ننی پھلواری' کے نام سے پیش کیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ اس صفحے سے ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کی دیگر ضرورتیں بھی پوری کی جارہی ہیں۔ اس طرح 'کوکن کی آواز' ادبِ اطفال کے فروغ میں برابر کا حصہ دار ہے۔ 'بزم فروغ ادب کوکن، مہاڈ'، 'آواز گروپ مہاڈ'، 'نقش کوکن ٹیلنٹ فورم ممبئی'، 'کوکن ٹیلنٹ فورم ممبئی' اور 'کوکن ادبی فارم رتناگری' کی مختلف النوع تقریبات اور کاوشوں کی بدولت کوکن کی درس گاہوں میں بہت سی ادبی اور کلچرل سرگرمیوں کا آغاز ہوا جن سے ادبِ اطفال کو تقویت پہنچی۔

اب وقفے وقفے سے بچوں کے ادب پر اجلاس بھی منعقد ہونے لگے ہیں۔ کانفرنس اور سمینار کا اہتمام بھی کیا جانے لگا ہے۔ 2019 میں شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری نے بچوں کے ادب پر ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں ملک کے اہم ترین اہل قلم نے شرکت فرمائی اور اپنے فکر وفن اور پر مغز تحریروں سے ادبِ اطفال کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو روشن کیا۔ ان

خطۂ کوکن میں بچوں کے ادب کی روایت کو جاندار بنانے میں ماہنامہ 'نقشِ کوکن' ممبئی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ رسالہ ادبِ اطفال کو بچانے اور سنبھالنے میں تاریخی کردار کا حامل ہے۔ اس ضمن میں محترم محمد شفیع پورکر کے ہفت روزہ اخبار 'کوکن کی آواز' نے بھی لائقِ تحسین کردار ادا کیا ہے۔

مقالات کا مجموعہ 'عصرِ حاضر میں بچوں کا ادب' کے نام سے شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری نے 2019 میں شائع بھی کیا ہے۔ دراصل یہ ایک سمینار نہیں بلکہ ادبِ اطفال اور بچوں کے قلم کاروں اور خود ادبِ اطفال کے قارئین کا جشن تھا جس کے چرچے ملک ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی کیے گئے۔ گوگٹے جوگلے کر کالج کا شعبۂ اردو زبان وادب کی ترقی اور نئے لکھنے والے اور نئے قارئین کی تعداد میں اضافے کے لیے مسلسل عمل و حرکت میں لگا ہوا ہے۔ کوکن کے بیشتر اردو ہائی اسکولوں میں 'نقشِ دیوار' کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں طلبا و طالبات اپنے اساتذہ کی مدد سے بچوں کا صفحہ ترتیب دیتے ہیں اور یہ سلسلہ نہایت مقبول ہوچلا ہے۔ اب بچوں اور اسکولوں کے مابین صحت مند مقابلہ آرائی اور مسابقت کے جذبے بھی پنپنے لگے ہیں۔ کمال مانڈلیکر نے مضمون نویسی، ذہنی لیاقت، الفاظ سازی، مباحثہ، تقریری مقابلہ اور جنرل نالج کی روایت کو پھر سے زندہ کردیا ہے۔ مبارک کاپڑی کی رہنمایانہ تحریریں بچوں میں اعلیٰ تعلیم اور اچھے نتائج کی تحصیل کا شعور بھی جگارہی ہیں اور ان میں نیا جوش وجذبہ بھی رچارہی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اردو تنقید نے ابھی تک بچوں کے ادب پر ویسی توجہ نہیں کی جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بدیع الزماں خاور، عبدالرحیم نشتر، ایم مبین، صادقہ نواب سحر، ساغر ملک، مسرت بانو شیخ اور اقبال سالک نے بچوں کے ادب کا جو ذخیرہ فراہم کیا ہے اسے پوری طرح نہ تسلیم کیا گیا نہ ان کا قرض اتارا گیا۔ بچوں کا ادب بھی تنقید و تحقیق کے لائق ہے۔ اس طرف سب سے پہلا قدم ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے اٹھایا ہے۔ انھوں نے ادبِ اطفال کے مسائل اور ان کی ضروریات کے پیش نظر کئی مضامین لکھے۔ 'ہندوستان میں ادبِ اطفال کی موجودہ صورتِ حال'، 'دورِ حاضر میں بچوں کا ادب'، 'کیا بچوں کا ادب، ادب نہیں ہے؟'، 'کوکن کے بچوں میں مطالعے کا فقدان' کے علاوہ بچوں کے شعرا وادبا کی کتابوں پر لکھے گئے پیش لفظ اور مضامین سے ان کی سوچ کا دائرہ، احساس کی شدت اور جذبے کی سچائی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'اردو زبان کا سوتیلا بچہ' کے نام سے 2005 میں شائع ہوچکا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم وادب سے عدم دلچسپی کا ایک بڑا سبب سوشل میڈیا ہے جس کی وجہ سے عصری ادب کی افہام وتفہیم میں مثبت کردار ادا کرنے والے قارئین کی کمی ایک مسئلہ بنتی جارہی ہے، بستیوں سے لائبریریاں غائب ہوگئی ہیں اور ہاتھوں میں موبائل فون آگئے ہیں۔ ہماری نئی نسل جو ابھی ثانوی مدارس میں زیرِ تعلیم ہے کتابوں سے زیادہ موبائل فون میں دل لگارہی ہے۔ اس صورتِ حال کو دور کرنے کے لیے بھی بچوں کے بہترین ادب کی تخلیق بے حد ضروری ہے۔ خطۂ کوکن اس لحاظ سے خوش قسمت رہا ہے کہ اس کو ہر زمانے میں اچھے لکھنے والے میسر آئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ دیارِ کوکن کے قلم کاروں سے ادبِ اطفال روشن ہے اور نئے لکھنے والوں نے اس باب میں پیش رفت کررکھی ہے۔

■

Dr. Mohd. Danish Gani
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College
Ratnagiri - 415 612
Mobile No. 7558600893

محمد رضا اظہری

میر تقی میر
تذکرہ نویس شاعر
(بہ حوالہ نکات الشعرا)

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس طرح اپنی زندگی کے حقائق کو دوسروں تک منتقل کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے اسی طرح دوسروں کی روداد حیات سے بھی آشنا ہونا چاہتا ہے۔ مختلف افراد کے ذکر کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اظہار کو پسند کرتا ہے۔ اسے اس بات کی بھی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اسلاف کے کارناموں سے آشنا ہو۔ تذکرہ وہ ذریعہ ہے جو فن کاروں کی حیات وکارگزاریوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔

دنیا میں نہ جانے کیسی کیسی شخصیات پیدا ہوتی ہیں اور اپنے کارنامے چھوڑ جاتی ہیں۔ زمانے کا طوفان ان کو بھی بہالے جاتا ہے اور کبھی دبیز گرد ڈال دیتا ہے۔ ایسی صورت میں تذکرے انھیں اپنے دامن میں پناہ دیتے ہیں اور عظیم شخصیتوں کی عظمت کے راز سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں بہ الفاظ دیگر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تذکرہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو علم وفن کے مختلف خزانوں کو اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے بلکہ اہم شخصیتوں کے کارناموں کو یادگار زمانہ بنادیتا ہے۔ تذکرے کی اسی افادیت کی بنا پر اسے ادب میں ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر منصور عالم تذکرہ نگاری ایک کمپوزٹ آرٹ ہے، اس سے علم وادب کے کئی سرچشمہ پھوٹتے ہیں: لسانیات، عمرانیات، تاریخ ادب، تنقید و تحقیق، سوانح، خاکہ جیسے اصناف سخن کے علاوہ مختلف ادوار کی مختلف النوع تحریکات نیز دوسرے پہلو بھی اس سے ملحق ہیں۔ میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت شاعر کا ''تذکرۂ نکات الشعرا' بھی اردو ادب میں جام جم کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اردو تذکرہ نگاری کی روایت اور اس کے آغاز کا مشاہدہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ میر نے کس طرح بغیر کسی نمونے کے اس پائے کا تذکرہ تصنیف کیا ہے جو بذات خود ان کی شاعری سے ہٹ کر ان کے علو درجات کے لیے کافی ہے۔

ملک الشعرا، امام المتغزلین، خدائے سخن میر تقی میر 1723 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام میر محمد تقی اور تخلص میر تھا۔ ان کے والد محمد علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ میر کے والد نہایت درویش صفت انسان تھے۔ میر ابھی گیارہ ہی برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی کی بے مروتی کی وجہ سے میر اکبرآباد سے دہلی چلے گئے۔ کافی عرصے تک مختلف رئیسوں اور نوابوں کے یہاں ملازمت کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ یہاں نواب آصف الدولہ کے ملازم ہوئے اور یہیں 89 برس کی عمر میں 1810 کو میر اپنے حقیقی رب سے جاملے۔

یہ دور ٹوٹتی ہوئی قدروں کا دور تھا، غیر مستحکم روایتوں کا دور تھا۔ ایک طرف ہند میں فارسی ادب اپنی تمام تر حلاوتوں اور رعنائیوں کے باوجود مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ روبہ زوال تھا تو دوسری طرف اردو شاعری کا بحر بے کراں دنیائے شعروادب کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے اپنی بانہیں پسارے دنیا ومافیہا سے بے خبر تخیلات کی دنیا میں میر کا منتظر تھا کہ کہیں سے میر آئے اور گیسوئے اردو سنوار جائے، ہر ذی روح گویا میر سے یہ چاہتا تھا کہ

سنوار نوک پلک ابروں کو خم کردے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کردے

اور پھر یہی ہوا، میر ردائے غم اٹھائے مزاج شاہانہ سکندری اور گداگرانہ قلندری کے ساتھ عاشقانہ، رندانہ اور صوفیانہ غزل کے تخت طاؤس پر براجمان ہوئے اور اردو شاعری کو ایک نئی دشا، دشا اور سمت ملی مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ ''میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں، ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی شیرازی کا کلام فارسی میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور شامل ہوگا۔''

میر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے۔ کلام میر کی معنویت آج بھی تسلیم کی جارہی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ بزم کا فن کار رزم میں شاہکار نہیں دیکھا سکتا اور رزم کا سپاہی بزم میں اپنے کمالات کا فن منصۂ ظہور تک بہم نہیں پہنچا سکتا مگر میر کے لیے اس اصطلاح کی تعبیر حقیقت سے تعبیر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کیونکہ جہاں وہ شعروشاعری میں یکتائے روزگار ہیں بعینہٖ اس طرح نثری میدان میں بھی یکہ تاز نظر آتے ہیں. اگر میر کی شخصیت کے آفتاب کی کرنوں میں شاعری اور غزل سے پرے ہوکر دیکھا جائے تو اس سرچشمۂ صلاحیت سے نظم کی شعاعوں کے مماثل اور ہم پلہ نثر کی شعائیں بھی پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ میر صاحب نے نثر میں تین کتابیں تصنیف کی ہیں: فیض میر، ذکر میر، تذکرہ نکات الشعرا

یہ تینوں کتابیں اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی میں تصنیف ہوئی تھیں۔ 'فیض میر' پانچ حکایتیں ہیں جن میں اللہ والوں کے حالات اور کرامات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی آنکھوں دیکھی باتیں لکھی ہیں۔ دوسری کتاب 'ذکر میر' ہے۔ دریائے عشق کی طرح اس کا بھی ذکر تذکروں میں نہیں ہے. صرف اسپرنگر نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ 'ذکر میر' میر کی خودنوشت سوانح عمری ہے اور اس سے میر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تیسرا اور سب سے اہم اور یادگار وزندہ جاوید کارنامہ 'تذکرہ نکات الشعرا' ہے۔ ان کے تنقیدی شعور کی عکاسی نکات الشعرا میں ہوتی ہے۔ سورت (گجرات) کے ایک ذی علم اور نامور شاعر میر عبدالولی عزلت دہلی آئے تھے اور میر تقی میر کی اپنی شہادت کے مطابق یہ تصنیف انھیں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے کے سنہ تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی۔ البتہ آنند رام مخلص کے حال میں یہ فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا جس سے اس کی نسبت قیاس قائم ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''قریب یک سال است کہ در گذشت'' یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیر تالیف تھا اس وقت مخلص کے انتقال کو ایک سال ہو چکا تھا مخلص کا سنہ وفات 1164ھ ہے، لہٰذا یہ قیاس بالکل بجا ہے کہ اس کا سنہ تالیف 1165ھ ہے۔ یہ تذکرہ عہد احمد شاہ میں لکھا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں تذکرہ نویسی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہوگیا تھا اور شعر وسخن اور ادبی مجلسوں کے عام ذوق وشوق نے بھی ادب کی اس شاخ کو بہت تیزی دے دی تھی. میر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں دعویٰ کیا ہے کہ نکات الشعرا اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ ملاحظہ ہو: ''پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعری ست بہ طور شعر فارسی بہ زبان اردوئے معلی شاہ جہان آباد دہلی، کتابی تا حال تصنیف نشدہ کہ احوال شاعران این بہ صفحۂ روزگار بماند. بناء علیہ این تذکرہ کہ مسمی بہ 'نکات الشعرا' است نگاشتہ می شود' بعد کی تحقیق کے مطابق ان کا دعویٰ حق بہ جانب قرار دیا گیا، گو وہی زمانہ ہے کہ جب مخزن نکات مولفہ قائم چاند پوری، تذکرہ ریختہ گویان مولفہ سید فتح علی حسینی گردیزی اور گلشن گفتار مولفہ حمید اورنگ آبادی یہ تمام تذکرے لکھے جارہے تھے مگر سب سے پہلے تکمیل کو پہونچنے والا تذکرہ 'نکات الشعرا ہی ہے۔

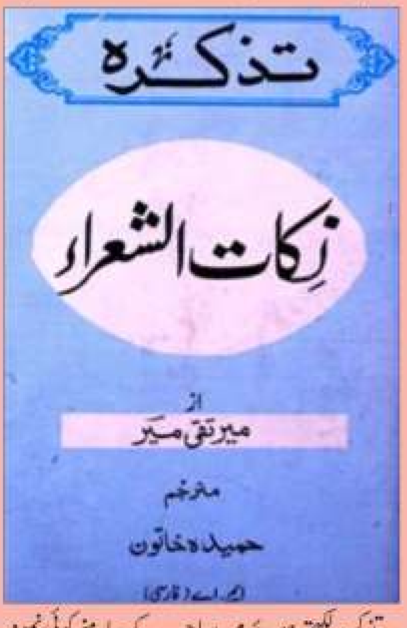

یہ تذکرہ لکھتے ہوئے میر صاحب کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا فارسی شعرا کے تذکرے البتہ وجود میں آچکے تھے مگر میر صاحب کی اختراعی طبیعت نے نکات الشعرا کا بیش بہا تحفہ اردو دنیا کو پیش کیا اور اس کو علم پروری کے نئے اسلوب سے آشنا کیا۔

نکات الشعرا میں بلاشبہ فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی ہے. اس میں شعرا کے کلام اور سیرت پر مختصر فقرے لکھے گئے ہیں لیکن یہ بیانات اس قدر جامع، اس قدر موزوں ہیں اور اتنی صحیح رائیں پیش کی ہیں کہ ذوق اور سخن شناسی کے ساتھ ساتھ میر کے استادانہ کمال کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ نکات الشعرا کی انھیں خصوصیات نے اس عہد کے تنقیدی ذوق کی تربیت میں بہت مدد دی اور آنے والے تذکروں پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ ہماری تنقید بھی اپنی تہذیبی اور تاریخی بنیادوں سے بیگانہ نہیں ہے۔ اس میں بھی وہی انسانی اور سماجی تصویر موجود ہے جو ہماری زندگی میں کارفرما تھی، اس میں ان ہی تہذیبی قدروں پر زور دیا گیا ہے جو اس وقت ہمیں عزیز تھیں۔ اس زوال آمادہ ماحول میں ہمیں معنی و مواد کے مقابلے میں صورت و ہیئت، حرکت اور تبدیلی کے بجائے جمود اور آسودگی اور واقعیت اور اصلیت کے بجائے آرائش وتکلف ہی عزیز ہوسکتا تھا۔ تنقید ایک سماجی عمل ہے اس لیے میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا بھی اپنے عہد کے عمومی رجحانات کا پابند ہے لیکن میر کی ادبی شخصیت اتنی بلند تھی کہ انھوں نے شعروادب کی تمام مروجہ روایتوں کو الہامی سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ ان پر تنقیدی نظر ڈالی، بعض کو قبول کرلیا، بعض سے رشتہ توڑ لیا اور بعض بالکل نئی روایتیں قائم کیں۔ یہ اجتہاد بغیر ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کے ممکن نہیں ہے۔ بہرحال یہ تذکرہ ایک ایسے شاعر کے قلم کا نتیجہ ہے جس نے غزل کی تقدیر بدل دی۔

میر کی تنقیدوں پر سخت اعتراضات ہوئے ہیں۔ ان کی تنقید کو خردہ گیری، عیب چینی اور ہنر پوشی سب کچھ کہا گیا ہے۔ ان معترضین میں خاص طور پر قابل ذکر فتح علی گردیزی (صاحب تذکرہ ریختہ گویاں)، حکیم قدرت اللہ قاسم (صاحب مجموعہ نغز) شفیق اورنگ آبادی (صاحب چمنستان شعرا) مولوی کریم الدین (صاحب طبقات الشعرا) اور مولوی محمد حسین آزاد (صاحب آب حیات) ہیں. میر کی تنقید میں ان کی سیرت پورے طور پر جلوہ گر ہے. دوسروں کی سیرت سے بحث کرتے ہیں لیکن خود ان کے بھی خلوت کدۂ ذات کا حجاب اٹھ گیا ہے اور دوسرے شاعروں کے جوہر پرکھنے میں خود ان کے جوہر بھی درخشاں ہوگئے ہیں۔ میر میں تنقیدی قوت بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کا اظہار بھی وہ بڑی بے باکی اور بے دردی سے کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے لب و لہجے میں تلخی اور ترشی ہے اور اس نے ہمدردی کے اس عنصر کو نقصان پہنچایا ہے جو اچھی تنقید کا لازمی جزو ہے، لیکن بقول ڈاکٹر سید عبداللہ تذکرہ میر کی امتیازی خصوصیت اس کی یہی تلخ تنقید ہے۔ وہ اندھی و بہری عقیدت جو قدیم مشرقی اخلاق کا ایک جزو ہے اور وہ عام رواداری جو اکثر حالات میں ہیرو کے معائب بیان کرنے سے روکتی ہے نکات الشعرا سے عموماً مفقود ہے نکات الشعرا متنازعہ فیہ کتاب رہی ہے۔ میر نے اس میں دوٹوک باتیں بھی کہی ہیں۔ اپنے زمانے کے شعرا کی تنقید بھی کی ہے۔ ان کے اشعار میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان تنقیدوں میں ذاتی عناصر بھی کارفرما ہوں گے جن کی نشاندہی تحقیق نگاروں نے کی ہے اس کو بہتر بنادیا ہے بلکہ آسمان پر پہنچا دیا ہے، محرک بھلے ہی ذاتی پرخاش ہو مگر ان کا فرمانا البتہ مستند ہوا ہے اور

عربی اور فارسی کے مروج اصول تنقید کو مد نظر رکھتے ہوئے نکات الشعرا میں ربط کلام، خوش فکری، تلاش لفظ تازہ، صفائی گفتگو، ایجاد مضامین، تہہ داری، درد مندی اور طرز خاص کے اصولوں پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ نکات الشعرا کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ میر تقی میر نے ضروری نہیں سمجھا کہ شاعروں کے حالات زندگی اور خاص گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔

کسی نے بعد میں اس کو مسترد نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا تنقید ایک سماجی عمل ہے تو اس سے سماجی حالات بھی واضح ہو سکتے ہیں۔ تذکرۂ نکات الشعرا میں میر کی تنقیدوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

1 اس زمانے میں ہندو اور مسلمان میں بڑا اتحاد اور میل جول تھا اور بعض شعرا قید مذہب وملت سے آزاد تھے۔
2 اہل قلم اہل سیف بھی تھے اور سخن فہمی اور شمشیر شناسی میں تضاد نہیں تھا۔
3 درویشی اور شاعری دوش بدوش چلتی تھی۔
4 زمانے پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا اس لیے بعض شعرا ہزل کی طرف مائل تھے۔
5 مشاعرے معاشرے کا جزو لاینفک بن گئے تھے اور ان کی حیثیت ادبی جلسے کی ہی نہیں تھی، تنقیدی ادارے کی بھی تھی۔
6 سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی بھی زوال پذیر تھی اور اس کی خاکستر اردو کے لیے سامان وجود بن گئی تھی۔

یہ سماجی حالات اس جگہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔

عربی اور فارسی کے مروج اصول تنقید کو مد نظر رکھتے ہوئے نکات الشعرا میں ربط کلام، خوش فکری، تلاش لفظ تازہ، صفائی گفتگو، ایجاد مضامین، تہہ داری، درد مندی اور طرز خاص کے اصولوں پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ نکات الشعرا کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ میر تقی میر نے ضروری نہیں سمجھا کہ شاعروں کے حالات زندگی اور خاص گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ اگر کہیں کوئی ذکر ہے بھی تو تسلی بخش نہیں ہے۔ تصویر کو مکمل کرنے یا معمہ کو حل کرنے کے لیے محقق کو دیگر ذرائع سے مدد لینی پڑتی ہے، لیکن یہ ہلکے اشارے بھی بڑے دلچسپ اور گتھیاں سلجھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نکات الشعرا میں تقریباً 30 شاعروں کے ذکر میں صرف ان کے نام اور تخلص کے ساتھ اشعار نقل کر دیے گئے ہیں۔ 64 شاعروں کے حالات میں میر نے ان کی شعری تخلیقات کے حسن و قبح سے متعلق کوئی بحث نہیں اٹھائی ہے، لیکن دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں سیرت و شخصیت کی ایسی دلکش تصویریں کھینچی گئی ہیں کہ اختصار کے باوجود یہ زندگی سے بھرپور جیتی جاگتی اور جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔

مطبوعہ نسخوں کے مطابق نکات الشعرا 103 ریختہ گو شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ میر نے یہ تذکرہ بڑی روا روی میں لکھا۔ ان کے سامنے شعرا کی ترتیب کا کوئی اصول نہیں تھا۔ انھوں نے شعرا کی تقسیم نہ تو طبقات کے لحاظ سے کی اور نہ ان کا ذکر حروف تہجی یا حروف ابجد کی ترتیب سے کیا۔ تذکرے کا آغاز شمالی ہند کے شاعروں کے ذکر سے ہوتا ہے اور دیباچے میں اس کی وضاحت بھی کردی ہے:

"اگر چہ ریختہ در دکن است، چون از آن جا یک شاعر مربوط برنخاستہ لہذا شروع بہ نام آن حا کردہ و طبع ناقص مصروف این ھم نیست کہ احوال اکثر آن حا ملال اندوز گردد، مگر بعضی از آن حا نوشتہ خواھد شد۔ ان شاء اللہ تعالی امید کہ بہ دست ہر صاحب سخنی بیاید بہ نظر شفقت بکشاید۔"

ڈاکٹر محمود الٰہی کا قیاس ہے کہ:

"شعرائے دکن والے حصہ کی بات کسی قدر سمجھ میں آتی ہے۔ یہ حصہ عبدالولی عزلت کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ عزلت 1164ھ کے وسط میں دہلی آئے۔ ان کی ملاقات میر سے بھی ہوئی۔ میر نے ان کی بیاض سے بھرپور استفادہ کیا۔ جوں ہی میر کو عزلت کی بیاض ملی ہوگی انھوں نے اس کی مدد سے اپنے تذکرے میں شعرائے دکن کا حصہ شامل کر لیا اور پھر شمالی ہند کے باقی شعرا کا ذکر مکمل کر لیا۔" تذکرے کا آغاز امیر خسرو دہلوی سے ہوتا ہے اور میرزا عبدالقادر بیدل دہلوی، رائے آنندرام، ولی اورنگ آبادی (دکنی)، سید عبدالولی عزلت، سراج اورنگ آبادی، لالہ ٹیک چند بہار جیسے نامی شعرا کے ذکر سے ہوتے ہوئے میر عزت اللہ بیکدل کے احوال پر اختتام پذیر ہوتا ہے البتہ اس کے بعد حسن خاتمہ شاعر کا خود اپنا نہایت مختصر تعارف مگر طویل اشعار سے ہوتا ہے۔ اعجاب کی بات تو یہ ہے کہ میر نے اردو (ریختہ) شعرا کے حالات بیان کرنے کے لیے فارسی زبان اختیار کی ہے اور اردو اور فارسی زبان پر یکساں عبور کا مسلم ثبوت دیا ہے۔ فارسی زبان کا انتخاب کرنا اس زبان کی افادیت، عام و سہل پسند اور رائج زبان ہونے پر دلالت کرتی ہے مگر بات یہ بھی تو ہے کہ جس شاعر کو اردو غزل کا شہنشاہ کہا جاتا ہے اگر وہ اس تذکرے کو اردو میں لکھتا تو پھر کیا عالم ہوتا اگر پھر بھی اس باغ کی سیر کرتے ہوئے 'ماتشتہیہ الانفس و تلذ الاعین' کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نکات الشعرا کی اہمیت کئی طرح سے ہے۔ اول تو یہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے اس لیے اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ دوم یہ تذکرہ میر تقی میر نے لکھا جو خود ایک عظیم شاعر ہیں۔ سوم اس میں ڈھائی سو برس قبل کے اردو شعرا کے بڑے شگفتہ اور نایاب و کامیاب خاکے ہیں اور ان کے بہترین اشعار ہیں۔ چہارم اس میں اردو شاعری کی تنقید کے اولین خد و خال نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کے تنقیدی پیمانے ہیں جو اب گم ہو گئے ہیں۔ کلاسیکی شاعری کو کلاسیکی کسوٹیوں کے ساتھ اگر پڑھا جائے تو شاید سخن فہمی کا حق زیادہ ادا ہوگا اور کیا خبر ان پیمانوں کی آج بھی ضرورت ہو، اس لیے ان کو سامنے آنا چاہیے۔ پنجم یہ کہ میر کے تنقیدی پیمانے جان کر ہم ان کی شاعری کا بہتر شعور کر سکتے ہیں۔

منابع و مآخذ

1 اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری: ڈاکٹر فرمان فتح پوری :ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان 1998
2 اردو تذکرہ نگاری 1835 کے بعد: ڈاکٹر نیاز سلطان پوری: ناشر ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، دسمبر 1998
3 تذکرہ نکات الشعرا: میر تقی میر: مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، ناشر انجمن ترقی پاکستان، 1979
4 تذکرہ نکات الشعرا: میر تقی میر: مترجم حمیدہ خاتون، ناشر حمیدہ خاتون، 1994
5 مجموعہ مقالہ جات: ایک روزہ قومی سیمینار 'اکیسویں صدی میں کلام میر تقی میر کی معنویت'، ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2014
6 محمد تقی میر: ڈاکٹر جمیل جالبی: ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1990
7 تذکرہ نکات الشعرا: میر تقی میر: مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1984
8 میر تقی میر حیات اور شاعری: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2015
9 بہار میں تذکرہ نگاری: ڈاکٹر منصور عالم: وی آرٹس پریس، سلطان گنج پٹنہ، مارچ 1980

■

Mohd Reza Azhari
Research Scholar, Dept of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 7985371677

وحشت کا تصور اور میر و غالب

مہر فاطمہ

کلاسیکی شعرا کے یہاں 'وحشت' کا مضمون جا بہ جا ملتا ہے، حالانکہ وحشت کے مضامین کے تعلق سے یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ جدیدیت کے پیدا کردہ ہیں۔ حقیقتاً کلاسیکی شعرا نے وحشت سے متعلق کیفیات کو بیشتر اشعار میں بیان کیا ہے۔ کلاسیکی شاعری کے مطالعے کے درمیان تواتر سے کئی اشعار وحشت سے متعلق گزرے، جس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ اس موضوع کے بھی اشعار الگ کر کے دیکھا جائے، لہٰذا اس مضمون سے متعلق اشعار کی تلاش شروع کی گئی، جس سے اندازہ ہوا کہ کم وبیش ہر شاعر کے یہاں یہ موضوع آیا ہے اور تمام شاعروں نے اپنے تخیل کی مدد سے مختلف انداز میں اس کو باندھا ہے۔

فیروز اللغات میں وحشت کے یہ معنی ہیں مثلاً بے چینی، دم الٹنا، غیر مانوسی، بھیانک پن اور ویرانہ پسندی وغیرہ۔ اس کے علاوہ دہشت، خوف، ڈر اور ہیبت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس سے غیر مانوسی، نفرت جیسی جنگلی جانوروں میں ہوتی ہے وہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ وحشت کے مترادفات آوارگی، اداسی، اضطراب، بھڑک، جنوں، جہالت، حیوانیت، خوف، دھڑکا، دہشت، دیوانگی، رسیدگی، سودا، ضبط، گھبراہٹ، نفرت اور ہیبت وغیرہ ہیں۔ وحشت سے متعلق کہاوت، محاورے اور ضرب المثل وغیرہ کچھ اس طرح ہیں اپنے سایے سے وحشت کرنا، اپنے سایے سے وحشت ہونا، اپنے سایے سے بچنا یا بھڑکنا، سایے سے وحشت ہونا، وحشت برسنا اور وحشت ٹپکنا وغیرہ۔

کلاسیکی اردو شاعری میں عشق کی کیفیات سے متعلق یا جڑی ہوئی ایک کیفیت وحشت بھی ہے۔ اس مضمون کو تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو کی کلاسیکی شاعری میں وحشت کچھ اس معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ جب عاشق جنون اور دیوانگی کی آخر حد پر پہنچ جاتا ہے تو وحشت میں صحراؤں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ عاشق کی اسی کیفیت کو وحشت سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی مدنظر رہے کہ ہر شاعر کے یہاں وحشت کی صورت مختلف ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں الگ الگ مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے وقت اور حالات کے مطابق شاعر اس موضوع کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ اس کا اپنا منفرد انداز بیان ہوتا ہے۔ کوئی بھی شاعر کسی بھی مضمون کو باندھتا ہے تو اس میں اس کی شخصیت کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اس کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر کے یہاں عشقیہ جذبات میں بڑی توانائی ہے تو اس کے یہاں وحشت بھی اسی پائے کی موجود ہے۔ یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ اس کو کس معنی میں استعمال کرتا ہے؟ اور اس میں کس طرح جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وحشت کی کس منزل پر خود کو دکھانا چاہتا ہے اور وحشت کے مضمون میں تخیل کی مدد سے کس طرح سے جدت پیدا کرتا ہے۔ اگر بات کریں میر کی تو میر کے اس مضمون سے متعلق تقریباً پچاس اشعار ہیں۔ جن میں سے کئی اشعار زیادہ مشہور ہیں۔

مثلاً بہت ہی مشہور شعر ہے۔

سر زد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

یعنی عاشق وحشت کی اس کیفیت میں بھی محبوب یا معشوق کی بے ادبی سے خوف کھا رہا ہے۔ اس کو اسی بات کا خیال ہے کہ کہیں اس کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے اور ساتھ ہی کہ وحشت اس قدر طاری ہے کہ محبوب کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس حالت بے خودی میں اس کو نہ اپنی خبر ہے نہ کچھ اور پتہ۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ محبوب کی عزت کا پاس ولحاظ کر رہا ہے، اور پاس ولحاظ تک ہی بات ہوتی تو پھر بھی ٹھیک تھا وہ نہ صرف پاس ولحاظ کر رہا ہے بلکہ ساتھ ساتھ سجدہ بھی کرتا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وحشت کی اس کیفیت میں اس کو محبوب کے سوا ہر چیز کا خیال مٹ گیا ہے۔ وہ خود کو محبوب کے حوالے کرتا جا رہا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جنون کی وہ شدت ہے کہ شاعر محبوب کے راستے سجدہ کرتا جاتا ہے۔ اس میں جنوں کی شدت، وحشت کا کرب اور محبوب سے عشق کا ایک طاقتور اور توانا جذبہ موجود ہے۔

چند اشعار مزید۔

میں صید رمیدہ ہوں بیاباں جنوں کا
رہتا ہے مرا موجب وحشت مرا سایہ

دور بہت بھاگو ہو ہم سے دیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

وحشت سے بہت میر کو مل آیئے چل کر
کیا جانئے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی

وحشت زدوں کو نامہ لکھوں ہوں نہ کس طرح
مجنوں کو اس کے حاشیے پر میں دعا لکھوں

میر کو وحشت ہے گی قیامت واہی تباہی بکتے ہیں
حرف وحکایت کیا مجنوں کی دل میں کچھ مت لاؤ تم

بدنامی کیا عشق کی کہئے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی دنیا دنیا تہمت تھی

عالم عالم عشق وجنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

اس طرح اشعار میں وحشت کی الگ الگ کیفیات بیان ہوئی ہیں، مثلاً کبھی خود کو وہ صید رمیدہ کہا جو اپنے سائے سے ڈرا ہوا ہے۔ کبھی غزالوں کی وحشت بیان کی گئی، کہیں پر وحشت میں دور نکل جانے کا ذکر کیا ہے جہاں سے کچھ خبر نہیں آسکتی۔ کہیں وحشت میں مجنوں سے بھی سبقت لے جانے کا ذکر ہے۔ کہیں مجنوں کی وحشت کو اس قدر کم دکھایا گیا ہے کہ حاشیے میں یونہی ذکر کر کے دعا لکھ دیتے ہیں۔ کبھی وحشت میں اپنے سائے سے خوف کھانے کو خامہ سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جس طرح خامہ اپنے سایے سے بھاگتا ہے بالکل ویسے ہی اس عشق میں تمہیں بھی وحشت ہو جائے گی یا ہوگئی ہے۔ وحشت میں واہی تباہی بکنے کا بھی ذکر ہے۔ بالکل یہی مضمون غالب

کے یہاں بھی ہے لیکن وحشت کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف جنوں کا ذکر کیا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اس مضمون یعنی وحشت کے تعلق سے بھی غالب کے یہاں میر سے بالکل مختلف صورت نظر آتی ہے۔ غالب نے بھی انھیں تمثیلوں اور تشبیہوں کا استعمال کیا ہے لیکن بالکل منفرد اور نادر بات پیدا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے تمام نقاد بھی اس امر پر متفق ہیں کہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا انداز بیان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے اس کو 'طرز ادا' سے تعبیر کیا ہے۔ کسی نے 'جدّت ادا' سے اور کسی نے 'جدّت طرازی' سے، کسی نے 'طرفگی ادا' سے کسی نے 'ادائے خاص' سے اور کسی نے 'جدّت بیان' سے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے یہاں وہ جدّت طرازی ہے جو زبان، تراکیب، خیالات، محاکات، الفاظ، تشبیہات، استعارات اور کنایات غرض کہ تمام لوازم شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ جو عام روش سے ہمیشہ الگ چلنے کا رویہ ان کے یہاں ملتا ہے وہ موجود ہے۔ اس لیے انھوں نے اس مضمون کو بھی ایک نیا رنگ دیا ہے چند اشعار دیکھیں۔

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کے یہاں دیگر شعرا کے مقابلے اغراق کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ وہ مبالغے کی حد تک کم ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اکثر وہ مضمون کو اغراق کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وہی صورت ہے۔ کہتے ہیں کہ جوہر اندیشہ کی گرمی کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ وحشت کا خیال آتے ہی صحرا ہی جل کر راکھ ہوگیا۔ وحشت، صحرا اور گرمی سب ایک دوسرے کی رعایت سے لائے گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ کہ صحرا تو خیال صحرا نوردی سے ہی جل گیا اب میں اپنی طبیعت کی گرمی کا مظاہرہ کروں تو کیا کروں؟

چند اشعار اور دیکھیے۔

احباب چارہ سازی وحشت نہ کرسکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بے تاب تھا
شوخی وحشت سے افسانہ فسون خواب تھا
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر
یہ کیا وحشت ہے ارے دیوانے از مرگ واویلا
رکھی بے جا بنائے خانۂ زنجیر شیون پر
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے
وحشت آتش دل سے، شب تنہائی میں
صورت دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

پہلے شعر میں کہا کہ دوستوں نے میری وحشت کا ازالہ کرنے کے لیے مجھے محبوس کردیا۔ مگر قید سے چارہ سازی وحشت نہ ہوسکی، کیونکہ میں نے تصور میں صحرا نوردی شروع کردی۔ جسم، زنداں میں رہا تو کیا ہوا؟ خیال تو بیاباں نورد تھا۔ خیال کو بیاباں نورد کہہ کر جو انھوں نے افسانہ بنایا یعنی کہ قید کی حالت میں میری وحشت ختم نہیں ہوئی۔ میں نے تصور میں صحرا نوردی شروع کردی۔ اس تصور کو انھوں نے خیال کو بیاباں نورد کہہ کے حقیقت میں بدل دیا کیونکہ خیال کسی کا بھی کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا ہے۔ دیگر اشعار میں کہیں دنیا کو وحشت کدہ کہا اور خود کو مانند شمع اپنا سروسامان شعلۂ عشق کو قرار دیا۔ کہیں اپنی وحشت پر ہائے ہائے یعنی نالہ اور آہ وزاری ہے۔ کبھی شب تنہائی میں اپنے سایے کو خود سے مثل دھواں بھاگتے ہوئے بتاتے ہیں۔ میر کے یہاں بھی بالکل یوں ہے۔ اسی مضمون کو باندھا ہے انھوں نے صورت خامہ سے تشبیہ دی اور غالب نے صورتِ دود کہا۔ غالب کے ہی دو اشعار مزید۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

پہلے شعر میں کہا کہ مجنوں کا دروازہ چونکہ مجنوں کا گھر یعنی جنگل اور جنگل میں دروازہ ہی نہیں ہے کہ اسے بند کیا جائے تو لیلیٰ کو وہاں جانے سے آخر روکا کس نے۔ دوسرے شعر میں کہا کہ یہ عالم دراصل فریب نظر ہے جس کا حقیقی وجود نہیں۔ یعنی دیکھو تو نظر آتا ہے لیکن غور کرو تو کچھ نہیں ہے۔ جس طرح شعلۂ جوالہ کی گردش سے اگرچہ دائرہ نظر آتا ہے مگر اصل میں اس کا وجود نہیں۔ لہٰذا اے نادان تو کب تک اس امر معدوم (فریب نظر) کو اپنا محبوب سمجھتا رہے گا۔ اس شعر میں 'غبار وحشت مجنوں' امر معدوم کا کنایہ ہے۔ وحشت کا غبار ایک اعتباری چیز ہے۔ اس طرح اس میں بے ثباتی عالم کی طرف اشارہ ہے۔

ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ کھلا

یعنی جادۂ وحشت گویا شیرازہ ثابت ہوا جس کی بدولت دونوں عالم کے اجزائے پریشاں مجھ پر منکشف ہوگئے۔ یعنی عشق میں ساری کائنات مجھ پر عیاں ہوگئی۔ یہاں وحشت کو عشق کے کنایے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور بہار کی مناسبت سے سبزہ، صبا اور گل کو اس شعر میں یکجا کیا گیا لیکن تینوں کے شیرازہ کو بکھرتا ہوا دکھایا اور اس کے لیے انھوں نے تینوں کی خاص صفت استعمال کی یعنی سبزہ کے ساتھ بیگانگی، صبا کے ساتھ آوارگی اور گل کے ساتھ نا آشنائی۔ یہ غالب کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اسی طرح میر اور غالب کے یہاں وحشت کا استعمال مختلف انداز میں ہوا ہے۔ وحشت دل پر بے شمار اشعار نظر سے گزرے ہوں گے مگر ان اشعار کا انتخاب بے ساختگی اور دیگر فنی خصوصیات کے مدنظر کیا گیا ہے۔ ان اشعار میں نہ تو کہیں کوئی بہت پیچیدہ بات آئی اور نہ ہی کہیں کوئی بھاری بھرکم تشبیہ و استعارے کا استعمال ملتا ہے۔ میر کے یہاں وحشت میں سایے سے بھاگنا، بگولہ کی خامہ سے تشبیہ دی گئی۔ وہیں غالب کے یہاں دیگر مضامین وحشت کے پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اس مضمون کو شعری پیکر عطا کیا ہے، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں میر اپنی طرز خاص یعنی بے ساختگی اور سادگی کو کام میں لاتے ہیں۔ وہیں غالب اپنے مخصوص انداز جس کو ہم جدّت طرازی، طرفگی ادا، ادائے خاص، جدّت بیان، کہتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے یہاں وہ جدّت طرازی ہے جو زبان، تراکیب، خیالات، محاکات، الفاظ، تشبیہات، استعارات اور کنایات غرض کہ تمام لوازم شاعری کا استعمال ملتا ہے۔ انھی خصوصیات کی بنا پر تو میر تقی میر اردو شاعری میں 'میر' ہوئے اور اسداللہ خاں غالب، 'غالب' بنے۔ مختصراً یہ کہ وحشت کا مضمون ہمارے کلاسیکی شاعروں کے یہاں بھی موجود ہے۔ جس کی مثال میر اور غالب کی شاعری سے پیش کیا گیا اور اس مطالعے میں دونوں کے مخصوص انداز بیان پر بھی روشنی ڈالی گئی کہ دونوں نے اس ایک ہی مضمون کو کس کس انداز سے باندھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے یہ ایک کلاسیکی مضمون ہے، جس میں جدید شاعر بھی اپنے انداز میں طبع آزمائی کرتا ہے اور اس خاص مضمون میں اپنے تخیل سے کوئی نیا پہلو نکالتا ہے جیسا کہ کلاسیکی شاعروں کے یہاں بھی موجود ہے۔

■

Mehar Ekta
A007, Saranya Sarovar Apartment
Hugdur Main Road, Whitefield
Banglore- 560066 (Karnataka)
Mob.: 9555949032

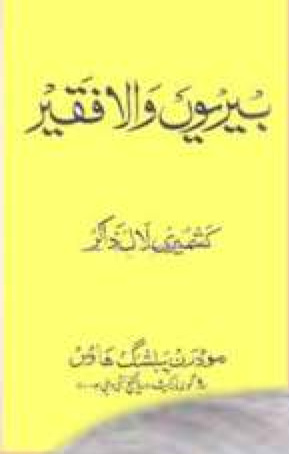

رودر شکتی جی مہاراج

کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری

کشمیری لال ذاکر کا شمار اردو کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس دور میں قلم اٹھایا جب کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ جیسے ناول نگار اپنی اردو ناول نگاری میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے۔

1950 ذاکر صاحب کی زندگی کا ایسا دور ہے جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل کر رکھ دیا۔ دراصل ایک طویل علالت کے بعد آپ کی بیگم شریمتی شیلا دیوی کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے یہ صدمہ تو برداشت کر لیا لیکن اس تاثر کو کئی سالوں تک فراموش نہیں کر سکے۔ چونکہ ذاکر صاحب اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے ناول 'سیندور کی راکھ' میں واضح طور پر کیا ہے۔ جب یہ ناول منظر عام پر آیا تو اسے ادبی دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مکتبہ جامعہ شاہراہ دہلی کے مالک شاہد احمد دہلوی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ذاکر صاحب کا جھکاؤ ابتدا سے رومان کی طرف رہا اور 'سیندور کی راکھ' ان کا پہلا ناول ہے جس میں ان کی اپنی سرگزشت ہے اس میں ان کی اپنی زندگی کا شاید غم ہے اور اسی ناول میں غم جاناں کو غم دوراں پر فوقیت ہے۔ ذاکر صاحب کی رنگین بیانی، منظر نگاری اور ماحول کی عکاسی اس ناول میں پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہے اس جزئیات نگاری پر ذاکر صاحب کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہے کہ وہ قاری کو ابتدا ہی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ازدواجی زندگی کے شیریں اور طرب انگیز اسرار و رموز سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھتا ہے۔'' (کشمیری لال ذاکر 'سندور کی راکھ' ص ۸)

'سیندور کی راکھ' ذاکر صاحب کا ایسا ناول ہے جو کوئی خیالی یا تصوراتی نہیں ہے بلکہ یہ ان کی زندگی کی حقیقی ترجمانی کرنے والا ایسا ناول ہے جسے ہم خالص جذباتی اور تاثراتی ناول کہہ سکتے ہیں۔ یہ 1950 میں ادبی دنیا سے شائع ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذاکر صاحب نے اس تصنیف میں اچھوتی تکنیک کا استعمال کیا ہے یا کم از کم اس تکنیک کا چلن اس وقت عام نہیں تھا۔ انھوں نے اسے سچے واقعات کو سرگزشت اور ڈائری کے تکنیک کو ملا کر تحریر کیا ہے۔ اس ناول کا اصل موضوع ان کی شریکِ حیات کا دنیا سے گزر جانے کا غم ہے۔

'سیندور کی راکھ' کے بعد ناول لکھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آخری سانس تک اسی جوش و خروش کے ساتھ قائم رہا۔ انھوں نے 29 ناول تحریر کیے ہیں اور ہر ناول میں موضوع و مسائل کے اعتبار سے ایک نئی روشنی و ندرت پائی جاتی ہے۔ ان کے ناولوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جدید موضوعات کو مدنظر رکھ کر اپنے ناولوں کی تخلیق کی ہے۔

انھیں اردو کے ادبی حلقوں میں خاصی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انگوٹھے کا نشان، میرا گاؤں میری زندگی ہے، کرماں والی، دھرتی سدا سہاگن، ڈوبتے سورج کی کتھا وغیرہ ایسے لاجواب ناول ہے جن میں ذاکر صاحب کا فن اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور یہ ناول کی فنی پختگی اور فنکارانہ چابکدستی کی روشن مثال ہے۔ ان ناولوں میں انھوں نے دیہی زندگی کو بنیاد بنا کر کسانوں، مزدوروں، عورتوں، بوڑھوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کی

کوشش کی ہے۔ ناول 'کرماں والی' اور 'ڈوبتے سورج کی کتھا' تقسیم ہند سے متاثر ہے لیکن ان کا مرکز بھی گاؤں ہی ہے حالانکہ ان ناولوں میں کہیں کہیں شہر کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اس کے بر خلاف میرا شہر ادھورا سا، اب مجھے سونے دو، لمحوں میں بکھری ہوئی زندگی، ایک شہر ایک محبوب وغیرہ ناولوں میں ذاکر صاحب نے شہر کی چکا چوندھ بھری زندگی کی عکاسی کی ہے۔ Modernity کے نام پر اپنے تہذیب و کلچر سے دور بھاگتے لوگوں کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ جدید تمدن نے کس طرح انسانی تہذیب کو متاثر کیا، ان پر غلط اثر ڈالا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئی نسل کس طرح آزادی کے نام پر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان بھی پہلوؤں پر غور وفکر کیا اور اپنے ناولوں میں انھیں جگہ دی۔ کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری کے ذیل میں عبدالمغنی مرحوم یوں رقمطراز ہیں:

''کشمیری لال ذاکر کے متعد ناولوں میں سے انگوٹھے کا نشان، کرماں والی، دھرتی سدا سہاگن اور 'ڈوبتے سورج کی کتھا' زیادہ پسند ہیں۔ ان سب ناولوں کا تعلق دیہات سے ہے۔ گرچہ ان پر شہری زندگی کی کچھ پرچھائیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ ان میں 'کرماں والی' اور 'ڈوبتے سورج کی کتھا' تقسیم ہند کے اثرات کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں پنجاب کا ماحول اور معاشرہ ہے۔ بہ طور خاص ان ناولوں کے نسوانی کردار اپنے عمل اور اپنے کرداروں سے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔''

(عبدالمغنی 'کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری' مشمولہ 'فن و شخصیت نمبر' کشمیری لال ذاکر، ص86)

ذاکر صاحب کے ناولوں میں ایک اور اہم موضوع غربت، بھوک اور افلاس کا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ان کے ناولوں میں ضرور مل جاتا ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے اپنی ترقی پسندی اور اشتراکیت کو اجاگر کیا ہے، کیونکہ ذاکر صاحب نے اس دور میں قلم اٹھایا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا تھا وہ ادب برائے ادب کے تحت تھا اب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو کچھ لکھا جا رہا تھا اس میں ادب برائے زندگی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب کے بیشتر ناولوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔

جب ملک تقسیم ہوا اور آزادی وجود میں آئی تو اس وقت جو افراتفری کا عالم تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس میں صرف انسان کے جذبات اور دل تقسیم نہیں ہوئے تھے بلکہ اس تقسیم نے ہندو مسلم فرقوں میں جو نفرت کی آگ بھڑکائی تھی اس کا اثر سماج کے ہر فرد پر پڑا۔ ذاکر صاحب نے 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کا صرف جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ اسے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ یعنی ذاکر صاحب تقسیم کے المیے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے ناول کرماں والی، ڈوبتے سورج کی کتھا، لمحوں میں بکھری ہوئی زندگی میں جو تاثرات اور جذبات بیان کیے ہیں وہ

کشمیری لال ذاکر کے متعد ناولوں میں سے انگوٹھے کا نشان' کرماں والی' دھرتی سدا سہاگن اور ڈوبتے سورج کی کتھا' زیادہ پسند ہیں- ان سب ناولوں کا تعلق دیہات سے ہے- گرچہ ان پر شہری زندگی کی کچھ پرچھائیاں بھی دکھائی گئی ہیں- ان میں کرماں والی' اور ڈوبتے سورج کی کتھا' تقسیم ہند کے اثرات کے آئینہ دار ہیں- ان میں پنجاب کا ماحول اور معاشرہ ہے-بہ طور خاص ان ناولوں کے نسوانی کردار اپنے عمل اور اپنے کرداروں سے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں-

اس دور کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ جس وقت ملک تقسیم ہوا ذاکر صاحب پشاور میں تھے اور آج بھی وہ علاقہ جسے آپ کا آبائی وطن کہا جاتا ہے یعنی قصبہ کنجاہ ضلع گجرات (پشاور) یہ علاقہ اب پاکستان میں ہے ایسی صورت میں فسادات کا ذکر ذاکر صاحب کے ناولوں میں فطری عمل ہے۔ بقول ذاکر صاحب:

''1947 کی جو نسل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اسے محرومی اور جدائی کا جو احساس ہوا، اس میں ایک تیکھا درد، انوکھی کسک اور دم گھونٹ دینے والی تلخی تھی۔ یہ تلخی سرحد کے دونوں پار صف باندھے کھڑے ان لوگوں کے دلوں میں رچ رہی تھی جو اپنی آنکھوں میں انتظار کے چراغ جلائے ایک ایسی صبح کے منتظر تھے جب ان کے عزیز دوست رشتہ دار محبوب بنا کسی رکاوٹ کے ان کے قریب آکر ان سے گلے ملیں کے اور خوشی کے بھرپور احساس سے نکلے آنسوؤں سے وہ خلیج بھر جائے گی جو اب تک ان کے درمیان پھیلی تھی۔''

(خلیق انجم، بہ جہت شخصیت' نند کشور وکرم، کشمیری لال ذاکر فن و شخصیت، دہلی عالمی اردو ادب 2009، ص302)

ذاکر صاحب کے ناولوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں کا موضوع دور حاضر کے مسائل کو بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک آزاد ہوا اور زمیندارانہ نظام ختم ہو گیا لیکن اس کے باوجود بھی ایک مزدور اور کسان کی حالت نہیں سدھری اور نہ ہی ان کی غربت اور پسماندگی میں خاطر خواہ تبدیلی ہوئی بلکہ غریبی اور مفلسی اسی طرح برقرار رہی تو ذاکر صاحب نے کئی خوبصورت ناول تحریر کیے مثلاً 'انگوٹھے کا نشان' بھولے بھالے اور ان پڑھ مزدوروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ تو وہی 'بنجر بادل' ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے گاؤں کی پسماندگی، قحط سالی اور طوفان سے رونما ہونے والے مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے علاوہ 'سمندر صلیب اور وہ'، 'بلیک باکس' میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کے بعد بھی ہمارے گاؤں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اردو ناول نگاری میں مرد کے مقابل عورت کی سماجی اور نفسیاتی صورت حال پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے عورتوں کو موضوع بنا کر کئی ناول تخلیق کیے ہیں۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ عورت کا سراپا محبت ہے جو ہر رشتے، ہر روپ میں صرف محبت لٹاتی ہے۔ بیٹی بن کر ماں باپ کو، بہن بن کر اپنے بھائی کو، بیوی کی صورت میں شوہر کو اور ماں بن کر اپنی اولاد کو صرف پیار دیتی ہے۔ عورت نفسیاتی اعتبار سے بھی بہت حساس ہوتی ہے۔ اب مجھے سونے دو، کرماں والی، لمحوں میں بکھری زندگی، سمندر خاموش ہے، میرا شہر ادھورا سا، پربھات جیسے ناولوں میں عورتوں کے مسائل اور ان کے مختلف زاویوں کو انھوں نے نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے۔ 'اب مجھے سونے دو' ذاکر صاحب کا ایک عورت کے جنسی، سماجی اور نفسیاتی مسائل کے حوالے سے عمدہ ناول ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنے ناولوں میں زمان اور مکان کے تعلق سے کشمیر، چنڈی گڑھ اور ہریانہ کو برجستہ پیش کیا

ہے جس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ذاکر صاحب کا بچپن اور تعلیم کا زمانہ ریاست جموں کشمیر میں گذرا۔ ملازمت کی ابتدا پنجاب سے کی اور پھر ہمیشہ کے لیے ہریانہ منتقل ہو گئے۔ اس لیے جموں کشمیر کی حسین وادیاں اور وہاں کے واقعات منظر نگاری کی شکل میں آپ کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کشمیر ہو، ہریانہ کے گاؤں ہوں یا پنجاب کے دیہی علاقے ان سب کے مقابلے میں ذاکر صاحب نے چنڈی گڑھ کو بہت ترجیح دی۔ آپ نے ہر اعتبار سے چنڈی گڑھ کے ہر پہلو کو ابھارا ہے۔ لہٰذا 'میرا شہر ادھورا سا'' ماڈرن سٹی چنڈی گڑھ پر لکھا گیا بہترین ناول ہے۔

اس طرح ذاکر صاحب نے گاؤں اور شہر سے جڑے ہوئے ہزاروں مسائل کو پیش کیا ہے۔ اگر ان کے ناولوں میں تکنیک کا جائزہ لیا جائے تو ہر ناول میں انھوں نے موضوع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر ناولوں میں شعور کی رو (Stream of Conciousness) کا استعمال کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے ناولوں میں فلیش بیک کی تکنیک کا بھی استعمال کرتے ہیں اور ان کے ناول واحد متکلم سے شروع ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ان کا ناول 'کرماں والی' کی کہانی میں واحد متکلم کے صیغے کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس ناول کی ابتدا 'میں' کے عنوان سے ہوتی ہے اور کرماں والی اپنی پوری داستان سناتی ہے۔ اسی طرح 'میرا شہر ادھورا سا' میں رچنا اپنی اور ایک ادھورے شہر کی کہانی بیان کرتی ہے۔ 'سمندر خاموش ہے' میں بھی شکیل اپنی کہانی سناتا ہے۔ 'لمحوں میں بکھری زندگی' میں ارچنا اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لیتی ہے کہ آخر اس نے اب تک کیا کھویا اور کیا پایا۔

جہاں تک ذاکر صاحب کے اسلوب کا تعلق ہے تو اس پر ان کو مہارت حاصل ہے کیونکہ ان کا اسلوب نہایت ہی سادہ سلیس مگر بڑا ہی معنی خیز ہوتا ہے۔ تو وہی انھوں نے زیادہ تر سادہ سپاٹ زبان کا استعمال کیا ہے جو کرداروں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اپنے ناولوں میں لمبے لمبے جملوں کا استعمال نہیں کرتے بلکہ چھوٹے اور چست جملوں سے عبارت کو مزین کرتے ہیں اور جو کردار جس طرح کی زبان اپنے معاشرے میں بولتا ہے ذاکر صاحب اسی زبان میں اپنے ناولوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں انگریزی، پنجابی، ہریانوی اور ہندی زبانوں کے جملے برجستہ مل جاتے ہیں اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ مکالموں کو جبراً عبارت میں جوڑ دیا گیا ہے۔ عبدالمغنی ذاکر صاحب کے اسلوب نگارش پر اپنے خیالات کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں۔

''جناب کشمیری لال ذاکر کا اسلوب سادہ و پرکار ہے۔ وہ عام طور پر چھوٹے جملوں کا استعمال بڑی سلاست سے کرتے ہیں اور یہ جملے اپنے سیاق و سباق میں بہت معنی خیز اور خیال انگیز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو کرداروں کے مکالمے اشعار کی طرح موزوں چست اور ایسے برجستہ فقروں پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے مضمرات اور اشارات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے''۔

(ڈاکٹر عبدالمغنی 'کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری' فن اور شخصیت (کشمیری لال ذاکر)(ممبئی) شمارہ نمبر (مارچ 92-1991) ص 214)

ذاکر صاحب کے پلاٹ مربوط، سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک کہانی میں دلچسپی قائم رہتی ہے اور قاری کا تجسس بنا رہتا ہے جو اسے پورا ناول پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ چاہے وہ اپنے ناولوں میں دو شہروں، دو ملکوں، دو گاؤں کی کہانی کہہ رہے ہوں مگر پھر بھی کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا ہاں لیکن کہیں کہیں فنکار کی جدت نظر آتی ہے جیسے 'ڈوبتے سورج کی کتھا' کے پلاٹ میں کہیں کہیں تھوڑا ایہام بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے دو نسلوں کے قصے پھر اس میں بھی دو بھائیوں کی الگ الگ کہانیاں ساتھ ہی کرداروں کے بیچ تقسیم ہند کی لکیر۔ ان سب باتوں سے پلاٹ میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی قاری کو اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

(کشمیری لال ذاکر 'فن و شخصیت' آپ بیتی نمبر ممبئی صابر دت جلد 4، شمارہ 7، ستمبر 1978: ص 277)

کردار نگاری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ذاکر صاحب نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے ایسے کردار تراشے ہیں جو ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار کہے جا سکتے ہیں۔ وہ کرداروں کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں اور کرداروں کو دلچسپ بنانے کے لیے گرما گرم اور پھڑکتے ہوئے فقرے و محاورے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے تمام کرداروں کو دلکش بنائے رکھنے کے لیے مرقع نگاری کا خوب سہارا لیا ہے۔ مرقع نگاری اس طور سے کی ہے کہ کہانیوں کا خاص اہم حصہ نظر آتا ہے جیسے بیسویں صدی کی شخصیتوں کی شکل وصورت، حرکات و سکنات، طبیعت کی رنگا رنگی، آواز کی کیفیت وغیرہ کی بہترین مرقع نگاری ذاکر صاحب نے اپنے ناولوں میں کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاکر صاحب نے انھیں کرداروں کا انتخاب کیا جو آپ کے آس پاس رہتے ہیں یا جن کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے لیکن انھوں نے اپنے ناولوں میں غیر ضروری کرداروں کو اہمیت نہیں دی ہے۔ ذاکر صاحب نے اتنے ہی کردار اپنے ناولوں میں شامل کیا ہے جن کی ضرورت پلاٹ اور واقعات کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول مختصر اور جامع ہوتے ہیں اور ان میں بلا وجہ کی نہ تو کوئی تکرار ہوتی ہے اور نہ واقعات اور کرداروں کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کے ناول سادگی سچائی اور حقیقت نگاری کے مرقع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس منظر کی عکاسی وہ اپنے ناولوں میں کرتے ہیں تو اس کی تصویر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان کی منظر کشی کا ایک نمونہ پیش نظر ہے:

''میں نے چاند کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے افق کی طرف بھاگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو اور اسے اشاروں سے اپنے پاس بلا رہا ہو۔ میں تمھارے اور قریب سرک گیا۔ تمہارے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر۔'' (کشمیری لال ذاکر 'دھرتی سدا سہاگن': ص 81)

ذاکر صاحب کے ناولوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ناولوں میں مذہب کا رنگ بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے زیادہ تر انھوں نے سماجی سیاسی اور معاشی مسائل پیش کیے ہیں۔ لیکن مذہب کا رنگ جھلکنے نہیں دیا ہے۔ ان کے ناولوں میں مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں اور دوسری عبادت گاہوں کا ذکر ضمنی طور پر آتا ہے۔ 'مجبوراً ہوگی ایک رات' ایک ایسا ناول ہے جس میں تاریخی مندروں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن اس کا ذکر اتنا ہی آیا ہے جتنا کہ ناول کے موضوع کے اعتبار سے ضروری تھا۔

بلاشبہ کشمیری لال ذاکر اردو ادب کے اچھے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے قارئین کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر بھی بڑی فنی مہارت سے پیش کی ہیں۔ ان کے ناول موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں جو بدلتے وقت کی آواز ہیں۔ انھوں نے نئے نئے اور عصری موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور انھیں حقیقت پسندی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ دوسرے ناول نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے کرداروں کے وسیلے سے قارئین کے ایک وسیع طبقے اور حلقے کو متاثر بھی کیا ہے۔

■

Rudra Shakti Jee Maharaj
H No. 12, Gali No. 2, Near Wooler Public School, Wazirabad Gaon
Delhi-110084
Mob.:9140276752
Email: rudrasj2014@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

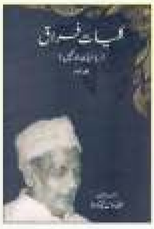

کلیات فراق جلد سوم (رباعیات اور نظمیں)

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

صفحات: 399، قیمت: 235 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر نظر کتاب کے مرتب و مدون کالی داس گپتا رضا ہیں۔

مذکورہ کلیات میں فراق گورکھپوری کا وہ کلام درج ہے جو ان کے دیگر مجموعہ ہائے کلام سے ماخوذ ہے۔ جیسے مشعل، روپ، گلِ نغمہ، گلبانگ، دھرتی کی کروٹ وغیرہ۔

پیش لفظ اور فہرست کے بعد دو صفحے کے مقدمہ میں دو ہمعصر شخصیات کا ذکر ہے جس میں ان کی رباعی گوئی کے آغاز، محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں مرتب نے فراق گورکھپوری کی تحریر نقل کی ہے جسے فراق نے اپنے مجموعۂ کلام روح کائنات میں شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں اور مجنوں گورکھپوری آسی غازی پوری کی رباعیوں سے بہت متاثر تھے۔ میں نے مجنوں کی یا مجنوں نے میری توجہ پہلے پہل ان رباعیوں کی طرف نہیں کرائی۔ دونوں الگ الگ ان رباعیوں سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی طرف کھنچے تھے۔ شعر میں بھی کہتا تھا اور کبھی کبھی مجنوں بھی، لیکن رباعی نہ وہ کہتے تھے نہ میں۔ 1929 کی بات ہے میں کانپور میں تھا اور مجنوں گورکھپور میں۔ کسی چھٹی میں جب میں گورکھپور گیا تو مجنوں سے میں نے اطلاعاً کہا کہ میں نے ایک ہفتے کے اندر کچھ رباعیاں کہہ ڈالی ہیں۔ مجنوں نے بھی یہی اطلاع دی کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں انھوں نے بھی نہ جانے کسی غیبی یا نفسیاتی تحریک کے زیر اثر رباعیاں کہہ ڈالی ہیں۔''

مرتب نے کتاب میں فراق کی رباعیوں اور نظموں پر جو گفتگو کی ہے وہ تشنہ ہے کیونکہ یہاں فراق کے فن اور کلام پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ قارئین تک فراق کا کلام پہنچانا مقصود ہے۔ رباعیوں کی پیش کش کا سلسلہ صفحہ 89 پر تمام ہوجاتا ہے۔ وہیں سے نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ان نظموں کے عنوانات میں ایک عنوان 'نظم کا عنوان ڈھونڈنے والے شاعر سے' ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو اکیس صفحات کو محیط ہے۔ اس کلیات کی نہایت اہم نظم ہے حالانکہ آزاد نظم ہے لیکن یہ نظم سماج کے ہر طبقے سے جڑے شاعر و ادیب کے مطالعے کے لیے بہت مفید و کارآمد ہے۔ ہر سطح کے شاعر و ادیب کے لیے اس ایک نظم میں بے شمار عنوانات ہیں جو ایک انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے بیشتر مراحل و منازل کو فراق نے گنوا دیا ہے۔ جن سے ہر انسان کو خواہی نخواہی سابقہ لازمی طور پر پڑتا ہے۔ گویا کہ فراق اس نظم کے ذریعے زندگی کے عنوانات بیان کردیے ہیں بلکہ زندگی کا مرقع پیش کردیا ہے کہ یہی زندگی کی تصویریں ہیں۔ یہ زندہ محاکات ہے۔ قدم قدم انسان جس سے روبہ رو ہوتا ہے ہر دن انسان ایک نئے عنوان سے سامنا کرتا ہے۔ اس سے جو جھتا ہے، ہمکنار ہوتا ہے، ناکام ہوتا ہے، سرخرو گزرتا ہے، زندگی موسموں کے سرد و گرم سے متاثر ہوتی ہے۔ حاکموں اور محکوموں کی سطح و معیار زندگی کا آئینہ دکھا دیا ہے۔

نظموں کے اندراج میں ایک ترجمہ شدہ انگریزی سے اردو میں نظم شامل کتاب ہے۔ یہ نظم ٹامس ہارڈی کے منظوم ناٹک سے دو اسٹیز اماخوذ ہے۔ اس مترجمہ نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ فراق نے بالکل انگریزی اسٹیزا کی پیروی کی ہے نیز مصرعوں اور قافیوں کی بحر و ترتیب میں پیمانوں کا خیال کیا ہے اور انگریزی و اردو میں یکسانیت پیدا کی ہے۔ نظم کا عنوان ہے 'آفاق کا کورس'۔

فراق نے اپنے کلام کی تاریخی ترتیب کا خیال کیا ہے۔ اس لیے ان کے مجموعوں میں رباعی اور نظم کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں کیا گیا ہے جیسے جیسے ان کے کلام اوراق کی زینت بنتے گئے ویسے ویسے انھوں نے تاریخ وار ترتیب دیا جب کہ رباعی عموماً مجموعے کے آخر میں شامل کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں کالی داس گپتا رضا کے معاون مرتب شمیم طارق ہیں اس عظیم کام میں شمیم طارق نے رضا صاحب کو بھرپور تعاون دیا تھا۔ کتاب کی اشاعت کالی داس گپتا رضا کی زندگی میں نہیں ہوپائی تھی۔ کتاب کی اشاعت کی غرض سے قومی اردو کونسل

نے بحیثیت معاون مرتب کے شمیم طارق صاحب سے رابطہ کرکے کچھ وضاحتیں طلب کیں جس کے بعد یہ کتاب اشاعت کے مرحلے سے گزری۔ 'چند باتیں' کے عنوان سے شمیم طارق کی دو صفحات پر مشتمل تحریر شامل کتاب ہے۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''عمر نے وفا کی ہوتی تو کالی داس گپتا کا ترتیب دیا ہوا فراق کی نظموں کا یہ مجموعہ شاید اور بہتر انداز میں منظر عام پر آتا، لیکن موجودہ شکل میں بھی تقریباً مکمل ہے۔ پیش لفظ بھی اپنے نامکمل ہونے کا احساس نہیں دلاتا۔ فراق ایک مکمل شعری مجموعہ چاہتے تھے۔ یہ لکھ کر انھوں نے جو کچھ ترتیب وار پیش کردیا ہے وہ فراق کی نظموں کی پوری کائنات ہی نہیں ان کے خواب کی تعبیر بھی ہے۔ قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے کہ وہ ایک ساتھ اردو کے دو عظیم ادیبوں کے خوابوں کی مشترکہ تعبیر کو منظر عام پر لا رہی ہے۔''

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں کالی داس گپتا رضا نے تمام رباعیات و نظموں کے مآخذ کا بحسن و خوبی اہتمام کیا ہے۔ تاریخ کے ساتھ بصراحت حوالوں کے ساتھ ساتھ مصرعوں و اشعار میں در آئے مشکل الفاظ و مقام اور نام کی وضاحت تو کر ہی دی ہے۔ معانی بھی درج کردیے ہیں تاکہ قارئین کلام کو آسانی ہو۔

کالی داس گپتا رضا نے کتاب کا انتساب قدرے طویل لکھا ہے جو تقریباً چوبیس صفحات کو محیط ہے۔ ان کے اس انتساب میں فراق گورکھپوری کے اقتباسات کثرت سے نقل کیے گئے ہیں جس کا مقصد فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری کے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالنا بھی ہے اور فراق کے تصورات و خیالات کی توضیح بھی۔ فراق کے اقتباس سے مجنوں گورکھپوری سے ان کی انسیت و چاہت کا علم بھی ہوتا اور دو دوستوں کی شکر رنجی کے انداز سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔ مجملہ یہ کتاب کئی ابعاد سے واقف کراتی ہے جو ادب دوستوں کے لیے ایک سوغات ہے۔

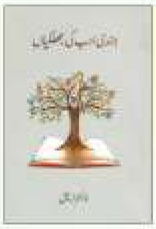

ہندی ادب کی جھلکیاں

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 121، قیمت: 95 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ہما، N-3،PG، نزد خلیل اللہ مسجد، ہلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

'ہندی ادب کی جھلکیاں' ڈاکٹر نریش کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے ہندی ادب کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ 'ہندی ادب کی جھلکیاں' میں انھوں نے عہد وسطی کی ہندی شاعری میں سماجی شعور، ہندی ادب میں رام اور کرشن، روی داس کے کلام میں تصوف، ہندی ادب گورمکھی رسم خط میں، جدید ہندی شاعری: عہد وسطی کا ردعمل، ناگارجن: فن اور شخصیت وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر نریش نے اپنے ان مضامین میں مثالوں کے ذریعے اپنے افکار و نظریات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے مضمون 'عہد وسطی کی ہندی شاعری میں سماجی شعور' میں بھکتی کال اور ریتی کال کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی تلسی داس روی داس وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ عہد وسطی کی شاعری میں کس قدر سماجی شعور موجود تھا۔

دوسرا مضمون 'ہندی ادب گورمکھی رسم خط میں' ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس ہندی ادب کا ذکر کیا ہے جو گورمکھی رسم خط میں موجود ہے لیکن ہندی ادیبوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ گورمکھی رسم خط میں ہندی ادب کا مختصراً تعارف بھی ڈاکٹر نریش نے پیش کیا ہے جس میں منوہر داس مہربان، سنت رین، بھائی سنتوکھ سنگھ، گیانی گیان سنگھ، سنت سمپورن سنگھ وغیرہ کے نام بطور خاص شامل ہیں۔

پانچواں مضمون روی داس کے کلام میں تصوف ہے۔ اس میں انھوں نے روی داس کے کلام میں تصوف کو مختلف مثالوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

آٹھواں مضمون 'جدید ہندی شاعری: عہد وسطی کا ردعمل' ہے۔ جس میں انھوں نے جدیدیت کے معنی اور جدیدیت میں کس طرح کا ادب تحریر کیا گیا، اس پر مدلل گفتگو کی ہے۔ یہ عہد وسطی کے ردعمل میں وجود میں آئی۔ جدیدیت میں کس طرح کی شاعری کی گئی ان کی کچھ مثالیں بھی موجود ہیں:

کوئی نہ چھایا دار پیڑ وہ جس کے تلے بیٹھی سویکار
شیام تن بھر بندھا۔ یووَن
گورو ہتھوڑا ہاتھ کرتی بار بار۔ پرہار

میتھلی شرن گپت نے اس طرح کی شاعری کی۔

ہم کون تھے کیا ہو گئے ہیں اور کیا ہوں گے ابھی
آؤ وچاریں آج مل کر یہ سمسیائیں سبھی

نواں مضمون 'جدید ہندی شاعری کی علامتیت' سے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے علامت کے لغوی معنی اور علامتوں کا کس طرح استعمال کیا گیا اور علامتوں کا سلسلہ ہندوستان میں کب سے رائج ہوا جیسے اہم نکات پر بحث کی ہے۔ انھوں نے علامت کی چھ قسمیں بھی بتائی ہیں۔ ان میں سے کچھ علامتوں کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

فلسفیانہ علامت

آہ سرگ کے اگر دوت تم
اچھل ہوئے ولین ہوئے

سائنسی علامت۔

پرانوں بال سب دوڑ پڑے
جس کا سندر انوراگ لیے

بارہواں مضمون ناگارجن کی فن اور شخصیت سے متعلق ہے۔ جس میں انھوں نے ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کہ ناگارجن کی اصل شناخت ایک شاعر کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعے یگ دھارا، ستر نگے پنکھوں والی، پیاسی پتھرائی آنکھیں، تالاب کی مچھلیاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی اور تخئیل کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے ان کی نظم 'گلابی چوڑیاں' سے اس کی مثال دی ہے۔ یہ مضمون ناگارجن کی مکمل شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔ جس سے ان کی مقبولیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

چودھویں باب میں انھوں نے پریم چند کی کردار نگاری پر روشنی ڈالی ہے کہ ان کے کردار کس طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں کیا خصوصیات ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے پریم چند کے افسانے شانتی، شنکھ ناد، وسرتی کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے کرداروں کے تعلق سے لکھا ہے کہ 'ان کرداروں کے توسل سے قاری اس زمانے کے سماج کے طرز حیات اور فکر و نظر کا نظارہ کرسکتا ہے۔'

آخری مضمون میں انھوں نے یش پال کی ناول نگاری پر گفتگو کی ہے کہ ان کے ناول کے موضوعات کس طرح کے ہوتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ ایک عمدہ کتاب ہے جو اردو قارئین کے لیے ہندی ادب سے واقف ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پندرہ مضامین پر مشتمل یہ کتاب اردو اسکالرز کے لیے ایک بہترین کتاب ہے۔ ڈاکٹر نریش مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس نوع کی کتاب اردو میں لکھ کر اردو والوں کے لیے ہندی ادب سے واقفیت کا سامان کیا ہے۔

تحقیق و تنقید

المملكة العربية السعودية في ضوء الرحلات الهندية

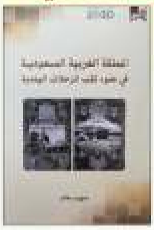

تصنیف: ڈاکٹر صہیب عالم
صفحات: 578، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: مكتبة الملك عبدالعزيز، ریاض
تبصرہ: نایاب حسن
A/22، گلی نمبر 7، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

'المملكة العربية السعودية في ضوء الرحلات الهندية' 578 صفحات پر مشتمل ڈاکٹر صہیب عالم (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کی ایک ضخیم اور تحقیقی کتاب ہے، جس کا موضوع بڑا دلچسپ ہے۔ اس میں ہندوستانی سفرناموں کی روشنی میں مملکتِ سعودی عرب کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو زبان میں سفرنامہ نگاری کی قدیم روایت ہے اور اب تک اس زبان میں سیکڑوں سفرنامے لکھے جاچکے ہیں۔ یہ سفرنامے دنیا بھر کے مختلف ممالک کے اسفار کی رودادوں پر مشتمل ہیں، جن کے لکھنے والے بڑے، چھوٹے اور متوسط ہر قد و قامت کے ادیب و مصنف ہیں۔ ان کی ایک قسم ان سفرناموں کی ہے، جو حج یا عمرے کی رودادوں پر مشتمل ہیں اور اس زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں سفرنامہ ہائے حج و زیارت کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ صہیب صاحب نے اپنی اس تحقیقی تصنیف کا زمانی دائرہ 1902 سے 1953 تک محدود رکھا ہے؛ تاکہ موضوع قابو میں رہے اور تحقیق و تجزیہ کا عمل کما حقہ انجام پا سکے۔

مقدمے میں وہ بتاتے ہیں کہ مذکورہ پچاس سال کے عرصے میں، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں 112 حج کے سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں لکھی جانے والی اس سلسلے کی پہلی کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی 'جذب القلوب الى ديار المحبوب' ہے، جو 1593 میں شائع ہوئی تھی، مگر وہ سفرنامے کے طرز پر نہیں لکھی گئی ہے، اس میں بنیادی طور پر مسجد نبوی و مدینہ منورہ کی تاریخ، شرعی حیثیت اور فضائل وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، اس کی تصنیف کی شروعات شیخ نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران کی اور تکمیل دہلی میں ہوئی، یہ اصلاً فارسی زبان میں ہے اور بعد میں اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے، غالباً اس کا پہلا اردو ترجمہ 1930 میں 'مرغوب القلوب معروف بہ تاریخ مدینہ' کے نام سے مولوی عبدالحق بریلوی کا شائع ہوا تھا۔ بعد میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ معروف معنوں میں پہلا سفرنامہ 'حج شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا رفیع الدین فاروقی نے تحریر کیا تھا، البتہ یہ بھی فارسی میں تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ہاں مولانا نسیم احمد فریدی کو ملا، جس کے بعض مقامات کرم خوردگی کے باعث واضح نہیں تھے، پھر انھیں رضا لائبریری میں اس کے ایک نسخے کی موجودگی کا سراغ لگا، تو انھوں نے اس سے مقابلہ کرکے متعلقہ عبارتوں کی تحقیق کی اور اس کا اردو ترجمہ کیا، جسے 1961 میں مکتبہ الفرقان لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ مولانا فریدی نے تاریخ حرمین سے متعلق تحریروں اور کچھ واقعات و حکایات کا ترجمہ غیر ضروری جان کر نہیں کیا ہے، صرف سفرنامے والا حصہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے اور محض 93 صفحات میں مکمل ہو جاتی ہے، مگر ہے بہت دلچسپ، مصنف نے اپنے تمام سفر کا احوال بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

صہیب صاحب نے اپنی زیر نظر تحقیقی کتاب میں 32 حج کے سفرناموں کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ سب اردو میں ہیں (سوائے صدیق حسن خاں انبالوی کی سفری یادداشت کے، جو انگریزی میں ہے)۔ ان میں پہلا سفرنامہ 'مرآۃ العرب یعنی سفرنامۂ نادر' ہے، جس کے مصنف نادر علی ہیں، یہ میرٹھ کی عدالت میں وکیل تھے، ان کا یہ سفرنامہ 1902 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ نواب سلطان جہاں بیگم، خواجہ حسن نظامی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا غلام رسول مہر، شفیق جونپوری، غلام حسین پانی پتی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا مسعود عالم ندوی وغیرہ کے سفرناموں کا مصنف نے تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں ایک دلچسپ سفرنامہ ہے 'حج بذریعہ موٹر'، جس کے مصنف شیخ ولی داد ہیں، جو برطانوی گورنمنٹ میں اسٹیشن ماسٹر اور کٹنی (مدھیہ پردیش) کے رہنے والے تھے۔ ان کے جی میں آیا کہ موٹر گاڑی سے حج کے سفر پر نکلیں؛ چنانچہ سولہ افراد کے قافلے کے ساتھ انھوں نے 1934 میں یہ سفر کیا اور ہندوستان سے براہِ دہلی، پنجاب و بلوچستان، ایران، عراق و کویت اور وہاں سے حجاز پہنچے اور حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔ اگلے سال انھوں نے یہ سفرنامہ لکھا جو آگرے سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے سعودی عرب ہی نہیں، اس سفر کے دوران راہ میں پڑنے والے تمام ملکوں کی سفری روداد تحریر کی ہے۔

صہیب صاحب نے کتاب کو سات مفصل ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ان سے قبل ان کا ایک بھرپور مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے ہندوستان میں سفرِ حج لکھنے کی روایت کے تاریخی تجزیے کے ساتھ تحقیقی مطالعے میں شامل 32 سفرناموں کا مختصر تعارف بھی کروایا ہے۔ کتاب کا پہلا باب سعودی عرب اور ہندوستان کے تعلقات کے جائزے پر مشتمل ہے، جس میں قدیم و جدید دور میں سعودی عرب اور ہندوستان کے مابین سیاسی، ثقافتی، علمی و اقتصادی تعلقات کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں سفرنامہ ہائے حج کی روشنی میں سعودی عرب کے معاشرتی حالات کا بیان ہے، جس میں سعودی عرب کے مختلف شہروں کی جغرافیائی و سماجی کیفیت، وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، ان کی روزمرہ زندگی، وہاں کی عمارتوں، گزرگاہوں، سڑکوں، شاہراہوں، وادیوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ثقافتی حالات ہیں، یعنی حج کے سفرناموں میں سعودی عرب کی علمی و ثقافتی حالت کی کس طرح عکاسی کی گئی ہے، اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اقتصادی اور معاشی حالات، یعنی ان سفرناموں کی روشنی میں اس زمانے میں سعودی عرب کی معاشی حالت، کاروبار اور بازار کی نوعیت، مختلف قسم کے پیشوں، پیشہ وروں، زراعت اور تیل کی دریافت وغیرہ کا احوال ہے۔ پانچویں باب میں اس دور میں سعودی عرب کے نظم و نسق کا بیان ہے، چھٹے باب میں سیاسی حالات، ساتویں باب میں شاہ عبدالعزیز آل سعود سے متعلق ان سفرناموں میں پیش کردہ تاثرات کا بیان ہے۔

اس طرح اس کتاب کے مطالعے سے بیسویں صدی کے نصفِ اول کے سعودی عرب کا متنوع الجہات منظرنامہ سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور کے ہندوستانی اہلِ علم و قلم نے سعودی عرب کی کیسی عکاسی کی ہے، یہ عکاسی یک رخی نہیں ہے؛ بلکہ ہمہ جہت ہے، جس میں مملکت کی خوبیوں کا اعتراف بھی ہے اور خامیوں پر کھلی تنقیدیں بھی ہیں، اس کتاب کے مصنف نے بھی ان سفرناموں کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے، جس کے لیے ڈاکٹر صہیب عالم ڈھیروں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے بیسویں صدی کے نصفِ اول کے سعودی عرب کی تاریخ کا ہندوستانی Perspective بڑی خوبی سے پیش کر دیا ہے۔ اسلوب بھی متین و باوقار ہے، خشکی، پیچیدگی اور ژولیدگی سے پاک ہے۔ اس اہم کتاب کی اشاعت مكتبة الملك عبدالعزيز، ریاض کے زیر اہتمام عمل میں آئی ہے۔ امید ہے کہ تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والے عربی زبان کے اسکالرز اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

خاکے

کہ جن کو یاد نہ کرنا بھی یاد کرنا ہے (خاکے اور یادیں)

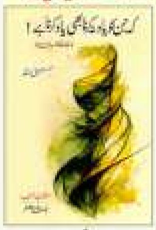

مصنف: عتیق اللہ، انتخاب وترتیب: فاروق مضطر

صفحات: 198، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023

پیشکش: دبستانِ ہمالہ، راجوری (جموں اینڈ کشمیر)

مبصر: محمد اکرام

89/6A، گلی نمبر، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

پروفیسر عتیق اللہ کا اصل میدان تحقیق وتنقید ہے مگر اس کے علاوہ اور بھی اصناف ہیں جن میں انھوں نے اپنے کمالِ ہنر کا ثبوت دیا ہے۔ انھی میں شاعری، ڈراما نگاری، ترجمہ نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری بھی ہے۔ اس مشہور صنف کو پروان چڑھانے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسی سلسلے سے ایک اور نام عتیق اللہ جڑ گیا ہے کہ خاکوں پر مشتمل ان کی دو کتابیں 'جن کو یاد نہ کرنا بھی یاد کرنا ہے' اور' کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے' حالیہ دنوں میں ہی منظر عام پر آئی ہیں۔ خاکوں کی ان دونوں کتابوں میں عتیق اللہ کی شخصیت ایک عمدہ خاکہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔

زیر نظر کتاب 'کہ جن کو یاد نہ کرنا بھی یاد کرنا ہے' (خاکے اور یادیں) میں 25 خاکے شامل ہیں جن میں خواجہ احمد فاروقی، جوگندر پال، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، قاضی سلیم، شمیم حنفی، فضیل جعفری، کمال احمد صدیقی، ابوالکلام قاسمی، عابد سہیل، مجتبیٰ حسین، بلراج کومل، عصمت جاوید، بشر نواز، شمیم نکہت، خلیق انجم، ابن کنول، فضل تابش، اسلم پرویز، شاہد علی خاں، کنیز فاطمہ، علی جاوید، تلاوت علی، آمنہ بائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں زیادہ تر عتیق اللہ کے معاصر بزرگ ہیں اور کچھ ایسی شخصیات بھی ہیں جن سے ان کا ذہنی اور قلبی رشتہ رہا ہے۔ ان میں ایک تو کنیز فاطمہ ہیں جو ان کی شاگردہ تھیں اور کم عمری میں وفات پا گئیں۔ دوسرا خاکہ آمنہ بائی المعروف اطہر دانی کا ہے جن کا ادب سے تو دور کا بھی رشتہ نہیں ہے، مگر عتیق اللہ کی ذات سے انھیں بہت انسیت تھی۔ دماغی طور پر ایک معذور خاتون جنھوں نے اجین کو اپنا قیام گاہ اور عتیق اللہ صاحب کے گھر کو ایک طرح سے پناہ گاہ بنالیا تھا۔ یہ عتیق اللہ صاحب کے والدہ کی بہت چہیتی تھیں اس لیے وہ اکثر ناشتے کے وقت ان کے گھر آجایا کرتی تھیں۔ عتیق اللہ صاحب نے اپنے اس خاکے میں رشید احمد صدیقی (کندن) اور عبدالحق مرحوم (گدڑی کا لال۔ نور خان) کی یاد تازہ کردی کہ انھوں نے بھی کچھ ایسی شخصیتوں کے خاکے لکھے جو سماجی اعتبار سے معمولی حیثیت کے حامل تھے۔

خاکے کی اس کتاب میں کچھ کی نوعیت تعزیتی ہے۔ کچھ خاکے کورونا دور کی وحشت ناکیوں کی یاد بھی تازہ کراتے ہیں۔ کورونا جیسی مہلک وبا کے دوران جن کی وفات ہوئی ہے انھیں اپنے خاکوں کے ذریعے ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ نے خاکے کی پرانی روایت سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر انھوں نے خاکوں میں اپنے انفرادی فکر واسلوب کا جادو جگایا ہے اور اپنے خاکوں کا رنگ بھی جداگانہ رکھا ہے۔ خاکہ کے تعلق سے ان کا خیال یہ ہے کہ:

''خاکہ نگاری کے لیے بھی تخلیقی شعور لازمی ہے۔ خاکہ محض خاکہ ہوتا ہے، خواہ مزاحیہ ہو یا سنجیدہ۔ اپنی آسانی کے لیے ہم اس کی تعریف کا خاکہ بنانے کی کوششیں بھی کرتے ہیں، لیکن کسی بھی ادبی صنف کی تعریف کی طرح اس کی بھی کوئی حتمی تعریف ممکن نہیں۔'' (کہ جن کو یاد نہ کرنا بھی یاد کرنا ہے، ص 12)

پروفیسر عتیق اللہ نے روایتی تکنیک سے گریز کرتے ہوئے سوانحی معلومات سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہے۔ اور زیادہ تر شخصیت کے ساتھ ادبی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ ان خاکوں میں شوخیاں بھی ہیں اور کچھ شرارتیں بھی۔ دوستوں سے چہل بازی بھی ہے، طنز ومزاح کی جھلکیاں بھی ہیں، صرف خوبیاں نہیں کچھ خامیاں بھی ہیں اور کچھ خاکے تو ایسے ہیں جن میں گھریلو الجھنوں کو بھی بہت ہی سلیقے سے بیان کیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا خاکہ خواجہ احمد فاروقی پر ہے۔ ان کی ذات وصفات کو دیکھیے، انھوں نے کتنے خوبصورت طریقے سے بیان کیا ہے:

''... کچھ دیر ہی میں ان نوجوانوں میں کھلبلی مچ گئی کہ خواجہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ سب تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ خواجہ صاحب پرنسپل صاحب کے ساتھ وارد ہوئے تھے اور دو قدم ان سے آگے چل رہے تھے۔ ان کی چال سے اردو استاد کے بجائے آئی اے ایس آفیسر کا تاثر ابھر رہا تھا۔ چہرے پر ایک خفیف سی طنز آمیز مسکراہٹ چسپاں تھی۔ سن زیادہ رہے تھے بولنے میں تامل برت رہے تھے۔ ان کی آنکھیں نسبتاً غزال نما تھیں اور ان میں ایک عجیب سی چمک محسوس کر رہا تھا۔ خواجہ صاحب کی نظریں سامنے اپنی منزل مقصود پر تھیں۔'' (ایضاً، ص 14)

جوگندر پال ان کے ہمعصر بھی تھے اور ان سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ ان کے ساتھ جو محفلیں بجتی تھیں اس کا نقشہ انھوں نے بہت خوبصورت انداز میں کھینچا ہے:

''پال اورنگ آباد کے ایک معروف مقامی کالج میں پرنسپل تھے۔ نیروبی (افریقہ) کی پینشن مٹھیاں بھر بھر کے مل رہی تھیں۔ پال کی تقدیر پر رشک آتا۔ مگر ان کی خالی جیب دیکھ کر بڑی کوفت بھی ہوتی۔ گاڑی گھنی ذمہ داریوں میں اٹا ہوا پال اکثر سرکس کے بوڑھے شیر کی طرح لنج پنج نظر آتا۔ پال کہتے ''اب جب کہ ہر طرح سے فارغ البال ہوں، حج کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر عتیق کیا تمہارے مسلمان اجازت دیں گے۔'' پال کے اس سوال اور خیال پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ''اجازت تو بعد کی بات ہے پال صاحب پہلے یہ دیکھیے آپ کی جیب بھی اجازت دینے کے لیے تیار ہے کہ نہیں۔ آجکل حج کے لیے لاکھوں سے کم صرفہ نہیں آتا۔''

''باسٹرڈ، تم مجھے جانے کیا سمجھتے ہو۔ ارے بھائی خدا کی قسم میں قلندر طبیعت رکھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے انھی بال بچوں کے مستقبل کے لیے ورنہ آگے چل کر یہی بدمعاش مجھے گالیاں دیں گے...'' (ایضاً، ص 23-22)

پروفیسر عتیق اللہ نے قمر رئیس پر پُرمزاح انداز میں خاکہ لکھا ہے۔ دیکھیے کتنے خوبصورت پیرائے میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ اپنی پی ایچ ڈی کا پہلا باب تیار کرکے رشید احمد صدیقی کو پیش کیا تو انھوں نے کس ردعمل کا اظہار کیا:

''انھوں (قمر صاحب) نے بڑے اطمینان واعتماد کے ساتھ وہ باب اپنے استاد کو پیش کیا اور داد طلب ساعت کھلی رکھی۔ انتظار کرتے رہے مگر استاد محترم کی زبان خاموش جب کچھ دیر تک نہیں کھلی اور ان کی نگاہیں پہلے ہی صفحے پر جمی رہیں تو قمر صاحب کو کچھ شبہ ہوا اور انھوں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا بہت خامیاں ہیں؟'' ''یہ تو بعد کا مرحلہ ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ پاؤں سے کیسے لکھ لیتے ہیں۔'' یہ سن کر قمر صاحب کو بھی ہنسی آگئی۔ رشید صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی خوشبو، دیکھ کر قمر صاحب بھی شرمندگی کے جھٹکے سے بال بال بچ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت سے آج تک میں خوش خطی کی مشق کرتا رہتا ہوں لیکن پیروں سے لکھنے کی عادت ایک بیماری بن گئی ہے۔'' (ایضاً، ص 55)

شیخ عصمت جاوید بھی ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں وہ جس درد و کرب سے گزرے اس درد کو عتیق اللہ صاحب نے جو زبان دی ہے اسے پڑھ کر سنگ دل لوگوں کی آنکھیں بھی نم ہو جائیں گی۔ وہ لکھتے ہیں:

''بڑی شفقت سے پوچھتے عتیق اللہ آپ کا کیا خیال ہے۔ صادق کیسے ہیں، آپ لوگ بہت یاد آتے رہتے ہیں۔ ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ دروازے کے باہر اوپر کی سیڑھیوں سے ان کا بیٹا فیصل اپنی گردن موڑے ہوئے تیزی کے ساتھ نکل گیا۔ بھابی نے کہا عتیق صاحب دیکھیں یہی وہ بچہ ہے نا جسے اپنا دودھ ہی نہیں خون پلا پلا کر بڑا کیا تھا۔ ان کے لیے ہم نے اپنی ہڈیوں کو سکھا دیا تھا، سارا عیش و آرام تج دیا تھا، راتوں کو رات نہیں سمجھا اور دن کو دن نہیں۔ یہی بچہ بالغ ہو کر، تعلیم پا کر، معزز روزگار پا کر، شادی کے بعد اپنا رخ اتنا بدل لے گا یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ شیخ صاحب نے پھر ایک فارسی کی رباعی سنائی کہ تمھارا صرف حال ہے نہ کوئی ماضی تھا اور نہ کوئی مستقبل۔ (ایضاً، ص 122)

درد و غم کی اسی کیفیت کا اظہار آمنہ بائی المعروف اطہر دانی کے خاکے میں ملتا ہے۔ انھوں نے اداسی کے اس رنگ کو دیکھیے کس حزنیہ آہنگ میں پیش کیا ہے:

''آمنہ بائی کیا گئیں ایسا لگا گھر ہی کا کوئی فرد رخصت ہو گیا۔ ہماری اماں کی وہ بہت لاڈلی تھیں۔ آج بھی جب ان کا خیال آتا ہے تو اماں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے رشتوں کی مہک دائمی ہوتی ہے۔ اس مہک میں اداسی کا بھی کچھ رنگ شامل ہوا کرتا ہے، اسے میں کبھی گنوانا نہیں چاہتا، یہ بڑا مقدس ہے۔'' (ایضاً، ص 198)

پروفیسر عتیق اللہ کے خاکے اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی عمدہ ہیں۔ خاکوں میں اس قدر تسلسل اور روانی ہے کہ قاری کسی خاکہ کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لے گا میری ذاتی رائے ہے کہ عتیق اللہ صاحب کے یہ خاکے قارئین کو چونکانے کے ساتھ مہمیز بھی کریں گے۔

اس کتاب کے مرتب فاروق مضطر ہیں جو ایک بہترین شاعر اور ادیب ہیں۔ 'دبستان ہمالہ' اور 'آبشار' جیسے رسالے کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے 'عرض مرتب' کے تحت لکھا ہے کہ:

''عتیق اللہ نے محض شخصیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ شخصیت کے ظاہری پہلوؤں کے ساتھ باطنی پہلوؤں کو بھی کرید کرید کر سامنے لاتے ہیں۔ ان میں وہ احباب بھی ہیں جن کے ساتھ ان کا رویہ لبرل ہے، کہیں مزاح کی چٹکی بھی لی ہے اور کہیں ان کے ادبی کارناموں کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے۔'' (ایضاً، ص 6)

فاروق مضطر صاحب شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پروفیسر عتیق اللہ کے ان خاکوں کو کتابی صورت میں شائع کر کے قارئین کو ایک قیمتی سرمایے سے روبرو کرایا۔

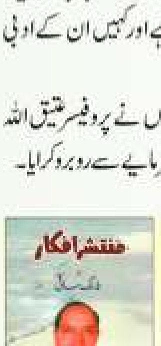

ترتیب

منتشر افکار

مرتب: ڈاکٹر ذکی طارق

صفحات: 272، قیمت: 400 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر اسد رضا، 97 ایف، سیکٹر 7، جسولہ وہار جامعہ نگر نئی دہلی۔ 25

زیر نظر کتاب دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معروف قلمکار نارنگ ساقی نے ہند و پاک کی ممتاز ادبی شخصیات کے متعلق مختلف ادوار میں تحریر کیے تھے نیز جنھیں مستند ادب و شاعر ڈاکٹر ذکی طارق نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شمس الرحمان فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی عظیم ادبی ہستیوں سے منسوب کیا گیا ہے۔

قاضی عبدالستار نے نارنگ ساقی کی ادبی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے تو دیپک بدکی نے پیش لفظ تحریر کیا ہے جبکہ حرف اعتراف محسن رضا رضوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مرتب ڈاکٹر ذکی طارق نے ایک طویل مقدمہ لکھا۔ بعد ازاں مصنف نارنگ ساقی کے تحریر کردہ 34 معرکتہ الآرا مضامین زینت کتاب بنے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ذکی طارق اپنے مضمون یا مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''خوش ذوقی جہاں انسان کی فطرت میں خدا کا غیر معمولی انعام ہے، وہیں اس کی تعمیر میں انسانی ماحول کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ کے ایل نارنگ ساقی جہاں فطری طور پر خوش ذوقی لے کر پیدا ہوئے وہیں ان کے ماحول نے بھی ان کی خوش ذوقی کی تعمیر میں ان کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کی طنز و مزاح کی آبیاری میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔''

زیر نظر کتاب میں نارنگ ساقی کے اہم ادبی شخصیات جیسے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر کیول دھیر، قتیل شفائی، منیر نیازی، مجتبیٰ حسین، کیفی اعظمی، گیان سنگھ شاطر، صابر دت، ساحر ہوشیار پوری، کرشن بیتاب، شان بھارتی، کشور ناہید، اظہر جاوید، دلیپ سنگھ، ساحر شیوی، میکش امروہوی اور انور شیخ سے متعلق دلچسپ، پرمغز اور ناقدانہ مضامین قاری کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک مضمون 'کہانیوں کا مسیحا: کیول دھیر' میں نارنگ ساقی دور حاضر کے اس مایہ ناز افسانہ نگار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر دھیر کے ذہن میں خدمت خلق کے خیال آتے ہی انھوں نے مریضوں کی نبض کے علاوہ سماج کی نبض پر بھی اپنا ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ یوں تو ہمارے اکثر ادیب اور فنکار جب سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں تو کچھ اس طرح سے رکھتے ہیں کہ سماج کی اس دکھتی رگ میں درد نہ بھی ہو رہا ہو تو اس میں درد شروع ہو جاتا ہے، گویا اس میں پہلے درد پیدا کیا جاتا ہے اور پھر اس پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر یہ نہیں کرتے کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر وہ ایک مصروف انسان ہیں، اس لیے ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ادب میں ایسے تجربے کریں۔ اپنے پیشے میں ماہر اور منفرد نبض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر دھیر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔''

اسی طرح اپنے ایک اور مضمون 'راہ محبت کا شاعر میکش امروہوی' میں ساقی رقمطراز ہیں:

''میکش امروہوی کے کلام میں ادائیگی غزل کی چاشنی بھی موجود ہے جو کہ ایک شاعر کی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو روایت اور جدید رنگوں کے حسین سنگم سے بنایا ہے۔ ان کے ہاں غزلیہ روایت کی پاسداری ہی نہیں بلکہ فکر و فن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں کسی نظریے کی چھاپ نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ کسی مکتبہ فکر سے وابستہ ہیں۔ وہ جو دیکھتے ہیں، جو محسوس کرتے ہیں انھیں جذبات و احساسات کو قلم بند کرتے ہیں۔ انھوں نے نہایت خوبصورت ڈھنگ سے حسن و عشق کے رموز و نکات سے غزل کو مزین کیا ہے جن میں خیالات کی ندرت بھی ہے اور جذبات کا ابھار بھی۔''

معروف طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی رحلت کے بعد نارنگ ساقی صاحب نے ان کی یاد میں ایک پر اثر مضمون 'مزاحیہ ادب کا بادشاہ چلا گیا' تحریر کیا تھا جو زیر نظر کتاب میں موجود ہے۔ اس مضمون میں ساقی لکھتے ہیں:

''مزاح نگار سے زیادہ مجتبیٰ حسین کو بطور خاکہ نگار شہرت ملی ہے۔ وہ ہندوستان کے ہی نہیں برصغیر کے ان چند گنے چنے خاکہ نگاروں میں سے تھے جن کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ بقول خامہ بگوش یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ڈنکہ یہ خود بجا رہے ہیں یا

خود بچ رہا ہے۔''خاکہ نگاری مشکل فن ہے۔خاکہ نویسی کا تقاضا ہے کہ ممدوح کے مکمل تعارف میں کمی نہ رہ جائے۔مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں میں ان اشخاص کی ہر خوبی و خامی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے خاکوں میں ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ان اشخاص کی مفصل نہ سہی مگر ایک جامع تصویر ابھرتی ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔''

کتاب کے سرورق پر نارنگ ساقی کی دلکش تصویر ہے اور ابتدائی صفحات میں مصنف کی یادگار رنگین اور بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر چھاپی گئی ہیں۔کمپوزنگ اور پرنٹنگ کے لحاظ سے بھی 'منتشر افکار' ایک صاف ستھری اور دیدہ زیب کتاب ہے۔اس کتاب کے ہر مضمون سے مصنف کا خلوص اور علمیت جھلکتے ہیں، خاص طور پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے متعلق ساقی کے مضامین محبت وعقیدت سے لبریز ہیں۔ بلاشبہ اس کتاب سے مستقبل کے اردو ریسرچ اسکالرس استفادہ کریں گے کیونکہ اس مجموعے میں اردو شعر وادب کی تاریخ ساز ہستیوں کی حیات اور انکی تخلیقات سے متعلق پر مغز تنقیدی مضامین شامل ہیں، نیز اردو ادب کے عام قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔

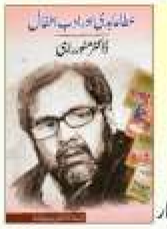

عطا عابدی اور ادب اطفال

مصنف: ڈاکٹر منور راہی

صفحات: 336، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ، بہار

مبصر: ثناءاللہ دوگھروی، مقام اینڈ پوسٹ: دوگھرا، وایا: جالے، ضلع دربھنگہ، بہار

ہمارے شعرا وادبا نے بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت، ان کی نفسیات اور ان کی کم عمری کو ذہن میں رکھتے ہوئے اعلیٰ ومعیاری ادب اطفال کی تخلیق کی ہے۔ایسے شعرا وادبا کی ایک طویل فہرست ہے،جن میں مولانا اسماعیل میرٹھی،خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں کہ ان لوگوں نے کثرت سے بچوں کا ادب تخلیق کیا ہے،خواہ نظموں کا معاملہ ہو یا کہانیوں کا،سبھوں میں جہاں بچوں کی تفریح کا سامان موجود ہے،وہیں ان میں بچوں کے لیے پیغام بھی ہے، جو اپنے اندر بہتر تربیتی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ادب اطفال کی تخلیق کا سلسلہ آج بھی اسی شدت سے جاری وساری ہے۔آج بھی ہمارے کچھ ادبا وشعرا ایسے ہیں جو جہاں بڑوں کے لیے ادب تخلیق کرتے ہیں وہیں بچوں کو بھی انھوں نے تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ان میں ایک نام ڈاکٹر عطا عابدی کا بھی ہے،جنھوں نے بیک وقت شعری اور نثری دونوں ادب میں بہترین خدمات انجام دی ہیں۔وہ جہاں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں وہیں بہترین نثر نگار اور اعلیٰ درجے کی صحافت بھی کی ہے لیکن ان کے یہاں کوئی شور شرابہ نظر نہیں آتا۔ موصوف نے جہاں بڑوں کے لیے شاعری کی،وہیں ادب اطفال کو بھی فراموش نہیں کیا۔انھوں نے بچوں کے لیے کثرت سے نظمیں کہی ہیں اور بچوں کی عمر اور تعلیم وتربیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے لیے دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔'خوشبو خوشبو نظمیں اپنی' بچوں کے لیے کہی گئی نظموں کا مجموعہ ہے اور 'مناظرے مذکر ومونث کے' ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے،جن میں بچوں کی تربیت کا ہر طرح لحاظ رکھا گیا ہے۔یہ کتابیں بچوں میں بہت مقبول ہوئیں جن کی وجہ سے دوبارہ بھی شائع کی گئیں۔

ڈاکٹر عطا عابدی کے ادب اطفال کا دانشوران وناقدین ادب نے تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔سارے مضامین وتاثرات ادھر ادھر منتشر تھے،جنھیں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے ڈاکٹر منور راہی نے ایک جگہ سمیٹ کر بڑا کام کیا ہے۔

کتاب کا انتساب بھی مستقبل کے معمار قوم وملت کے نونہالوں کے نام ہے۔ کتاب کا آغاز ڈاکٹر منور راہی کے تعارف سے ہوتا ہے۔کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور اخیر کے دو چار صفحات میں صاحب کتاب کی چند یادگار تصاویر ہیں جو ڈاکٹر منور راہی کے ادبی کارناموں اور ان کی فعالیت کے تعلق سے کئی اہم کہانیاں کہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ 'عطا عابدی اور ادب اطفال: ایک مطالعہ' کے عنوان سے 37 صفحات پر مشتمل ہے،جس میں ڈاکٹر منور راہی نے ڈاکٹر عطا عابدی کے حالات زندگی، ان کی ادبی خدمات، ادب اطفال کے شعبے میں ان کی گراں قدر خدمات، نیز ڈاکٹر عطا عابدی کی ادب اطفال کے حوالے سے جو خدمات ہیں، ان کے متعلق دانشوران اور ناقدین ادب کی جو آرا ہیں ان کے تعلق سے بہت ہی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ان تمام حضرات کی تحریروں کے حوالے سے تعارفی گفتگو کی ہے،جس سے قاری کو جہاں ڈاکٹر عطا عابدی کے ادب اطفال، اس کی نوعیت اور اس کے افادی پہلوؤں کے مطالعے کا موقع ملتا ہے وہیں ان ناقدین اور دانشوران ادب کے تعلق سے بھی قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے،جنھوں نے عطا عابدی کے ادب اطفال پر اپنے تنقیدی مضامین، تبصرے یا اپنے قیمتی تاثرات پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر راہی نے 'پیش لفظ' میں عطا عابدی کے ادب اطفال کا خود بھی جائزہ لیتے ہوئے 'مناظرے مذکر ومونث کے' کی کہانیوں اور 'خوشبو خوشبو نظمیں اپنی' کی نظموں کا ایک جامع مطالعہ پیش کیا ہے۔

کتاب کا پہلا باب ڈاکٹر عطا عابدی کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے مجموعہ 'مناظرے مذکر ومونث کے' کے حوالے سے ناقدین ودانشوران ادب کے مضامین، تبصروں اور تاثرات پر مبنی ہے۔اس باب میں کل گیارہ حضرات کے مضامین شامل ہیں جن میں خیال انصاری، ڈاکٹر خالدہ خاتون، ڈاکٹر قیصر زاہدی، ثناء اللہ ثنا دوگھروی، ڈاکٹر اوینا ش امن، احسن امام احسن، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر خان رضوان، ڈاکٹر ریحان احمد قادری، پروفیسر سید احتشام الدین اور ڈاکٹر ممتاز فرخ کے نام شامل ہیں۔ ان حضرات کی تحریریں ڈاکٹر عطا عابدی کی کتاب 'مناظرے مذکر ومونث کے' میں شامل بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کی جہاں افادیت کو ظاہر کرتی ہیں،وہیں یہ کہانیاں کس نوعیت کی ہیں، یہ بچوں کے لیے کس قدر تفریح طبع کا سامان مہیا کرتی ہیں، بچوں کے لیے کیا کیا تربیتی پہلو اپنے دامن میں رکھتی ہیں،ان کہانیوں میں کس حد تک بچوں کی نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے، ساتھ ہی ان کہانیوں میں کس قدر بچوں کی دلچسپی کا سامان ہے اور بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے میں عطا عابدی کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، کتاب کا یہ باب قاری کو ان تمام باتوں سے واقف کراتا ہے۔ڈاکٹر راہی نے ان تمام تحریروں کو بڑے سلیقے سے ترتیب دے کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب عطا عابدی کی بچوں کے لیے کہی گئی نظموں کے مجموعہ 'خوشبو خوشبو نظمیں اپنی' سے تعلق رکھتا ہے۔اس باب میں ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے ان دانشوروں اور تنقید نگاروں کی شمولیت نظر آتی ہے، جنھوں نے عطا عابدی کی بچوں کی نظموں کا جہاں فنی جائزہ لیا ہے، وہیں ان نظموں میں کیا باتیں بیان کی گئی ہیں، وہ باتیں بچوں کی عمر اور ان کی فطرت سے کس قدر مطابقت رکھتی ہیں، ان نظموں میں کس قدر بچوں کی دلچسپی کا سامان ہے اور وہ بچوں کی تربیت سے کس قدر قریب ہیں، ساتھ ہی ڈاکٹر عطا عابدی بچوں کی نظمیں کہنے میں کہاں تک کامیاب ہیں، ان کی فن پر کس قدر گرفت ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں کس طرح کی لفظیات کا استعمال کیا ہے، نیز ان نظموں کا سلاست اور سادگی سے کہاں تک لگاؤ ہے، کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر منور راہی نے اس نوعیت کے تمام مضامین، تبصروں اور تاثرات کو بہتر ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس

باب میں ڈاکٹر قیصر زاہدی، بسمل عارفی، سعید رحمانی، اختر سعید اعظمی، شاہ اللہ ثنا دوگھروی اور ظفر انصاری ظفر کی تحریریں شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا باب 'بچوں کی کتابیں: تعارف و تذکرہ' کے مطالعے اور تجزیات پر مبنی ہے جس میں انظار احمد صادق، عبدالودود انصاری، سلطان آزاد، ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، فرحان حنیف، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر اوینا ش امن، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر احسان عالم، زبیر بھاگلپوری، مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی، ڈاکٹر م ق سلیم، شاہ اللہ ثنا دوگھروی، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر رؤف خیر، انوار الحسن وسطوی اور ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کے مضامین، تبصرے اور تاثرات شامل ہیں۔ کتاب 'بچوں کی کتابیں: تعارف و تذکرہ' تحقیق سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں بہار سے شائع ہونے والی بچوں کی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر منور راہی نے عطا عابدی کی اس کتاب کے حوالے سے ان تمام تحریروں کو اس باب کی زینت بنایا ہے۔ یہ باب قارئین پر یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ اس تحقیقی کام میں عطا عابدی نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہیا ور کس مشقت اور جانفشانی سے بچوں کی کتابوں کے حوالے سے تمام حقائق یکجا کیے ہیں، نیز عطا عابدی کی تحقیق کس نوعیت کی ہے۔

فکشن

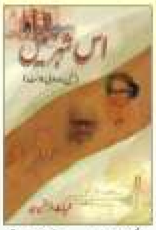

اس شہر میں (تین رودادی ناولٹ)

مصنف: غیاث الرحمٰن سید

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، 110002

مبصر: عامر مظفر بٹ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو ادب میں 'رودادی فکشن' کی اصطلاح میرے لیے بالکل نئی اور انکشافی نوعیت کی جدید ترین صنف ہے۔ غیاث الرحمٰن سید کے بقول انگریزی میں اسے Delineation Literature (رودادی ادب) کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ صنف انگلش میں بہت مقبول ہے۔ اردو ادب میں یہ صنف خاکے اور شخصی افسانے و ناول سے خاص مماثلت رکھتی ہے۔ روداد (سچائی اور حقیقت) کو فکشن (سچائی اور حقیقت جیسے) کا پیراہن عطا کرنے والا بیانیہ 'رودادی فکشن' کہلاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'اس شہر میں' تین رودادی ناولٹ پر مشتمل ہے۔ تینوں کے عنوانات بالترتیب اس طرح ہیں۔ (1) 'عینی آپا' یعنی قرۃ العین حیدر، (2) 'قاضی صاحب' سے مراد اردو زبان و ادب کے مشہور تخلیق کار اور تاریخی ناول نگار قاضی عبدالستار ہیں۔ تاہم 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' جیسی کتابوں کے لیے 'قاضی عبدالغفار' بھی خاصے مشہور ہیں۔ حسن اتفاق کہ دونوں ہی قاضی صاحبان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ (3) اس شہر میں (ممبئی) اس کتاب کے مصنف جناب غیاث الرحمٰن سید ایک منجھے ہوئے فکشن رائٹر ہیں۔ اس سے پہلے بھی اردو اور ہندی میں ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ایک افسانوی مجموعہ (وہ دن) اور اور ایک ناول (ڈھولی وگڑ وڈوم) شامل ہیں۔

غیاث الرحمٰن سید کا اندازِ تحریر نہایت ہی عمدہ اور لائق تعریف ہے۔ عینی آپا نامی ناولٹ کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی ثانوی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کی مکمل پڑھائی علی گڑھ سے ہوئی ہے۔ 1970 کے وسط ہی میں قیصر نقوی نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور یہ بھی ان کے گھر میں سید فرحت، عذرا نقوی، آصف نقوی، محترمہ انجم، عارف نقوی اور مسعود نقوی سمیت سبھی افرادِ خانہ سے خوب اچھی طرح سے گھل مل گئے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی میں اپنے عارضی قیام کے دوران مصنف کی ملاقات ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور اقبال مہدی سے بھی رہی۔ اس ناولٹ میں مصنف نے رضا امام، امیر عارفی، شہریار، جنیدی، ہدایت محسنی، خلیل الرحمٰن اعظمی، نعیمہ جعفری پاشا، قاضی عبدالستار، وحید اختر، ایاز انصاری، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، قیصر زیدی، زویا زیدی، صبا زیدی، کرنل بشیر حسین زیدی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر خورشید الاسلام، خواجہ احمد عباس، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، ڈاکٹر ثریا حسین، سید شاہد مہدی، مشیر الحسن، انتظار حسین، کشور ناہید جیسی کئی شخصیات سے متعلق اپنی یادداشت لکھی ہے۔ اختر انصاری، غلام ربانی تاباں، آل احمد سرور، مولانا تقی علی اور قرۃ العین حیدر کا خاکہ بہت شاندار ہے، اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا سراپا پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آنکھوں پر خوب صورت چوڑے شیشوں کی عینک، کشادہ پیشانی، ترشے ہوئے گیسو، گلے کے گرد لپٹا ہوا دوپٹہ، سفید لباس جس پر ہلکے گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول، چہرے پر بلا کی معصومیت کے ساتھ غضب کا پُر وقار رعب، مقناطیسی قوت کا مجسمہ۔ پہلی نظر میں مجھے یوں لگا جیسے چاند سے اتری ہوئی کوئی پری ہو۔''

اس ناولٹ کے ذریعے غیاث الرحمٰن سید نے ہمیں ایک ایسی قرۃ العین حیدر سے متعارف کرایا ہے، جو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں کی دلدادہ تھیں۔ مصنف کو غیر ملکی زبانوں سے جرمن، روسی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ کے تراجم پڑھنے کے لیے دیتی تھیں۔ نہایت ہی وضع دار، نفاست پسند، شریف النفس، صوم وصلوٰۃ کی پابند، نازک مزاج اور خطرناک حد تک غصہ ور، غریب، مسکین اور اپنے عہد کے مفلوک الحال تخلیق کاروں کی مستقل کفیل تھیں۔ یہ چوالیس صفحات کو محیط ہے۔

کتاب میں شامل دوسرا عنوان 'قاضی صاحب' ہے۔ یہ سب سے مختصر ناولٹ ہے۔ اس کی ضخامت تیس صفحات ہے۔ جسے میں نے ایک ہی نشست میں مکمل پڑھ لیا تھا۔ شخصی تعلقات و معاملات پر مبنی یہ بہت ہی دلچسپ تحریر ہے۔ جسے پڑھنے سے نہ صرف قاضی عبدالستار بلکہ پروفیسر خورشید الاسلام، ابوالکلام قاسمی، طارق چھتاری، شارق ادیب (مظفر سید)، مجروح سلطان پوری، راہی معصوم رضا، کیف بھوپالی، پانڈو رنگ ویش مکھ، منظور ہاشمی، نفیس غازی پوری اور خود مصنف غیاث الرحمٰن سید کی زندگیوں کے کئی ان کہے، گمنام اور پوشیدہ گوشوں کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ اس ناولٹ میں ابن کنول، سید محمد اشرف، محمد رفیع، کملیشور، آشفتہ چنگیزی، اسعد بدایونی، علی امیر، نسیم صدیقی، سرفراز ہادی، نعمان، انعام الحق، دلیپ کمار، ندا فاضلی اور شمیم خان کا تذکرہ سرسری اور ضمنی ہوتے ہوئے بھی بہت اہم ہے۔

کتاب کا تیسرا ناولٹ 'اس شہر میں...' ہے، یہ بانوے صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں مصنف نے ممبئی شہر سے متعلق اپنے اسفار، فلمی دنیا میں اسکرپٹ رائٹنگ کی جد و جہد، اس شہر سے وابستہ اپنی مکمل یادداشت کو بہت تفصیل سے درج کیا ہے۔ اس ناولٹ کا سب سے دلچسپ حصہ ایک ہجڑے کی روداد ہے۔ اردو فکشن میں تیسری جنس یا LGBTQ پر کم ہی گفتگو کی گئی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے قیصر نقوی، رضا امام، اور امیر عارفی جیسے اپنے کئی محسنین کے ساتھ ساتھ اپنے معاونین نور جہاں (ساجدہ زیدی کی نوکرانی)، مہرو (سنجیدہ کی نوکرانی) اور ہارون (مہرو کا بیٹا) کو بھی برابر جگہ دی ہے اور کسی کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سے مصنف کی احسان شناسی اور دیانت داری کا علم ہوتا ہے۔ ادب اور فلموں سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے یہ کتاب یکساں مفید ہے۔

متفرقات

ورق ورق نیا آہنگ

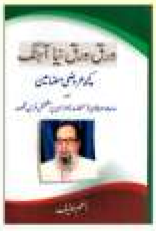

مصنف: ڈاکٹر اسلم حنیف

صفحات: 538، قیمت: 800 روپے

مطبع: ہوپ پرنٹرس، موجپور، دہلی

مبصر: شارق عدیل، محلہ: چوبدار، پوسٹ: مارہرہ، ضلع: ایٹہ، یوپی

'اسلم حنیف اردو زبان و ادب کا پہلا منفرد شاعر' (خود ساختہ شعری اصناف اور مختلف النوع شعری تجربات کے حوالے سے) کے مطالعے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اسلم حنیف، بیس شعری اصناف کے موجد ہیں اور مختلف اصناف کے حوالے سے انھوں نے جو تجربات کیے ہیں ان کی تعداد تمیں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مرتب (ڈاکٹر فراز حامدی) نے کتاب کا عنوان کسی عقیدت یا مبالغہ کے مدنظر نہیں بلکہ کتاب کے مشتملات کی بنیاد پر رکھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی بھی صنف یا تجربہ ہیئت و آہنگ کے اصولوں کی نفی نہیں کرتا۔

متذکرہ تحیر آمیز ادبی اضافوں پر مشتمل کتاب کے سترہ سال بعد اب اسلم حنیف کا مجموعہ 'ورق ورق نیا آہنگ' منصۂ شہود پر آیا ہے۔ یہ مجموعہ نثر و شاعری کا مشترک مجموعہ ہے جو تیرہ ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے اور آخری باب کا تعلق عروض و آہنگ ہے، پر مشتمل مضامین سے ہے۔ درمیانی گیارہ ابواب میں غزلیات اور مختلف غزلیہ تجربے شامل ہیں۔ ہر باب کو اسلم حنیف نے کئی کئی شخصیات کے نام معنون کیا ہے جن میں خاندان کے افراد، ادبی شخصیات اور اقربا شامل ہیں۔ پہلے باب کا پہلا مضمون 'امتزاج اور پس امتزاج' اگر چہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نظریۂ امتزاج کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے مگر مصنف نے تخلیقی عمل میں دماغ کے گوشوں اور ان کے اعمال پر جس مدلل انداز میں بحث کی ہے اس سے فکر و فہم کے کئی نئے زاویے منور ہوتے ہیں۔ موصوف نے دماغی ساختوں کے حوالے سے جدید ماہرین نفسیات کے تصورات کے ساتھ قدیم اطبا کے نظریات کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ فرائڈ اور ینگ وغیرہ سے قبل بالخصوص اسلامی حکما علم النفسیات میں بیش بہا اضافہ کر چکے تھے اور انھیں کی تحقیقات کی بنیاد پر جدید ماہرین نفسیات نے اس علم کی عمارت نو تعمیر کی ہے۔

دوسرے یہ کہ علم النفسیات میں اگر چہ رقص، موسیقی اور شاعری کے حوالے سے بحثیں تو کی گئی ہیں مگر ان افعال کا تعلق کس مخصوص گوشے یا ساخت سے ہے۔ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اسلم حنیف نے متذکرہ فنون لطیفہ کا تعلق ذہن کے ایک مخصوص گوشے سے قرار دیا ہے جس کا نام انھوں نے 'غنائیہ' رکھا ہے۔ تیسرے یہ کہ موصوف نے فرائڈ اور ینگ وغیرہ کے خیالات کو آنکھیں میچ کر قبول نہیں کیا ہے بلکہ غور و فکر کے بعد قابل قدر خیالات سے اتفاق کیا ہے اور جہاں انھیں کسی قسم کا جھول نظر آیا ہے اس پر مدلل تنقید کی ہے۔

وہ 'ینگ' کی طرح اجتماعی اور نسلی لاشعور کو ایک ہی شے تصور نہیں کرتے بلکہ وہ دلائل سے انھیں دو ساختیں یا ایک سکے کے دو رخ ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ جو تجربات و مشاہدات اگلی نسلوں میں منتقل ہو کر اجتماعی لاشعور بنتے ہیں وہ اپنے عہد میں فرد کے اجتماعی شعور کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ ینگ نے اس طرف غور نہیں کیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعی شعور بھی اسلم حنیف کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اسلم حنیف نے غنائیہ کو موسیقی، رقص اور شاعری میں لحن و آہنگ کی فراہمی کی بنیادی قوت قرار دیا ہے اسی لیے اپنے دوسرے مضمون 'غنائیہ کا عمل اور خلیل بن احمد کا تحقیقی کارنامہ' میں انھوں نے عروض کو خلیل بن احمد کا سائنٹفک تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے مطابق خلیل بن احمد نے عربی کے شعری سرمائے کا سائنٹفک تجزیہ کر کے عروض کو مدون کیا ہے، عروض اس کا خود ساختہ علم نہیں ہے۔

متذکرہ مضامین کے بعد اسلم حنیف، خلیل بن احمد کے مرتبہ عروضی نظام کو ان عنوانات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ارکانِ عشرہ کی ترتیب میں حروف کی اہمیت، فلک ارکان، زحافات اور عمل زحافات، فروع، حکم معاقبہ، قاعدہ فک، بحور، مطلع کی اہمیت اور قافیہ کی جامع اسلمی تعریف، ان عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 'ورق ورق نیا آہنگ' کے مضامین دیگر عروض و بلاغت کی کتب سے قدرے مختلف ہیں۔

موصوف نے خلیل بن احمد کے عروضی نظام کے مضمر جامعیت و وسعت کو سہل انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنی تخلیق کردہ غزلوں میں ناقابل یقین اوزان کا استعمال کر کے اس حقیقت کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ہے۔ عام عروضی کتب میں مطلعے سے متعلق یہ بیان ملتا ہے کہ یہ غزل کا پہلا ایسا شعر ہوتا ہے جس کے دونوں مصاریع باہم مقفٰی ہوتے ہیں، لیکن یہ وضاحت نہیں ملتی کہ مطلع کے قوافی اور بحر و ارکان مزید اشعار کی تخلیق کے لیے کس کس قسم کی رعایتیں اور پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ موصوف نے اس مضمون میں مطلع کی اسی اہمیت کو مفصل بیان کیا ہے۔ قافیہ کے حوالے سے جو تعریف عروض و بلاغت کی کتابوں میں درج ہے وہ پیچیدہ اور ناقص ہے۔ اسلم حنیف نے اپنے مضمون 'قافیہ کی جامع اسلمی تعریف' میں اسی گتھی کو ہمیشہ کے لیے سلجھا دیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ایک مبتدی بھی آسانی کے ساتھ قافیہ کی تعریف و حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے۔

'ورق ورق نیا آہنگ' کے باب اوّل کا آخری مضمون قدیم عربی شاعری میں رکنیہ (سلیبلز) کا استعمال عبید بن الابرص کے قصیدے کے حوالے سے حیرت انگیز تحقیقی مضمون ہے۔ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار برس تک جس قصیدے کو عربی کے ماہرین عروض ناموزوں اور خطبہ کہتے رہے ہیں، اسلم حنیف نے عربی اوزان، ہندی کے ماترائی نظام اور انگریزی کے سلیبلز کے تحت اسی کا لحنی تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ قصیدہ نہ تو عربی کی کسی بحر میں ہے اور نہ ہی ہندی کے کسی چھند میں، البتہ اس کے اکثر اشعار انگریزی کے صوتی عروضی نظام پر پورے اترتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے، قدیم دور میں عربی شعرا عروضی آہنگ کے علاوہ سلیبلز کے اصولوں کے تحت بھی شعر کہتے تھے۔ کتاب کے آخری باب میں تجزیات کے عنوان سے شارق عدیل کے ان مطبوعہ مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو ان کی متعدد اوزان پر مشتمل غزلوں مثلاً 'ایک سو آٹھ اوزان کی غزل' 'ایک سو تمیں اوزان کی غزل' اور اسی طرح کی دوسری غزلوں کے عروضی تجزیے اور آزاد غزل سے متعلق ان کے نظریے کا احاطہ کرتے ہیں۔

ان مضامین کی 'ورق ورق نیا آہنگ' میں شمولیت کا اہم مقصد یہ ہے کہ جو غزلیں اسلم حنیف نے 'صنعت متلون' میں تخلیق کی ہیں ان کی بحور و اوزان اور عروض سے دلچسپی رکھنے والا عام قاری بھی آگاہ ہو سکے۔ یہ کتاب ایک معلم کی حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی قرأت میں اگر چہ اس کا مطالعہ ادق ہونے کا احساس دلاتا ہے مگر دوسری اور تیسری بار اس کتاب کو بغور پڑھنے پر یہ اپنے رموز کھولنے لگتی ہے اور قاری اس کتاب کی آفاقیت و انفرادیت کے سحر میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو کے اعلیٰ تعلیمی نصابوں میں شامل ہونی چاہیے۔

شاعری

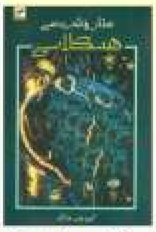

ستارۂ شب سے ہم کلامی

شاعر: ایم۔ جے۔ خالد
صفحات: 344، قیمت: 450 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: فاروق ارگلی، 25، گنیش پارک، رشید مارکیٹ، دہلی 51

ماہر الیکٹرانک صحافی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت یافتہ جناب ایم جے خالد اپنی نثری و شعری تخلیقات کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'نہادِ نو' 1997 میں شائع ہوا تھا۔ ارباب نقد و نظر نے اس مجموعے کے توسط سے انھیں ایک قادر الکلام اور خوش فکر شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا تھا، اور اب رُبع صدی کے بعد اُن کی خوبصورت غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ 'ستارۂ شب سے ہم کلامی' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ خالد کا کلام تمام ترقی روایات اور کلاسیکی شعری تلازمات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ان کے فکری اُفق کی وسعت، منفرد لب و لہجے اور نئے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اکیسویں صدی کی نمائندہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خیالوں کے محل، شیشے کے پیکر ٹوٹ جاتے ہیں	نہ کر خوابوں پہ تکیہ خواب اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
کئی خورشید زندہ ہو اٹھے ہیں لالہ و گل میں	پسِ زنجیر نفساں، چشمِ تر کی آزمائش ہے
اک حادثہ کی زد پہ تھا پھر شہرِ آرزو	پھر خواب زندگی کے نئے بام و در کھلے

مجموعے میں جو نظمیں ہیں وہ بھی بہت متاثر کرتی ہیں۔ 'بچپن' عنوان کی یہ نظم دیکھیں۔

کسی برگد کے روٹھے سایوں جیسی / وہ کچھ ویران الجھی الجھی گلیاں
ہر اک دیوار کی بوسیدہ تہہ میں / کوئی جیسے کہ آنسو بو گیا ہے
انھی گلیوں میں بچپن کھو گیا ہے
اسی رہ پہ نقوشِ پا ہیں میرے / چلو آؤ تلاشیں مل کے یارو
کوئی یادوں کا بھیگا بھیگا موسم / کسی آنگن میں تھک کر سو گیا ہے
انھی گلیوں میں بچپن کھو گیا ہے... الخ

اس وقیع مجموعے میں شامل غزلوں اور نظموں کے معیار اور شاعر کی فکری و فنی ریاضت سے یہ تاثر ذہن میں اُبھرتا ہے کہ اگر خالد شہرت پسند مشاعروں کے شاعر ہوتے تو ادبی دُنیا کے معتبر اور مقتدر شعرا میں اُن کا شمار ہوتا اور ان کی تخلیقات ادبِ عالیہ کے نصاب کا حصہ بن چکی ہوتیں۔

'حرفِ آغاز' کے عنوان سے ایم جے خالد نے شاعری کے تعلق سے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری بہ حیثیتِ فن اپنے نامیاتی خلق کو چیلنج کرنے کا نام ہے۔ شاعر عرفانِ ذات سے تشہیدِ کائنات کے سفر میں جزئیاتِ نفس سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اپنی کاوشِ ناتمام کو فرازِ شناخت کی بلندی تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ یہی اس کا کمال بھی ہے اور مقدر بھی۔ یہی سبب ہے کہ عصرِ حاضر میں تخلیق کے شانہ بہ شانہ تجراتی منشور کی حدوں کو چھو لینے کا اضطراب خطِ تحمل سے متصادم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ لسانی مجددین واقف ہیں کہ تخلیق شعر کے تجربہ میں نہایت اذیت انگیز سفر کا لامتناہی سلسلہ پیوست رہتا ہے۔ ساتھ ہی یہ حیرت انگیز طور پر درنجات بھی وا کرتا ہے۔ رواں صدی کے انقلابی مزاج نے عالمی شعریات سے متعلق لاتعداد کلیشے توڑے ہیں۔ زبان کے اسما و افعال کی سطح پر خارجی اور داخلی عوامل میں قابلِ شناخت تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔ ترکیب و بندش کی نئی صورت پذیری بھی عہدِ موجود کا ناقابلِ تردید سچ ہے۔ لہجہ کے انفراد کے ضمن میں اس کی تکثیری فعالیت و نوعیت بھی بحث کا مصدر ہے۔ حسن و صداقت کی لافانی بنیادوں پر فکرِ انسانی نے وہ عظیم تخلیقات پیش کی ہیں جنھیں لوحِ حیات پر رقم کی گئی اجتماعی لاشعور کی بوطیقا کہا جاسکتا ہے۔''

شاعری اگرچہ خالد کا پہلا عشق ہے لیکن اُن کی صحافتی، ثقافتی، علمی مصروفیات نے اُن کی شاعرانہ خوبیوں کو پوری طرح اُجاگر نہیں ہونے دیا جبکہ شاعری اُن کے مقصدِ حیات کی طرح ذہن و روح میں رچی بسی رہی جواب 'ستارۂ شب سے ہم کلامی' کے پیکر میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

ایم جے خالد کا تعلق بہار کے ایک معزز علمی خانوادے سے ہے لیکن ان کا بچپن مدراس میں گزرا، ان کی ابتدائی تعلیم مدراس میں ہی گریجویشن تک مکمل ہوئی، اس کے بعد وہ دہلی آگئے اور اعلیٰ تعلیمی مدارج یہیں طے کیے۔ فلسفہ اور تاریخ میں ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں سے سرفراز خالد ہفت زبان ہیں۔ اُردو، ہندی، انگریزی، فارسی اور جاپانی پر مادری زبان جیسی گرفت رکھتے ہیں۔ مطالعہ کا شوق انھیں فطرت کی طرف سے خاص طور پر ودیعت ہوا ہے۔ عالمی ادبیات، تاریخ، فلسفہ اور سماجیات پر ان کی گہری نظر ہے جس کی جھلک ان کی اردو شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ خالد حکومت ہند میں ایک ذمے دار منصب پر بھی فائز رہے ہیں اور ان کا شمار ٹی وی نشریات کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ بطور صاحب نظر اور صاحب طرز شاعر ایم جے خالد کا یہ مجموعہ کلام یقیناً اُردو کی عصری شاعری میں سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ بہترین ہے۔ راقم کو یقین ہے کہ خالد کی یہ دُعا بارگاہِ خداوندی میں مستجاب ہوگی۔

میرا دَور غالب و میر سے ہر اعتبار سے ہے جدا
میں نئی بلندیاں سر کروں، مجھے امتیازِ کلام دے

ہم شہر غزل والے

مصنف: ڈاکٹر عنبر عابد
صفحات: 218، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023
مبصر: عثمان اعظمی، دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ

'ہم شہرِ غزل والے' بغداد ہند 'شہر بھوپال' کی صاحب طرز ادیبہ مشہور شاعرہ ڈاکٹر عنبر عابد صاحبہ کا شعری گلدستہ ہے جنھیں شعر و سخن گوئی اپنی والدہ ممتاز شاعرہ ممتاز صدیقی صاحبہ سے ورثہ میں ملی ہے اور اس خاندانی علمی ورثہ کو مزید نکھارنے اور تقویت بخشنے کے لیے انھوں نے شعر و سخن گوئی کے میدان میں طبع آزمائی کی اور ایک نمایاں مقام حاصل کیا کتاب کا نام 'ہم شہرِ غزل والے' ان کے اس شعر کی طرف منسوب ہے۔

تہذیب کی دہلیز پہ پیہم ہیں فروزاں	ہم شہرِ غزل والوں سے روشن ہے تمدن

ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف تنوع اور ہمہ جہتی پائی جاتی ہے وہیں دوسری طرف ہندوستانی تہذیب خصوصاً مشرقی تہذیب و روایات کا پاس، بچپن کی حسین نٹ کھٹ یادیں، وطن سے محبت، خوف خدا، موت کی یاد، خالق کی خلاقیت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

اس شعری مجموعہ کا آغاز بھی حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول سے ہوتا ہے۔ اس کے

بعد مختلف تصورات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں موصوفہ نے شعری انداز میں اپنے احساسات و جذبات کا انوکھے اور البیلے انداز میں اظہار کیا ہے۔کہیں خوشی کے جذبات ہیں، تو کہیں رنج وغم کا اظہار، کہیں اردو کو مظلوم قرار دیتے ہوئے نوحہ خواں ہیں، تو کہیں اردو کی خادمہ ہونے کی حیثیت سے خود کو اردو داں طبقہ میں شمار کرتے ہوئے فخریہ لکھتی ہیں۔

انداز بیاں گرچہ بہت خوب نہیں ہے اردو ہے زباں میری ہر اک لفظ نگیں ہے
کاش ہو جائے تو تہذیب کا پیکر عنبر تو نظر آئے جہاں قصہ اردو نکلے

وہیں دوسری طرف اردو کی مظلومیت پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

میں تو آنگن کی تیرے راج دلاری تھی کبھی کیوں کیا فرق میرے ساتھ بھی اردو کی طرح

ایسے ہی علم وادب کا گہوارہ شہر' بھوپال' جو مصنفہ کا آبائی وطن ہے کو یوں مخاطب کیا ہے۔

یہاں اردو ہواؤں میں گھلا جادو فضاؤں میں
ادب کے چشمے بہتے ہیں اسے بھوپال کہتے ہیں
وراثت یہ ہماری ہے ہمیں جاں سے بھی پیاری ہے
یہیں پر ہم بھی رہتے ہیں اسے بھوپال کہتے ہیں

مشرقی تہذیب کا تصور ہر ہندوستانی کی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے کس خوبصورت انداز میں مصنفہ نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔

چھین لے مشرقی تہذیب کی سر سے جو ردا ہم کبھی ایسی ترقی کے طلب گار نہیں
طرز مغرب سے نہیں نیم لباسی سے نہیں اپنی پہچان فقط مشرقی پوشاک سے ہے

موت ایک ایسا کڑوا جام ہے جسے ہر کس و ناکس پینے پر مجبور ہوتا ہے ایسی تلخ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے ''ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے'' جس کی شاعرانہ تفسیر کچھ یوں کرتی ہیں۔

سانسوں کا تسلسل نہ جانے کس گھڑی ٹوٹے چند روزہ دنیا سے کا ہے دل لگاتے ہیں
پھر یہ سانسوں کا پرندہ کبھی لوٹے گا نہیں جسم کی قید سے جس دن بھی رہائی ہوگی

بیٹیوں کو حدیث نبوی میں رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی دینی پرورش و پرداخت پر وحی زبان و رسالت سے جنت نعیم کا وعدہ ہے، حدیث کا یہ مفہوم محترمہ کے اس شعر میں نمایاں ہے۔

جس کے آنگن میں نہ بیٹی کی صدائیں گونجیں گھر نہیں ہوتا ہے عنبر وہ مکاں ہوتا ہے
غم گساری وفاداری ہے فطرت اس کی دوست دنیا میں نہیں کوئی بھی بیٹی کی طرح

قرآن کی آیت ''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اے اللہ تو ہی مجھے شفا دیتا ہے'' کی تفسیر محترمہ نے کچھ یوں کی ہے۔

حکم ربی سے شفا ملتی ہے اصلاً عنبر ہم تو بس وہم مسیحائی لیے بیٹھے ہیں

تقدیر پر ایمان لانا ہر ایک مسلمان پر فرض ہے، انکار کی کوئی گنجائش نہیں قرآنی آیات اور احادیث کے ابواب بعنوان تقدیر بھرے پڑے ہیں اسی کو دو مصرعے میں سمیٹتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں۔

کوششیں کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا عنبر چال چلتی ہو جو تقدیر کو چل جاتی ہے

رات کے آخری پہر اللہ جل شانہ کا سمائے دنیا پر نزول ہوتا ہے جس وقت اس کے عبادت گزار بندے رات کی تنہائی میں اپنے رب سے لو لگاتے اور طلب حاجات کے لیے دست سوال دراز کرتے ہیں اور گڑگڑا کر مانگتے ہیں اسی پر تاثیر و پر کیف لمحہ کو محترمہ نے یوں بیان کیا ہے۔

حق میں اوروں کی ہیں جب بھی دعا نصف شب
سر سے میرے بھی ٹلیں کتنی بلائیں از خود

اس کے علاوہ بہت سے مختلف مضامین پر مصنفہ کے اشعار ہیں لیکن ایک اچھا خاصا حصہ عشق ومحبت پر مشتمل ہے بطور مثال صرف دو مصرعے پیش کرتا ہوں۔

جس عین شین قاف سے میں بھاگتی رہی اف وہی میرے پاؤں کی زنجیر ہو گیا

ڈاکٹر عنبر عابد صاحبہ کا یہ حسین شعری گلدستہ کسی ایک خاص موضوع یا مضمون پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ایسا تنوع و ہمہ گیریت اور رنگارنگی و دلآویزی ہے کہ ان کے اشعار کی طرف بے ساختہ دل کھنچے چلے آتے ہیں۔

ادب اطفال

بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی

مصنف وناشر: حبیب سیفی

صفحات: 544، قیمت: 580، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: محمد سراج عظیم

A47 ذاکر باغ سوسائٹی، بالمقابل سوریا ہوٹل، نئی دہلی 25

اردو ادب میں بچوں کے ادب کی روایت تقریباً دو صدی پر محیط ہے۔ گو کہ گذشتہ صدی کی ساٹھویں دہائی سے پہلے ادب اطفال کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ادب اطفال کی اصطلاح اصلاً اردو ادب میں اسّی کی دہائی میں رائج ہوئی اور بچوں کے ادب کو باقاعدہ الگ سے ایک پہچان ملی۔ اس کے بعد ادب اطفال میں مختلف موضوعات اور اصناف پر کام کو بھی مصنفین اور قارئین مختلف زمروں میں رکھنے لگے۔ جس میں سب سے اہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ادب اطفال میں ضرورت زیادہ محسوس کی جانے لگی۔ حالانکہ یہ بھی ایک کڑوی سچائی ہے کہ باوجود اس کے کہ بچوں کے ادب میں سائنسی ادب گزرے وقت کے مقابلے زیادہ لکھا جا رہا ہے مگر اتنی کثرت سے نہیں جتنا دوسری زبانوں کے ادب میں سائنس پر مبنی مواد مل جاتا ہے۔

اردو ادب اس میدان میں پچھڑا ہوا کیوں ہے؟ اس پر ارباب اردو زبان وادب کو سوچنا چاہیے اور اس کے تدارک کی سبیل تلاش کرنی چاہیے۔ زیر تبصرہ کتاب 'بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی' میں اس کے مصنف حبیب سیفی نے بچوں کے ادب میں سائنس کے حوالے سے جہاں اس کا احاطہ کیا ہے وہیں دور حاضر میں سائنس وٹیکنالوجی کی ادب اطفال میں اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

ادب اطفال میں تحقیقی وتنقیدی کام خال خال ہی نظر آتا ہے۔ شاید اردو ادب سے تعلق رکھنے والے اہل نقد ونظر نے ادب اطفال کو بچوں کے ادیبوں کی طرح قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ مگر حبیب سیفی جیسے کچھ ادب اطفال نے بچوں کے ادب کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس سمت بھی اپنے قلم کو جنبش دی اور 'بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی' ادب اطفال میں سائنس کی حصہ داری پر مبنی تحقیقاتی دستاویزی صورت میں معرض وجود ہوئی۔ زیر نظر کتاب میں حبیب سیفی نے اپنی تحقیق کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان ابواب کو مزید ذیلی عنوانات کے تحت منقسم کیا ہے:

باب اوّل: بچوں کا ادب، (ادب اطفال) نشو ونما وارتقا۔
باب دوم: بچوں کے نثری ادب میں سائنس کی عکاسی۔
فصل اوّل۔ بچوں کا نثری ادب تخلیق کرنے والے اہم ادباء (سوانح)
فصل دوم۔ بچوں کے نثری ادب میں سائنس کی عکاسی

باب سوم: بچوں کے منظوم ادب میں سائنس کی عکاسی۔
فصل اوّل۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے اہم شعرا (سوانح)
فصل دوم۔ بچوں کے شعری ادب میں سائنس کی عکاسی

حبیب سیفی نے بچوں کے ادب میں سائنس کے تعلق سے اپنی تحقیق کو بڑی دیدہ ریزی اور باریک بینی سے مکمل کیا ہے۔ اس کا اندازہ کتاب کی ضخامت اور ابواب بندی کے تحت نثری اور شعری خزینہ کی پوری تندہی اور دیدہ بینی سے تلاش ونتائج کے اخذ سے ہوتا ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے ادب اطفال کی تاریخ مختلف ادوار میں صورت حال اور دور حاضر میں ادب اطفال کی اہمیت اور رجحانات پر مدلل اور جامع بحث کی ہے۔ ان کے اس مقالے میں جگہ جگہ اور موقع کی مناسبت سے ماضی وحال میں تقابل بھی کیا گیا ہے تو مستقبل کے رجحانات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر عبدالغفار کا پیش لفظ ہے، جس میں انھوں نے بجا طور پر بچوں کے ادیبوں سے سائنس وٹیکنالوجی سے صرف نگاہ کا شکوہ کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ نسل نو کی صلاحیتوں کا رخ سائنس کی طرف موڑنا ضروری ہے تاکہ وہ زمانے کے ہم کاب ہو سکیں۔ اپنے اصل مقالے سے پہلے مصنف نے بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی پر تقریباً 32 صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں حبیب سیفی نے اپنے تحقیقی طریقۂ کار اور مآخذ پر بات کی ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں سائنس وٹیکنالوجی کے حوالے سے مواد کی حصولیابی میں انھیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بظاہر یہ مقالہ دو سال میں مکمل ہوا، مگر اس پر وہ پچھلے دس سالوں سے کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد مختلف عناوین کے تحت حبیب سیفی نے سائنس اور اس سے متعلقہ ادب میں مبادیات پر بہت اہم مضامین تحریر کیے ہیں، جو نہ صرف اردو ادب سے تعلق رکھنے والے قاری کے لیے پڑھنا ضروری ہیں، بلکہ ادب اور دین اسلام میں سائنس کی اہمیت اور باہمی ربط کو متعین کرنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ حبیب سیفی نے اردو زبان کے قلمکاروں کے علاوہ دوسری زبانوں کے چند گمنام قلمکاروں کا بھی اپنے مقالے میں تذکرہ کیا ہے۔ اس سے ان کی وسعت نظری، تحقیقی نظریہ اور ان کے کام کی افادیت واہمیت کا بھی پتا چلتا ہے۔

پہلے حصے میں بلحاظ بچوں کا ادب اس کی نشو ونما وارتقا پر بات کی گئی ہے، اور تاریخ ادب اطفال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش ہوئی ہے کہ بچوں کے ادب میں اگلے وقتوں میں نثر لکھنے کا رواج کیسا تھا، اور کس انداز سے اُردو کا فروغ ہوا، ساتھ ہی بچوں کے ادب کا ارتقا کتنی رفتار سے ہوا ہے۔ اسی باب میں یہ بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ حال کے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا یہ ادب اطفال 21 ویں صدی کے تقاضے پورے کر بھی رہا ہے یا نہیں۔ باب سوم میں سائنسی نقطۂ نظر پر موقوف شاعری شامل ہے۔ اگلے وقتوں کے لکھنے والوں نے اپنے عہد کے بچوں کو اپنی تخلیقات سے مطمئن کرنے کی کسی حد تک کوشش کی ہے اس طرح تینوں ابواب میں بھرپور گفتگو ہوئی ہے۔

یہ ادب اطفال میں ایک اہم تحقیقی کام ہے، جو دَورِ حاضر میں بچوں کے ادب میں ایک اہم پیش رفت ہے، اس سے مستقبل میں ریسرچ اسکالرس اور ادب اطفال پر کام کرنے والے مستفید ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس بہترین کتاب کی پذیرائی ہوگی، خصوصاً ادب اطفال میں تحقیق وتنقید کے سلسلے میں یہ سنگِ میل ثابت ہوگی۔ میں حبیب سیفی کو اس اہم کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تراجم

مختصر سنسکرت کہانیاں (حصہ دوم)

ترتیب وانتخاب: جے منت مشر، ہندی سے اردو ترجمہ: محمد خلیل
صفحات: 137، قیمت: 175 روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی۔ 1
مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

سنسکرت دنیا کی قدیم ترین زبان ہے جسے 'دیوبانی' بھی کہا جاتا ہے کہ سناتن دھرم کے مقدس صحیفے اسی زبان میں ہیں۔ یہ زبان نہایت ہی شستہ اور شائستہ سمجھی جاتی رہی ہے اور بعد کی بہت سی زبانیں سنسکرت سے ہی ماخوذ، مستفاد اور مستعار ہیں۔ سنسکرت کا جو ویدک ادب ہے وہ اہمیت کا حامل تو ہے ہی، باقی اس کے کلاسیکی ادب کی بھی اپنی ایک الگ ثقافتی اور تہذیبی معنویت ہے۔ دراصل یہ زبان ہندوستان کے تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی تشخص کا منبع ومظہر ہے۔ اس اہم ترین زبان میں علوم وفلسفہ کا انتہائی بیش قیمت سرمایہ ہے کہ ماضی بعید سے ہی مختلف زبانوں میں سنسکرت سے تراجم کی ایک مستحکم اور مضبوط روایت رہی ہے۔ یجروید، اپنشد، منوسمرتی، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا وغیرہ کے بہت سے تراجم اردو میں بھی ہوئے ہیں اور سنسکرت کے کلاسیکی ادب کا دنیا کی دوسری زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، خاص طور پر سنسکرت کے وِدْوان کالی داس کی بہت سی کتابوں مثلاً کمار سمبھو، شکنتلا، میگھ دوت، مالویکا گنی متر، رتو سمہار کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھرتر ہری، مہاکوی بھاس وغیرہ کے ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔ اچاریہ وشنوگپت کی 'پنچ تنتر' کا ترجمہ تو دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوا اور 'کلیلہ ودمنہ' کے نام سے یہ کتاب عرب دنیا میں بہت مقبول ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے ہیں۔ 'پنچ تنتر' دراصل اخلاقی کہانیوں کا خوب صورت مجموعہ ہے۔ 'اخلاق ہندی' کے نام سے سنسکرت کی کہانیوں کا بھی ایک مجموعہ بہت ہی مقبول ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ ہتوپدیش اور کتھا سرت ساگر وغیرہ کے ترجمے بھی اردو میں ہو چکے ہیں۔ نرائن بھٹ کی ہتوپدیش کا فارسی میں 'نگار دانش' اور 'مفرح القلوب' کے نام سے ترجمہ ہوا ہے تو اردو میں اس کا ترجمہ منشی لال بارہ بنکی اور پنڈت شمبھوناتھ وغیرہ نے کیا ہے۔ جب سے اس اعلیٰ ترین مقدس زبان کا عوام سے رشتہ منقطع ہوا تو اس زبان کے جاننے اور پڑھنے والوں کی تعداد مختصر سے مختصر ہوتی گئی اور آج اس زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مردہ زبان ہے۔ اور کبیر نے بھی اسے ٹھہرے ہوئے کنویں کا پانی کہا ہے۔ جب کہ قدیم افکار واقدار کو اسی زبان نے زندگی عطا کی ہے اور بھارت کی بیشتر ثقافتی اور مذہبی علامتیں اسی زبان میں محفوظ ہیں مگر اب یہ مخصوص حلقے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم اس زبان کی اہمیت اب بھی برقرار ہے اور اہل ہند کو چاہیے کہ اس زبان کو زندگی دے کر اس کے علمی، مذہبی اور ادبی سرمایے سے استفادے کی راہ آسان کریں۔ ان دنوں سنسکرت سے براہِ راست استفادہ تو نہیں کیا جا رہا ہے مگر بالواسطہ سنسکرت زبان سے استفادے کی ایک راہ ضرور روشن ہوئی ہے۔

جے منت مشر جو سنسکرت ادب وقواعد کے ماہر ہیں انھوں نے سنسکرت کہانیوں کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے اور اسی کا ہندی سے اردو میں ترجمہ ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔ مترجم 'سائنس کی دنیا' کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل سائنٹسٹ ہیں۔ اس کتاب میں بہت سے اہم سنسکرت کہانی کاروں کے ترجمے شامل کیے گئے ہیں جن میں وید ویاس، سبندھو، بان بھٹ، ونڈی، سوم دیو، ودیاپتی جیسے اہم نام کے علاوہ شیودت پانڈے،

پربھوناتھ دویدی، اوماشنکرشرمارشی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب میں زندگی آمیز اور زندگی آموز اخلاقی کہانیاں ہیں، ایسی کہانیاں جو ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کے رنگارنگ زاویوں سے روشناس کراتی ہیں اور ان کہانیوں سے ہندوستان کے قدیم اخلاقی، تہذیبی اقدار کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ہمارا قدیم ہندوستان سنسکرتی، ثقافت، تہذیب وتاریخ کے اعتبار سے کتنا ثروت مند تھا۔ ان کہانیوں میں وہ سارے قدیم روحانی اور رومانی علائم اور اسطور بھی ہیں جو ہندوستانیت کا مظہر ہیں۔ ان کہانیوں میں جذبات اور احساسات کا ایک متحرک جہاں آباد ہے جن میں کئی ادوار کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ ایک بڑے عہد کو سمیٹتی ہوئی وہ کہانیاں ہیں جو ہمیں اپنے تہذیبی، ثقافتی ورثے سے روشناس کراتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ قدیم زمانے سے اب تک ہماری تہذیب کن کن تغیرات سے گزری ہے۔ کہانیاں پڑھتے ہوئے مختلف ثقافتی عہد کے دریچے کھلتے ہیں اور آنکھوں میں قدیم ہندوستان کی تہذیب وثقافت روشن ہوجاتی ہے۔ یہ صرف کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ان میں ہمارے قدیم ادوار کے بہت سارے رنگ اور آہنگ محفوظ ہیں اور یہی رنگ ہمیں اس صارفی عہد میں روحانیت کی روشنی دے سکتے ہیں۔

جگن ناتھ پاٹھک کی ایک کہانی 'پتا کے چرنوں میں پرنام سہت' کا یہ اقتباس دیکھیے:

''کیا آپ وقت ملنے پر اپنے پوتے یا پوتی کو سنسکرت کے مطالعہ کی ترغیب دیں گے، تاکہ وہ آپ کی ہی طرح ماہر سنسکرت داں ہوسکے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس وقت سائنس ریسرچ کی اشد ضرورت ہے مگر صرف سائنس کے ریسرچ سے کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر سائنس داں ہمارے مہارشیوں کے گرنتھوں کا مطالعہ کریں گے تو وہ خاص طور سے ہمارے سائنس داں کے علم میں اضافہ کریں گے۔ یہ میری ہی بدقسمتی ہے کہ میں آپ جیسے مہابھاشیہ کے مشہور دانشور کے ہوتے ہوئے بھی اس کے لمس سے محروم کردیا گیا ہوں۔

آپ کے مطابق ناستک ہوں، لیکن سائنس کا ماہر ہوکر بھی ہندوستانی تہذیب کو بہت مانتا ہوں۔ ابھی وقت مخالف ہے۔ لوگ سنسکرت زیادہ نہیں پڑھتے ہیں، مگر آپ جیسے سنسکرت کے ماہر اگر اس کا تحفظ دل سے کریں گے تو اس کی حفاظت لازماً ہوگی۔ محفوظ ہوکر وہ ہماری حفاظت کرے گی۔'' (ص 92)

محمد خلیل نے کہانیوں کا سادہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ گو کہ سنسکرت کہانیوں میں بہت سے اسماء وعلائم ایسے ہوتے ہیں جن کی تفہیم آسان نہیں ہے۔ پھر بھی انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کہانیوں میں جس نوع کے جذبات و احساسات اور تصورات کی عکاسی کی گئی ہے ان کی ترسیل قارئین تک ہوسکے۔ ■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ........................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—— ادارہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

بین الاقوامی غالب تقریبات

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام سہ روزہ بین الاقوامی غالب تقریبات کا انعقاد ایوان غالب میں عمل میں آیا۔ اس سلسلے کے پہلے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے معروف ہندی دانشور جناب اشوک واجپئی نے کہا کہ غالب تقریبات کے تحت ہونے والی سرگرمیاں ہماری علمی اور ثقافتی وابستگی کو واضح کرتی ہیں۔ سمینار کا موضوع 'غالب: راز حیات اور اضطراب آ گہی' غور وفکر کے بہت سے زاویے اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ غالب نے راز حیات کو سمجھنے کے بعد جس اضطراب کو محسوس کیا اسی نے ان کی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشی ہے۔ پروفیسر سید خالد قادری نے سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے یہاں اضطراب مختلف انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ اپنے اضطراب کو ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے کائنات کی تفہیم کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ جناب جسٹس آفتاب عالم نے صدارتی تقریر کے دوران کہا کہ انسان کی تمناؤں کا، خوابوں کا اور اس کے عزم کا جس قدر خوبصورت اور پراعتماد بیان غالب کے یہاں ہے میرے محدود مطالعے میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا یہ سمینار یہاں کی سب سے اہم سرگرمیوں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا ہماری کوشش رہتی ہے کہ سمیناروں کے موضوعات میں یکسانیت سے بچا جائے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر برس غالب کے یوم پیدائش کے موقعے پر دسمبر میں غالب تقریبات کا اہتمام کرتا ہے اور یہ تقریبات محض رسمی نہیں ہوتیں بلکہ ہم نے پورے سال کیا کیا اس کی ایک رپورٹ

بھی ہوتی ہے یہ رپورٹ کتابوں کی رونمائی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر جناب اشوک واجپئی صاحب کے ہاتھوں ڈاکٹر شمس بدایونی کو برائے اردو تحقیق وتنقید، پروفیسر آصف نعیم کو برائے فارسی تحقیق وتنقید، جناب سید محمد اشرف کو برائے اردو نثر، جناب خلیل مامون کو برائے اردو شاعری، جناب نصیرالدین شاہ کو برائے اردو ڈرامہ، اور ڈاکٹر کیول دھیر کو برائے مجموعی ادبی خدمات غالب انعام 2023 پیش کیا گیا۔ کتابوں اور انعام یافتگان کا تعارف ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل (کلام غالب) کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف غزل سنگر جناب امریش مشرا نے اپنے مخصوص انداز میں غزل سرائی کی۔

پروگرام کے دوسرے دن چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت فارسی کے ممتاز دانشور پروفیسر چندر شیکھر نے فرمائی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ غالب کے سلسلے میں بعض جملے اس طرح مشہور ہوگئے ہیں کہ ہم ان پر دوبارہ غور نہیں کرتے۔ مثلاً مغلوں نے ہندستان کو دو تحفے تاج محل اور اردو کی شکل میں دیے ہیں۔ اردو مغلوں سے پہلے اپنا وجود رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اساتذہ کی کہی ہر بات درست ہو ہمیں ہر بیان کو تجزیے کے عمل سے گزارنا چاہیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر نریش نے '1857 کیوں چپ رہی زبان غالب'، پروفیسر محمد غلام ربانی (بنگلہ دیش) نے 'غالب کی امن پسندی ان کے مکتوب کی روشنی میں'، پروفیسر رضا علی حبیبی (ایران) نے 'غالب شناسی در ایران' اور ڈاکٹر محمد اکمل نے 'غالب کی مقبولیت کی وجہ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاہد اقبال نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فرمائی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ غالب شعر میں معنی کا خزانہ بھر دیتے ہیں اور اس میں ایسا ایجاز پیدا کردیتے ہیں جو دوسرے شعرا کے حصے میں نہیں آیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'غالب کی ایک منفرد فارسی غزل' جناب امیر مہدی نے 'غالب: راز حیات اور اضطراب آ گہی'، ڈاکٹر معراج رعنا نے 'غالب کی داخلیت: عدم سے وجود معنی تک' اور ڈاکٹر معید الرحمٰن

نے 'کلام غالب میں غیر کی جلوہ گری' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر شاداب تبسم نے ادا کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ رازِ حیات ہی وجود کا سب سے بڑا اضطراب ہے اور اضطراب کے ہی بطن سے ہر تخلیق وجود میں آتی ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے غالب کی ترقی پسندی، پروفیسر اسلم جمشید پوری نے 'غالب کا تصور انسان'، پروفیسر ابوبکر عباد نے 'غالب کا طرز حیات، کشمکش حیات اور اضطراب آگہی' اور ڈاکٹر الطاف انجم نے 'غالب اور نوآبادیاتی ادب' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ابراہیم افسر نے کی۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد کاظم نے فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ آج کے سمینار کا موضوع بہت دلچسپ ہے اس موضوع کی خوبی یہ ہے کہ ہم غالب کے تصور حیات اور ان کے اضطراب کو سمجھتے ہوئے اردو کے دیگر تخلیق کاروں کے فن کو اس آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر آصف علی عادل علی محمد (ماریشس) نے 'غالب کا طرز احساس اور محسوسات کی بوقلمونی'، ڈاکٹر تاشیانہ علی محمد (ماریشس) نے 'مرزا غالب کی طرز فکر' اور ڈاکٹر نصرت جبیں نے 'مرزا غالب اور انیسویں صدی کی عورت' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر امیر حمزہ نے کی۔

سمینار کے بعد عالمی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فرمائی اور جناب امیر مہدی نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ عالمی مشاعرہ میں ملک و بیرون ملک کے ممتاز شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ کی نظامت جناب معین شاداب نے فرمائی۔

تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ بڑے شاعر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جس زمانے کی بصیرتوں کو اس میں تلاش کیا جائے اس میں مل جاتی ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے 'کلام غالب کے نقش ہائے رنگا رنگ'، ڈاکٹر ریحان حسن نے 'غالب کی نظر میں راز حیات و ممات' اور ڈاکٹر سید ثاقب فریدی نے 'غالب کی غزل میں زندگی کی بے ثباتی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نوشاد منظر نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ غالب کے یہاں بے خودی آگہی کے مترادف ہے۔ آشوب آگہی کی ترکیب ان کے علاوہ شاید ہی کسی شاعر نے استعمال کی ہو۔ وجود کی حقیقت کوئی مفکر یا سائنس داں دریافت نہیں کر سکا صرف شاعر ہی کسی حد تک اس کی حقیقت کو واضح کر سکتا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر عتیق اللہ نے 'غالب خاطر آگاہ اور حیطۂ ادراک'، پروفیسر انیس اشفاق نے 'غالب کا طلسم خانۂ آزار'، اور ڈاکٹر خالد علوی نے 'غالب کا انداز فکر' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محترمہ سیمیں فلک نے کی۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے فرمائی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ اضطراب اور آگہی ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ آگہی کے بطن سے ہی اضطراب جنم لیتا ہے ورنہ بے خبری تو آسائش کا سبب ہوا کرتی ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'غالب کا تصور حیات' اور پروفیسر فاروق بخشی نے 'غالب اور ترقی پسند تنقید' اور پروفیسر سید حسن عباس نے 'غالب کی خودشناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی۔ پروفیسر سید خالد قادری نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کا موضوع بہت اہم تھا، جدید تھیوریز کی روشنی میں اس موضوع کو دیکھنا چاہیے اور یہ کام ہماری نوجوان نسل بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ غالب کے سلسلے میں عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اب نئے گوشے کا امکان ختم ہو گیا ہے لیکن غور کیا جائے تو نئے گوشے برآمد ہوتے ہیں۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ایک مدرسۂ تعبیر غالب اور تفہیم غالب کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ سمینار کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کی ذیلی شاخ 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کی جانب سے اردو ڈرامہ 'چوتھی کا جوڑا' پیش کیا گیا جسے عصمت چغتائی نے افسانے کی شکل میں لکھا ہے اور جناب سرفراز احمد نے اسے ڈرامے کی شکل دی ہے۔ جناب عباس حیدر کی زیر ہدایت کاری یہ ڈرامہ اسٹیج ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2023

دہلی

ذاکر حسین دہلی کالج مشرقی زبانوں کا مرکز ہے

نئی دہلی: شعبۂ فارسی ذاکر حسین دہلی کالج میں بعنوان 'مشرقی زبانوں کا مرکز خصوصاً عربی، فارسی اور اردو' ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس خطبے کے لیے بحیثیت مقرر پروفیسر چندر شیکھر سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کو مدعو کیا گیا۔ اپنی گفتگو میں کہا کہ دہلی کالج ماضی میں بھی مشرقی زبانوں خصوصاً عربی فارسی اردو اور سنسکرت کا مرکز تھا اور حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ اس پروگرام کی سرپرستی کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے فرمائی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے کی۔ نظامت ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے کی۔ رسم شکریہ پروفیسر جمیل الرحمٰن نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 دسمبر 2023

کل ہند خطاطی فیسٹول

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں انجمن خطاطان ہند کے باہمی اشتراک سے دو روزہ کل ہند نمائش اور مسابقہ خطاطی کا اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں کل ہند کتابت قرآن کریم اور خطاطی کی نمائش کا پہلا دو روزہ پروگرام منعقد کیا گیا جس میں ایران اور ہندوستان کے ماہر خطاطوں نے شرکت کی۔ پروگرام کی سرپرستی کرنے والے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر نے ماہرین خطاطی کا پرتپاک استقبال کیا۔ خطاطی فیسٹول کے تیسرے دور کے پروگرام کے پہلے دن خطاطی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ایران کے ساتھ ہندوستان کے تقریباً دس صوبوں کے خطاطی کے ماہرین نے حصہ لیا اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ نمائش کا اہتمام ایران کلچر ہاؤس میں واقع ایک وسیع ہال میں کیا گیا جس میں تمام شرکا کی نایاب تخلیقات کے نمونے پیش کیے گئے۔ نمائش میں بڑی تعداد میں شائقین نے شرکت کی۔ فریدالدین فرید عصر نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے خطاط یہاں پر جمع ہوں اور اپنے فن کا مظاہرہ کریں، ایران کلچر ہاؤس ان خطاطوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ہمیشہ کھڑا ملے گا۔ انجمن خطاطان ہند کے جنرل سکریٹری قاری یاسین نے بتایا کہ کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر کی کاوشوں سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد مسابقہ عمل میں آیا ہے۔ نمائش کے دوسرے دن بھی بڑی تعداد میں طلبہ، اساتذہ اور ماہر خطاطوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر امتیازی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ اور شریک خطاطان ہند کو ایران کلچر ہاؤس کی جانب سے ایک پروقار تقریب میں معززین کے ہاتھوں انعامات سے نوازا گیا۔ نظیر نویسی میں اول انعام غوث الدین عظیم حیدرآباد کو دیا گیا جب کہ دوم انعام عطاء اللہ مہاراشٹر کو دیا گیا۔ سورہ نویسی خط نسخ میں اول انعام شاذر احمد بریلی شریف کو دیا گیا جب کہ دوم انعام ایوب اکرم علی گڑھ کو دیا گیا۔ سورہ نویسی خط

نستعلیق میں اول انعام ظفر رضا خان ٹونک راجستھان نے حاصل کیا۔ اس مسابقہ میں ایران کے خطاط ڈاکٹر احسان پورنعمان نے کتبہ نویسی میں اپنے جوہر دکھائے جب کہ حیدرآباد کے خطاط غوث الدین عظیم نے بھی کتبہ نویسی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر سید فاروق، آیت اللہ مہدی مہدوی پور نمائندہ ولی فقیہ نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے جج کے طور پر ماہر فن ڈاکٹر احسان پورنعمان (ایران) اور خطاط مختار احمد (بنگلور) نے فرائض انجام دیے۔ پروگرام کی نظامت انجمن خطاطان ہند کے جنرل سکریٹری قاری یسٰین نے کی۔ مسابقہ میں شرکت کرنے والے خطاط شاذ احمد (بریلی)، محمد غوث الدین حیدرآباد، محمد تسلیم انصاری جھارکھنڈ، سید ابوحیدر زیدی دہلی، سید مصطفیٰ غازی آباد، شمیم احمد دہلی، محمد یوسف دہلی، محمد فخرالدین جعفری بریلی، حیدرانس دہلی، عبدالرحمٰن دہلی، زبیر احمد دہلی، میثم علی کشمیر، ظفر رضا خان ٹونک راجستھان، انصاری امتیاز مہاراشٹر، عطاء اللہ خان اسدی مہاراشٹر، خورشید عالم ٹونک راجستھان، محمد یوسف دیوبند، عباد احمد دہلی، نصرالدین دہلی، عرفان احمد دہلی اور محمد ہارون دہلی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 دسمبر 2023

اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے

نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام سالانہ غالب یادگاری خطبہ بعنوان 'اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے' کا انعقاد کیا گیا، اس یادگاری خطبے کے مقرر بھوپندر عزیز

پریہار، سابق صدر شعبہ انگریزی، گورنمنٹ کالج، لدھیانہ اور ایڈیٹر اردو لائیو تھے، پروگرام کی صدارت پروفیسر تمثے بھٹاچاریہ، صدر شعبہ لسانیات، دہلی یونیورسٹی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر رویندر کمار، ڈین کلچر کونسل، دہلی یونیورسٹی شریک ہوئے۔

شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے سالانہ غالب یادگاری خطبے کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور پنجابی دو بہنیں ہیں، بیشتر ہندوستانی زبانوں کا آپسی رشتہ بہت اہم ہے، ہم زبانوں کے آپسی اور لسانی رشتے پڑھتے تو ہیں، لیکن اس پر بہت زیادہ غور نہیں کرتے، اسی کے پیش نظر اس خصوصی یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا ہے، تاکہ اردو اور پنجابی کے رشتوں پر بات کی جا سکے۔ اس لکچر کا مقصد نہ صرف لسانی رشتوں کو جاننا ہے بلکہ ان صاحبان علم سے واقف ہونا بھی ہے، جو لسانیات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سالانہ غالب یادگاری خطبے کے مقرر بھوپندر عزیز پریہار نے کہا کہ اردو و پنجابی کے لسانی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اور پنجابی دونوں زبانیں لسانی طور پر بہت قریب ہیں، حالاں کہ دونوں کا رسم الخط مختلف ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم اردو کا تعلق پنجابی سے ہے، اردو اور پنجابی کی صرف ونحو کا تعلق بھی انتہائی قریبی ہے، پنجابی پر عربی اور فارسی زبانوں کے خاصے مثبت اثرات پڑے۔ صرف ونحو کے ساتھ معنی خیزی کی سطح پر بھی دونوں بہت حد تک قریب ہے، صوتی آہنگ کے معاملے میں پنجابی اردو کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پنجابی میں تلفظ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، جب کہ اردو میں تلفظ کا بہت خیال رکھا جاتا ہے، اسی طرح پنجابی میں جمع الجمع کا استعمال نہیں ہوتا، نیز حروف کے نیچے نقطہ دینے کا رواج بھی پنجابی میں نہیں ہے، نقطے وہی لوگ ڈالتے ہیں، جو اردو سے واقف ہوتے ہیں۔ معاصر پنجابی نثر عربی و فارسی کے اثرات سے عاری ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اردو و پنجابی کے شعری سرمایے سے بہت سی مثالیں بھی پیش کیں۔

مہمان خصوصی پروفیسر رویندر کمار نے اس پروگرام کے انعقاد پر شعبۂ اردو کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کے آپسی لسانی رشتے ہمیشہ سے رہے ہیں مگر ان پر کھل کر بات نہیں ہوتی۔ شعبۂ اردو نے ملنے ملانے کے رواج کو آگے بڑھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

غالب یادگاری خطبے کے صدر پروفیسر تمثے بھٹاچاریہ نے کہا کہ یونیورسٹی میں بین المطالعاتی کورسز کا مقصد گم ہوگیا ہے، حالاں کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لیے مختلف زبانوں کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔ زبانوں کے آپسی رشتوں پر گفتگو کے لیے خصوصی لکچرز کا آغاز خوش آئند ہے۔

پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے مقرر اور صدر جلسہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے موضوعات پر اس نوعیت کے پروگرام کا انعقاد وقت کی ضرورت ہے، اس پروگرام سے طلبا و طالبات کو مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ پروگرام کے آخر میں اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے ادا کی۔

قندیل ڈاٹ کام، 6 دسمبر 2023

غالب کی خطوط نویسی

نئی دہلی: گزشتہ روز غالب اکیڈمی میں مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول نے غالب کے

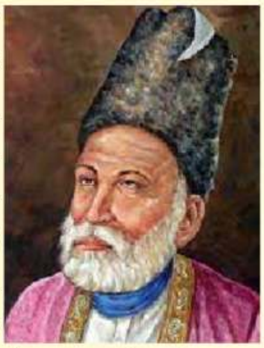

خطوط پر ایک پرمغز خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے اپنے خطوط میں سادہ اور بے تکلف زبان کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور خط و کتابت کو ملاقات کا بدل بنا دیا۔ انھوں نے اردو خطوط کے طرز تخاطب کو تبدیل کر دیا اور بڑے بڑے القاب و آداب کو مختصر کر دیا اور اردو نثر نگاری میں نئی روح پھونک دی۔ غالب کے خطوط میں غالب کے ساتھ ان کا تمام عہد سانس لیتا نظر آتا ہے۔ فکر و فلسفہ، شعر و نثر، تاریخ و تہذیب، ثقافت و سیاست، شاہ و گدا، عوام و خواص شاگرد و احباب اور ان کے متعلقات غرض زندگی اپنے غیر معمولی تنوع کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب نے مشکل زندگی گزاری ہے۔ غالب کے خطوط اور دستنبو میں دہلی کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ غالب نے اپنے خطوط میں زندگی سے متعلق ساری باتیں لکھی ہیں۔ غالب نے بتایا کہ خط کیسے لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے خط کے اسلوب کو بدل دیا۔ غالب نے خط میں صرف اپنے بارے میں نہیں بلکہ اوروں کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر

عقیل احمد نے کہا کہ غالب خوش قسمت ہیں کہ الطاف حسین حالی جیسا قدردان ملا۔ حالی نے یادگار غالب لکھ کر غالب فہمی کی بنیاد ڈالی۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو الہامی کتاب کہہ کر غالب کی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ غالب کے دیوان کے جب ترجمے ہوئے تو غالب کو عالمی سطح پر عظیم شاعر تسلیم کیا جانے لگا۔ لیکچر کے بعد محفل کلام غالب میں غزلیں پیش کی گئیں۔ محفل کلام غالب کی نظامت کشفی شمائل نے کی۔ کمال احمد، سلیم احمد، سلامت علی نے طبلے، ہارمونیم اور سارنگی پر ساتھ دیا۔ اس موقعے پر اردو ڈپلومہ، عربی سرٹیفکٹ اور خطاطی کے طلبا کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں ادیب و شاعر اور عاشقین غالب موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 دسمبر 2023

پرتاپ سومونشی کے ڈرامے 'لوئی' پر مذاکرہ

نئی دهلی: برصغیر کی پوری تاریخ میں لوئی جیسا کردار

موجود نہیں ہے، لوئی کا کردار مشرقی خاتون کے تمام اوصاف کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف اردو محقق و شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پرتاپ سومونشی کے ڈرامے 'لوئی' پر منعقد مذاکرے میں کیا۔ پروگرام کا انعقاد تسمیہ آڈیٹوریم، بٹلہ ہاؤس میں کیا گیا جس کی صدارت آئیڈیا کمیونی کیشنز کے نائب صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ معروف اردو اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی مہمان خصوصی اور سینئر صحافی تحسین منور مہمان اعزازی کے روپ میں شریک ہوئے۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کلیدی خطبہ دیا اور معروف اردو صحافی سہیل انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں آئیڈیا کمیونی کیشنز کے ڈائریکٹر آصف اعظمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مقرر خصوصی کے روپ میں خطاب کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ کبیر بلا تفریق مذہب سبھی قسم کے پاکھنڈ کے خلاف ہیں۔ لوئی جیسی خواتین ہمارے سماج میں سدبدھی پیدا کرسکتی ہیں جس سے بہتر سماج کی تعمیر ممکن ہے۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ لوئی نسائی قوت کا استعارہ ہے، صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے آج بھی ایسے کرداروں کی ضرورت ہے۔ تحسین منور نے کہا کہ دنیا کی کوئی بھی خوبصورت تصویر عورت کے بغیر ممکن نہیں، کبیر کو مہان بنانے میں لوئی کا مرکزی کردار ہے۔ ایسے کردار سے متعارف کرانے کے لیے ہمیں پرتاپ سومونشی کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ پرتاپ سومونشی نے اپنے خطاب میں کہا کہ لوئی کا کردار کبیر کو قوت عطا کرتا ہے، لوئی کے بغیر کبیر بننا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس عظیم خاتون کا تعارف کرانا ضروری تھا۔ پروگرام میں 'لوئی' ڈرامے کے اردو مترجم ایڈوکیٹ عبدالرحمٰن، پرتاپ سومونشی کی اہلیہ پرتیما سومونشی، سندیپ جوشی، پروفیسر حبیب اللہ خان، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، ڈاکٹر سلمان فیصل، ڈاکٹر شہنواز فیاض، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ارشاد عالم اصلاحی وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 دسمبر 2023

نظیر اکبرآبادی کے گاؤں کی تلاش

نئی دهلی: نظیر کا گاؤں مغائرت اور بیگانگی کا نہیں، یگانگت اور ہم آہنگی کا استعارہ ہے۔ یہ بات یہاں 'نظیر

اکبرآبادی کے گاؤں کی تلاش' کے موضوع پر مجددآئی او ایس سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کی مجلس گفتگو میں معروف مصنف حقانی القاسمی نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ نظیر کی شاعری دیہی فطرت اور جمالیات کا نگارخانہ ہے۔ انھوں نے اس متھرا میں معلّمی کی تھی جو دیہی ثقافت کا اسطور ہے۔ بھارت کی آتما جس گاؤں میں زندہ ہے وہ گاؤں نظیر کا ہے جب کہ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے مولانا رومی کے فلسفہ وصل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کا گاؤں وصل کی دنیا ہے فصل کی دنیا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ثقافتی تنوع کو درپیش چنوتیوں کے خلاف اگر آج ہم کچھ کرسکے تو یہی اصل کام ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دلیپ کمار شاکیہ نے کہا کہ نظیر کی شاعری کمپوزٹ کلچر کی اوپن آرٹ گیلری ہے۔ ان کی شاعری بیانیہ شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ اپنے زمانے میں وہی تھے جو یہ کہہ سکتے تھے کہ عاشق تو قلندر ہے ہندو نہ مسلماں۔ سورداس نے بھی کرشن بھکتی کی شاعری کی ہے اور نظیر نے بھی اپنی نظموں میں کرشن کو موضوع بنایا ہے لیکن سورداس کے یہاں یوٹوپیا ہے جب کہ نظیر کے یہاں یہ فطری اظہار ہے، یوٹوپیا نہیں ہے۔ ان کا اتنا بڑا لینس ہے جتنا بڑا کسی اور کا نہیں۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ نظیر اور میر ہم عصر ہیں لیکن نظیر کو اہل اردو نے نظرانداز کیا۔ انھوں نے کہا کہ نظیر کی نظم 'مہادیو جی کا بیاہ' اردو شاعری کی تاریخ میں بھی اہم ہے اور ہندی شاعری کی تاریخ میں بھی اسے ریکھانکت کرنا چاہیے۔ جب کہ خورشید حیات نے کہا کہ بندہ نواز گیسودراز کی نظم چکی نامہ سے نظیر اکبرآبادی کی نظموں اور آج کی شاعری تک ایک تسلسل ہے، اس خوشبو کا جو ماٹی کی مہک سے لبریز ہے اور خوشبو کسی لکیر کو نہیں مانتی۔ انھوں نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کی عظمت یہ ہے کہ وہ کسی درباری راگ کا حصہ نہیں ہیں۔ اس سے قبل موضوع پر اپنے تعارفی کلمات میں مجددآئی او ایس سینٹر کے کنوینر انجم نعیم نے کہا کہ نظیر کی نظمیں اپنے معاشرے کے طبعی جغرافیے اور عام لوگوں کے معاشرتی و ثقافتی رویے کی تصویر بناتی ہیں۔ نظیر نے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے تہواروں اور ان کی روزانہ کی زندگیوں کے وطیروں کو نہایت باریک بینی سے برتا ہے۔ اختتام کنوینر کے کلمات تشکر پر ہوا۔

قندیل ڈاٹ کام، 31 دسمبر 2023

عربی زبان کا عالمی دن

نئی دھلی: عربی زبان ایک خوبصورت عالمی زبان ہے، اس زبان کی خوبیوں اور اس کے ادبی ذخیروں نے ہر دور میں دنیا کے دانشوروں کو اپنی طرف کھینچا ہے، شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کی جانب سے ورلڈ عربک ڈے کی مناسبت سے منعقد اس اہم پروگرام میں شریک ہوکر اور اس کے طلبا و طالبات کی پیشکش کو دیکھ کر یہ یقین ہوا کہ شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے طلبا عرب ممالک میں ہندوستان کے سفیر ہیں، ان خیالات کا اظہار شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کی جانب سے منعقد ورلڈ عربک ڈے مسابقاتی پروگرام کے موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر وکاس گپتا نے کیا۔ پروگرام میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے سینئر استاذ پروفیسر حبیب اللہ خان نے دورِ حاضر میں عربی زبان کی اہمیت ومعنویت کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ زبان کا تعلق (ریجن) علاقہ سے ہوتا ہے نہ کہ (ریلیجن) مذہب سے، انھوں نے عربی سیکھنے والے طلبا و طالبات سے کہا کہ وہ اپنی فکر کو وسعت دیں اور نئے ہندوستان کی ترقی میں اپنی حصے داری کو یقینی بنائیں۔ مہمان اعزازی پروفیسر نرنجن کمار ڈین پلاننگ دہلی یونیورسٹی نے عربی زبان اور اس کی قدیم تہذیب کا خاکہ پیش کرتے ہوئے عربی میں اور عربی سے ترجمہ کی اہمیت پر زور دیا۔ دوسرے مہمان اعزازی پروفیسر ایتابھ چکرورتی ڈین فیکلٹی آرٹس نے عربی زبان کی مقبولیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن کا پہلا بنگالی ترجمہ دوسرے مذہب کے ماننے والے ایک اسکالر نے کیا، انھوں نے شعبہ عربی کی سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کا نمایاں شعبہ قرار دیا۔ آج کے پروگرام کے صدر اور دہلی یونیورسٹی کے رابطہ عامہ کے چیئرپرسن پروفیسر چندر شیکھر نے شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کی کامیابیوں کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ شعبہ یونیورسٹی کے سب سے قدیم شعبوں میں سے ایک ہے اور یونیورسٹی میں پہلی ایس پی ایچ ڈی اسی شعبہ میں مکمل ہوئی جسے وائیوا سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس سے قبل صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے شعبے میں پلیسمنٹ کی شرح نوے فیصد سے زیادہ ہے اور ہماری کوشش ہے کہ طلبا کی علمی سرگرمیوں کو زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جائے جس کا ایک بہترین نمونہ آج کا یہ مسابقاتی پروگرام ہے جو شعبہ کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے کی جب کہ پروفیسر نعیم الحسن سابق صدر شعبہ نے شکریے کے رسم ادا کی۔ غور طلب ہے کہ شعبہ نے عربی ڈبیٹ، عربی سونگ اور عربی خطاطی کے عناوین سے مسابقاتی پروگرام منعقد کرائے جن میں شعبے کے سرٹیفکٹ، ڈپلومہ، ایڈوانس ڈپلومہ اور ایم اے کے تقریباً پچاس بچوں نے شرکت کی اور شعبہ کے استاذ پروفیسر نعیم الحسن، ڈاکٹر محمد اکرم اور سینٹر فار عربک جے این یو کی استاذ ڈاکٹر زرنگار پر مشتمل حکم کمیٹی کے ذریعے اول، دوم اور سوم پوزیشن قرار دیے جانے والے طلبا و طالبات کو انعامات وسرٹیفکٹ سے نوازا گیا۔ مسابقاتی پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اصغر محمود نے کی اور صدارت پروفیسر سید حسنین اختر نے فرمائی۔ پروگرام میں ریسرچ اسکالر محمد نوشاد نوری کی تصنیف 'فقہ الدعوہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 دسمبر 2023

اردو زبان وادب کی تدریس اور جدید تعلیمی نظام

نئی دھلی: جدید تعلیمی نظام سے مراد ایسی تعلیم وتربیت ہے جو طالب علموں کی شخصیت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ کو درسگاہ سے باہر کی دنیا یعنی ہم نصابی سرگرمیوں میں شامل ہونے

کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ جدید تعلیمی نظام کے حوالے سے ہم اردو زبان وادب کے متون اور اردو کے ثقافتی پہلوؤں سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سارہ بیگم، ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ بہ اشتراک اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ یک روزہ قومی سمینار بعنوان: 'اردو زبان وادب کی تدریس اور جدید تعلیمی نظام' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ افتتاحی تقریر سے قبل اکادمی کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے تمام مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے خیر مقدمی کلمات میں ایسے اہم موضوع پر سمیناروں کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی تدریس کو بہتر بنانے کے لیے تربیتی باریکیوں سے واقف ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا ادب اور تعلیم کے ماہرین کی یکجائی یقیناً تعلیم وتدریس میں بہتری کی راہیں ہموار کرے گی۔ پہلے اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر سارہ بیگم اور پروفیسر خالد جاوید نے انجام دیے۔ اور نظامت سمینار کے کنوینر ڈاکٹر واحد نظیر نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سجاد احمد، ڈاکٹر ارشد انصاری، ڈاکٹر حنا آفریں، محترمہ عائشہ رحمان، ڈاکٹر سلمان فیصل اور جناب اقبال حسین نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر خالد جاوید نے اپنی صدارتی گفتگو میں مختلف ماہرینِ تعلیم کے حوالے سے مادری زبان کی اہمیت پر خصوصی روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اخلاقیات، فطرت، ذہانت اور کردار ایسے پہلو ہیں جو ہر دور میں تعلیم وتربیت کا حصہ رہے ہیں۔ محترمہ پروفیسر سارہ بیگم نے تمام مقالوں پر اجمالاً گفتگو کی اور مقالہ نگاروں کے ساتھ اکادمی کی بھی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ایسے اہم موضوعات پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر اعجاز مسیح اور پروفیسر کوثر مظہری نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر معید الرحمٰن (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، ڈاکٹر راحت حیات (نوح، ہریانہ)، ڈاکٹر علام الدین، ڈاکٹر عبداللہ منیر العالم نے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نوشاد عالم نے انجام دیے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ تدریسی پیشے میں رسمی تربیت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے درسی کتابوں کے متون کے انتخاب میں ماہرین اور اساتذہ کی شرکت کے ساتھ ساتھ متعلقہ درجے کے منتخب طلبہ کی شمولیت کا بھی مشورہ دیا تا کہ طلبہ کی دلچسپی اور ذہنی ہم آہنگی ملحوظ رہ سکے۔ پروفیسر اعجاز مسیح نے اجلاس میں پیش کیے گئے مقالات پر اجمالی گفتگو کرتے ہوئے تمام مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ اچھے مقالات کی خوبی یہ ہے کہ ان میں مقالہ نگار کی ذاتی رائے بھی شامل ہو محض کتابوں سے لی گئی معلومات کا مجموعہ نہ ہو۔

سمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر وسیم احمد اور پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ محترمہ ڈاکٹر زرینہ زریں، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی بحیثیت مہمان اعزازی شریک ہوئیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر علی حیدر، ڈاکٹر محمد عرفان احمد، جناب سیف الرحمٰن، جناب امتیاز احمد اور محترمہ ثمرین شمسی نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی نے نظامت کا فریضہ انجام دیا۔

پروفیسر وسیم احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کلاس روم میں استاد کی حیثیت مثالی ہوتی ہے۔طلبہ پر شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے استاد کی گفتگو، طور طریقے اور نشست و برخاست کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا استاد کو اسباق کی تیاری کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کے تئیں بھی حساس ہونا چاہیے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام مقالوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے سمینار کے تینوں اجلاس کے صدور، مہمانان، مقالہ نگار حضرات اور سامعین کے تئیں جذبۂ امتنان کا اظہار کیا۔اور مستقبل میں ایسی سرگرمیوں کا خاکہ بھی پیش کیا جو زبان و ادب کی تدریس اور اساتذہ کی تربیت میں معاون ہوتی ہیں۔اخیر میں محترمہ ڈاکٹر حنا آفریں نے شکریے کی رسم ادا کی اور سمینار کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 23 دسمبر 2023

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'اسمتا' پروگرام

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام خواتین پر مشتمل 'اسمتا' پروگرام کا انعقاد رویندر بھون آڈیٹوریم، منڈی

ہاؤس میں کیا گیا جس میں اردو کی صف اول کی تین خواتین افسانہ نگاروں نگار عظیم، نعیمہ جعفری پاشا اور نشاں زیدی نے اپنے افسانے پیش کیے۔ پروگرام کے آغاز میں اکادمی کے ایڈیٹر انوپم تیواری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کا تعارف پیش کیا۔نگار عظیم نے 'بڑے آدمی کی کہانی' کے عنوان سے بہترین افسانہ پیش کیا جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مفلسی انسان کو حالات کے آگے کیسے مجبور کر دیتی ہے۔ نعیمہ جعفری پاشا نے 'کرائے کی کوکھ' میں پیسے کی خاطر ایک غریب عورت اپنے کوکھ کا سودا کرنے پر کیسے مجبور ہو جاتی ہے، اسے نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔نشاں زیدی نے 'زندگی کے رنگ' کے عنوان سے کہانی پیش کی، جس میں زندگی کے مختلف رنگ جیسے بیوی کی محبت، شوہر کی بے اعتنائی، تنہائی کا کرب، جدائی کا درد، اولڈ ایج ہوم وغیرہ کو کہانی کا پیکر عطا کیا ہے۔ اس موقعے پر اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب چندر بھان خیال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انسانی معاشرے کی پیشوائی کا پرچم خواتین کے ہاتھوں میں ہے۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ بچہ ماں سے سیکھنا شروع کرتا ہے، سنسکار اس کو ماں سے ہی ملتی ہے۔ زبان، شعر و ادب اور تہذیب کے فروغ میں خواتین کا کلیدی رول ہے۔ اردو مشاورتی بورڈ کے رکن ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے تینوں افسانوں پر اپنی رائے رکھی۔ انھوں نے کہا کہ آج پڑھے گئے تینوں افسانے اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتے تھے جن میں عورتوں کے ناگفتہ بہ حالاتِ زندگی کو تخلیقی روپ دیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں بڑی تعداد میں دلی کے ادبا شعرا طلبا اور مندوبین موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 دسمبر 2023

عربی زبان کا عالمی دن

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے زیر اہتمام اور عرب لیگ مشن نئی دہلی کے اشتراک سے عربی زبان کے عالمی دن کے موقعے پر ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں عرب لیگ مشن، الجزائر، لبنان اور لیبیا کے سفرا اور نمائندوں نے شرکت کی، صدارت فیکلٹی آف ہیومنیٹیز کے ڈین پروفیسر محمد اسحاق نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے عرب لیگ مشن نئی دہلی کے سفیر یوسف محمد جمیل نے شرکت کی۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر نسیم اختر ندوی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے لبنان، عرب لیگ اور الجزائر کے سفرا، نمائندوں اور مہمانان کو خوش آمدید کہا۔ شعبۂ عربی کے طلبہ کی انجمن النادی کے زیر اہتمام عربی زبان کے عالمی دن کے موقعے پر منعقد ہونے والے بعض مسابقات میں انعام حاصل کرنے والے طلبہ نے عربی تقریر اور عربی تمثیلی مشاعرہ پیش کیا۔ یوسف محمد جمیل نے اپنے خطاب میں عربی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ الجزائر سفارت خانہ کے سفیر ڈاکٹر علی عشوی نے کہا ہم عربی زبان کی محبت میں ایک ساتھ جمع ہوئے ہیں۔ لبنان کے سفیر ڈاکٹر ربیع نرش نے کہا کہ جامعہ ملیہ میرے لیے گھر کی مانند ہے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر محمد اسحاق نے اپنے صدارتی خطاب میں تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا دن عربی زبان کے لیے تاریخی دن ہے، یہ عربی زبان و کلچر کی ترویج کا دن ہے۔ انھوں نے عربی زبان کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ شعبۂ عربی کی استاذ ڈاکٹر ہیفا شاکری نے اساتذہ، مہمانوں اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن نے انجام دی، جب کہ محمد ریحان اور محمد اصحاب نے صدر مجلس اور مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا اس پروگرام میں شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کے علاوہ شعبہ کے ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2023

اتر پردیش

سوشل میڈیا، افادیت اور نقصانات

میرٹھ: انسان کی انسانیت اور حیوانیت ادب میں بھی ملتی ہے اور سوشل میڈیا میں بھی ملتی ہے۔ یہ الفاظ تھے عارف نقوی جرمنی کے جو شعبۂ اردو میں ادب نما کے تحت 100 ویں پروگرام بعنوان 'سوشل میڈیا: افادیت اور نقصانات' پر اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ اس پروگرام کی سرپرستی معروف فکشن نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مقررین کے بطور پروفیسر جمال احمد صدیقی (صدر شعبۂ لائبریری سائنس)، پروفیسر عابد حسین حیدری (صدر شعبۂ اردو، ایم جی ایم کالج، سنبھل)، پروفیسر پرشانت کمار (صدر، ماس کمیونیکیشن، سی سی ایس یو)، ڈاکٹر ودیا ساگر (شعبۂ ہندی، ڈاکٹر ریاض انور (ایم جی ایم کالج، سنبھل) اور لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے آن لائن شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ریسرچ اسکالر عظمیٰ سحر، نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم سیدہ مریم الٰہی نے انجام دی۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ سوشل میڈیا نے دور دراز کے لوگوں، رشتہ داروں، عزیزوں کے ساتھ گفتگو کا ایک پلیٹ فارم فراہم کیا ہے۔ اس نے تعلیم کے میدان میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوشل میڈیا کا استعمال غلط نہیں مگر اس کے استعمال میں احتیاط ضروری ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اس میں شبہ نہیں کہ آج کا دور سوشل میڈیا کا دور ہے۔ اس سے جہاں بے شمار فوائد ہو رہے ہیں وہیں یہ نقصانات کا باعث بھی بن رہا ہے اور بہت سے رشتوں میں بھی اس کے سبب دراڑ آرہی ہے۔ آج بہت سے افراد گھروں میں ایک جگہ رہنے کے باوجود بھی تنہا ہوتے ہیں۔ بیوی الگ موبائل پر، شوہر الگ اور دیگر افراد الگ الگ موبائل پر لگے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں سوشل میڈیا کے غلط استعمال سے خود کو بھی اور اپنی نسل کو بھی روکنا ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض انور نے کہا کہ سماج کے اندر آج بہت سی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور سوشل میڈیا کا غلط استعمال کر کے نئی نسل گمراہ ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا کا مثبت استعمال کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کہا کہ سوشل میڈیا نے لوگوں کو جوڑنے کا حیرت انگیز کام

کیا ہے۔ سائنسی تعلیم اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اس کا اہم رول رہا ہے۔ دنیا بھر کی معلومات ہم کو سوشل میڈیا سے ملتی ہے۔ ڈاکٹر ودیا ساگر نے کہا کہ آج سماج میں جس طرح سے ایک دوسرے کی بے عزتی کی جارہی ہے، جھوٹ ہر طرف پھیل رہا ہے تو یہ سب سوشل میڈیا کی دین ہے۔ ہمیں سوشل میڈیا پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنا ہوگا۔ پروفیسر پرشانت کمار نے کہا کہ آج سوشل میڈیا نے انسان کو بدل دیا ہے۔ پچھلے دس سال میں سوشل میڈیا نے بڑے بڑے کام کیے ہیں، آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ روزانہ سماج کے حالات بدل رہے ہیں تو ان حالات کو پیدا کرنے میں سوشل میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ پروفیسر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ سوشل میڈیا کے بہت سے ایسے لرننگ پلیٹ فارم بھی ہیں جن سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ممبئی سے اسلم پرویز نے کہا کہ سوشل میڈیا کو زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم سوشل میڈیا سے کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کیا کریں کہ ہمیں کم سے کم نقصان ہو۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ کورونا کے وقت میں طالب علموں کو سوشل میڈیا سے جڑنا پڑا اور یہ اس وقت بہت ضروری بھی تھا۔ ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم سوشل میڈیا کا کتنا استعمال کریں اور ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر اکا وششٹھ، محمد شمشاد، فیضان ظفر، لائبہ اور دیگر طلبا وغیرہ آن لائن جڑے رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 دسمبر 2023

سندھی ادب کے اہم تخلیق کار

لکھنؤ: اپیکس اقرا فاؤنڈیشن نے سندھی اکیڈمی لکھنؤ کے تعاون سے حرا ہال، دبگہ لکھنؤ میں 'سندھی ادب کے اہم تخلیق کار' کے عنوان سے ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا۔ پروگرام کا انعقاد استقبالیہ گیت کے ساتھ کیا گیا جسے شیعہ کالج کی طالبہ غزالہ تبسم نے گایا اور مختلف اداروں کے اسکالرز نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ عذرا انجم نے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ 18 ویں صدی کے پہلے نصف کو سندھی شاعری کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں شاہ عنایت، شاہ لطیف مخدوم، محمد زماں، مخمورہ عبدالحسن پیر، شیخ ایاز، محمد بقا وغیرہ بڑے ادیب تھے۔ ان ادیبوں نے شاعری میں نئے دوہے، نئی اصناف اور فلسفیانہ خیالات متعارف کروائے ہیں۔ ان شاعروں کی نظموں میں ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کو متعارف کرایا گیا ہے۔ عفت قریشی نے سچل سرمست، غزالہ تبسم نے ہیتو چندر مول چندر گروبخشانی پر اور اقرا فاطمہ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تخلیقات پر روشنی ڈالی۔ زینب فاطمہ نے اپنی میٹھی آواز میں گیت پیش کیا۔ سمینار کی صدارت کررہے تنظیم کے صدر ڈاکٹر احسان حیدر زیدی نے سندھی زبان وادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ مہمان خصوصی شاہین زیدی نے سندھی ادب پر روشنی ڈالی دیگر مہمانان خصوصی ڈاکٹر محمد مصطفیٰ صدیقی اور ڈاکٹر زرینہ انجم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ سندھی ادب میں ہندوستانی ثقافت پوری طرح جھلکتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 دسمبر 2023

غالب سمینار

فیروز آباد: مرزا غالب کے یوم پیدائش کے موقعے پر غالب ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام 'یوم غالب' کے نام سے ایک تقریب الہدیٰ ماڈل اسکول میں منعقد کی گئی، جس میں ایک طرف جہاں ادیبوں نے پہلے دور میں اپنے مقالوں کے ذریعے غالب کی یاد کو تازہ کیا، تو وہیں تقریب کے دوسرے دور میں شعرا نے انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت سماجی کارکن اور غزل گو شاعر صغیر احمد نے کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی ممتاز شاعر وارث رفیع بدایونی نے غالب کے اشعار کے دوہرے معنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے کسی شعر کا سیدھا سا مطلب ہم جو اخذ کرتے ہیں اگر ہم اس کو دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اس کے معنی پوری طرح تبدیل ہوجاتے ہیں۔ صدارت کررہے سابق کینرا بینک منیجر صغیر احمد نے غالب کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی، انھوں نے بتایا کہ غالب کے خطوط میں نثر کے تمام کمالات موجود ہیں، اس میں مزاح بھی پوری طرح سمایا ہوا ہے۔ اردو مدرس افضال احمد نے اپنے مقالے میں سلسلے وار مع تاریخوں کے غالب کی مکمل حیات سامعین کے سامنے رکھی۔ کامنی اردو مرکز کے صدر میاں بصارالدین احمد نے اپنے مقالے میں بتایا کہ غالب نے اپنی سوانح حیات تو نہیں لکھی، لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے ایک ایک پہلو کو اس طرح عیاں کیا ہے کہ اگر اس کو یکجا کردیا جائے تو غالب کی مکمل سوانح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ممتاز شاعر ذاکر شمسی نے کہا کہ غالب کے حساس دل نے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو دیکھا اور اس کا درد محسوس کیا۔ انسانی جذبات، اس کی محرومیاں، اس کا درد ان تمام موضوعات کو غالب نے اپنی شاعری میں سمیٹ لیا اور اس طرح پیش کیا کہ ہر شخص کو غالب کی بات اپنی ہی بات لگتی ہے۔ تقریب کے دوسرے دور میں شعرا نے اپنے کلام سے غالب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2023

ایک شام احباب ادب کے نام

لکھنؤ: اردو فکشن پریم چند کے افسانہ کفن اور ناول گئودان سے کافی آگے نکل چکا ہے۔ اس خیال کا اظہار معروف ادیب اور شاعر ڈاکٹر ہارون رشید نے کیا۔ وہ سلیم جن کلیان ایجوکیشنل سمیتی کے زیراہتمام ڈاکٹر جہاں آرا سلیم کی رہائش گاہ (خالہ بازار) پر 'ایک شام احباب ادب کے نام' عنوان کے تحت ہونے والی علمی و ادبی نشست میں بطور مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے معاصر ناول پر گفتگو کرتے ہوئے انیس اشفاق کے ناول 'خواب سراب'، خالد جاوید کے ناول 'نعمت خانہ' اور محسن خان کے ناول 'اللہ میاں کا کارخانہ' کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور کہا یہ تینوں ناول اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'خواب سراب' پرشکوہ اسلوب میں مابعد جدید تکنیک کا حسین امتزاج ہے۔ 'اللہ میاں کا کارخانہ' ایسا ناول ہے جس نے اوسط اور درمیانی سطح کے قاری کو بھی فکشن کی جانب راغب کیا اور فکشن کے قارئین میں ایک خوشگوار اضافہ کرنے کا سبب بنا، جب کہ 'نعمت خانہ' اس خوف، بیماری اور ناکامی کے شعور سے لتھڑا ہوا ہے جس کے پنجے انسانی فطرت کے اندر موجود شر میں پیوست ہیں۔ مسندِ صدارت پر خانقاہ شاہ عبدالرحمٰن کے سجادہ نشیں صوفی سید اظہار علی متمکن ہوئے اور نظامت کا فریضہ شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ مہمانان خصوصی کے طور پر سہ ماہی ادبی نشیمن کے ایڈیٹر سلیم احمد اور ڈاکٹر ہارون رشید شریک محفل رہے۔ اس موقعے پر افسانہ نگاروں میں مینا عرفان، سلیم احمد، ڈاکٹر جہاں آرا سلیم اور محسن عظیم نے بالترتیب 'آٹا ساٹا' آخری نشانی، کلو بھائی کباب والا اور 'اس کی چائے' عنوان سے اپنے افسانے پیش کیے، پروگرام کا دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹر ہارون رشید، شکیل گیاوی، عرفان لکھنوی، صغیر نوری بارہ بنکوی، تاج لکھنوی، سلیم تابش، شمس العارفین وقار کاشف، قمر سیتا پوری اور محمد علی علوی نے اپنی رباعیات، قطعات اور غزلوں سے سامعین کو مسحور کیا۔ پروگرام کے اختتام پر صدر تقریب صوفی سید اظہار علی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جب ایک ہی نشست

میں شعری وافسانوی فن پاروں کو سننے کا موقع ملے۔ انھوں نے کہا کہ ادب ہماری زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ ادب کی مختلف اصناف میں افسانہ نگاری ایک دلچسپ صنف ہے۔ آج کی محفل میں جو افسانے پیش کیے گئے ان میں عصری تقاضوں کے ساتھ نئی جہتوں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں میزبان ڈاکٹر جہاں آرا سلیم نے جملہ مہمانوں شعرا، افسانہ نگاروں اور سامعین کے تئیں کلمات تشکر ادا کیے۔

روز نامہ 'اودھ نامہ' دہلی، 17 ستمبر 2023

اردو زبان وادب

وارانسی: شہر کے مشہور معروف کالج مہاراج بلونت سنگھ پی جی کالج گنگاپور وارانسی کے شعبۂ اردو کی جانب سے بانی کالج ڈاکٹر وبھوتی نرائن سنگھ کی یاد میں مورخہ 20 دسمبر 2023 بروز بدھ 'اردو زبان وادب' کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ شعبۂ اردو کی طرف سے منعقد اس خصوصی لکچر کا مقصد اردو زبان وادب کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کو اجاگر کرنا تھا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ناقد ومترجم ڈاکٹر مشرف علی شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی نے شرکت کی جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر احسان احسن شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی تشریف لائے۔ تعارفی کلمات کے بعد پروگرام کے کنوینر اور اردو کے استاذ ڈاکٹر محمد ارشد نے کالج کی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد نیز شعبۂ اردو کے قیام اور اس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ مہمان اعزازی نے اس موضوع پر خصوصی لکچر کا اہتمام کرنے کے لیے اراکین کالج کو مبارکباد دی۔ انھوں نے اردو زبان کے رسم الخط، اس کے تلفظ کی افادیت اور لفظ کی ادائیگی کی اہمیت سے واقف کرایا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر مشرف علی نے اردو زبان کی اہمیت وضرورت پر بھرپور روشنی ڈالی، سماج، معاشرے اور انسانی زندگی میں زبان کیا کردار دا کرتی ہے، اس سے روبرو کرایا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے، بلکہ یہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاس ہے، تمدن و ثقافت کی آئینہ دار ہے، سماج اور معاشرہ کی ترجمان ہے، گنگا جمنی تہذیبی عکاس ہے، قومی یکجہتی کی علامت ہے، حب الوطنی کی مظہر ہے، ہندوستان کی تحریک آزادی کی علمبردار رہی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہم ایک دوسرے کی زبان کو نہیں جانیں گے، ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کا بھی خصوصی اہتمام کیا جائے۔ اس پروگرام کی صدارت ہندی شعبہ کی صدر اور کیمپس انچارج پروفیسر منجو مشرا نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ اردو اور ہندی میں دو سگی بہنوں کا رشتہ ہے۔ اظہار تشکر کی رسم پروفیسر آلوک کشیپ صدر شعبۂ سماجیات نے ادا کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر درگیش کمار پانڈے نے انجام دیے۔ اس پروگرام میں کالج کے جملہ اساتذہ، طلبہ وطالبات کے علاوہ قرب وجوار کے معزز حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ پروگرام کا اختتام راشٹرگان پر ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ (اردو)، مہاراج بلونت سنگھ، پی جی کالج گنگاپور، وارانسی، 1 جنوری 2023

بہار

جہان آباد میں فروغ اردو سمینار

جہان آباد: بلاشبہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اس کی پیدائش اور نشو ونما یہیں ہوئی ہے۔ اسے کسی مذہب سے جوڑنا اور غیر ملکی زبان کہنا اس شیریں زبان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار ضلع مجسٹریٹ رچی پانڈے نے اردو ڈائرکٹوریٹ بہار اور ضلع انتظامیہ کے مشترکہ تعاون سے عبدالباری ٹاؤن ہال جہان آباد میں فروغ اردو سمینار، ورکشاپ اور مشاعرہ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے تقریب کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم سب یہاں زبان اردو کے فروغ کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ حکومت بھی اردو کے فروغ کے لیے پیش قدمی کررہی ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب اس کے لیے اردو داں طبقہ بھی آگے آئے اور مشترکہ طور پر اس کے لیے کوششیں کی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف حکومت یا انتظامیہ کے سہارے کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔ اس موقعے پر محکمہ اقلیتی فلاح کے ضلع افسر اور انچارج افسر شعبہ اردو سیل راجیو رنجن نے پروگرام کے اغراض ومقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ یہ دو دلوں کو جوڑنے کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے فروغ اردو کے لیے محکمہ کے ذریعے کی جارہی کوششوں کے ساتھ ساتھ زبان اردو کے تئیں اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کوشش اردو کو اس کا صحیح مقام دلانا ہے۔ اس موقعے پر کتاب 'گلستان' کا اجرا بھی کیا گیا اور دانشوروں نے زبان اردو کے فروغ سے متعلق اپنے مشورے اور تجاویز کے توسط سے افسران کی توجہ اس سمت میں مبذول کرانے کی کوشش کی۔ سمینار کے باضابطہ اختتام سے قبل شرکا، شعرا اور مقالہ نگاروں کو سند واعزازی رقم سے بھی نوازا گیا۔ پروگرام کا باضابطہ افتتاح ڈی ایم رچی پانڈے، ایس ڈی ایم اوپناش کمار، ایس ڈی پی او اور ضلع اقلیتی فلاح و بہبود افسر نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے کیا۔ نظامت شکیل احمد کاکوی نے کی۔ پروگرام میں ڈاکٹر سیمی اقبال، لامیہ کمال اور محمد تمکین زہرا نے مقالے پیش کیے جب کہ بطور ڈیلی گیٹ زویا پروین، محمد عابد حسین اور التمش جہاں افروز موجود تھے۔ وہیں بطور شاعر ڈاکٹر انور حسین، محمد شاہ عزیر عالم ڈاکٹر شیر علی عکس، اعجاز مانپوری، لطیف شمسی، ڈاکٹر روی شنکر شرما، سدھاکر راجندر نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام میں کائنات انٹرنیشنل اسکول کاکو، جامعہ کائنات کاکو، فیضان محمدیہ اور جامعہ مفتاح العلوم کے طلبا وطالبات نے ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ انعام کے حقدار بنے طلبہ میں زیبا ناز، کہکشاں پروین، محمد منصور اختر، قیس بانو اور صوبیہ فاطمہ شامل ہیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 10 دسمبر 2023

غالب فکر وفن کے آئینے میں

پٹنہ: یومِ غالب کے موقعے پر 27 دسمبر کو گورنمنٹ اردو لائبریری کے کانفرنس ہال میں ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ 'غالب فکر وفن کے آئینے میں' کے عنوان سے منعقد اس سمینار میں دانشوروں نے غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ غالب کے تخلیقی مزاج اور معیار تک رسائی کی بہت ساری کوششیں کی گئیں مگر مکمل کلام غالب تک رسائی ہنوز باقی ہے۔ غالب بنیادی طور پر فکری وفلسفیانہ تصورات کے تخلیق کار ہیں۔ وہ کائنات کے مخفی حقائق کو طشت ازبام کرنا چاہتے ہیں اور اس مہم میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ارشد فیروز نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ انسان حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن شاعر کا احساس عام انسان کے احساس سے الگ ہوتا ہے۔ غالب نے خود اپنے کلام سے متعلق پیش گوئی کی تھی کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ان کی قدر بڑھے گی۔ اکبر رضا جمشید نے اردو لائبریری کے زیر اہتمام پہلی بار یوم غالب منائے جانے پر خوشی کا اظہار کیا اور غالب کے کئی مشہور اشعار پیش کیے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے کہا کہ اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ غالب اردو ادب میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے غالب کی شخصی انفرادیت کے حوالے سے کہا کہ غالب کی شخصیت بیک وقت جامع الصفات تھی۔ شاعر اور

فلسفی ہونے کے ساتھ روزمرہ کے معمولات کو ہموار زمین پر گامزن رکھنے کے لیے حق پسندی و راست گوئی، داد و تحسین وخودداری، فراخ دلی، وسعت خیال، عہد و پیماں اور خورد ونوش کے طور طریقے بھی انھیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ شرف الہدیٰ نے غالب کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے غالب شناسی پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی، جس میں ڈاکٹر نعیم صبا، نذر فاطمی، ریکھا بھارتی مشرا، ڈاکٹر نصر عالم نصر، نلانشو رنجن، عرفان بلہاروی، زینت شیخ اور نسیم اختر نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت پرویز عالم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2023

انسانی اقدار اور حسین الحق کا فکشن

گیا: مولانا انوار الحق اردو لائبریری، گیا بہار کے زیر اہتمام معروف فکشن نگار اور دائرہ شاہ حضرت وصی الحق کے سابق سجادہ نشین پروفیسر حسین الحق کے یوم وفات کی مناسبت سے ایک ویبینار بعنوان 'انسانی اقدار اور حسین الحق کا فکشن' کا انعقاد کیا گیا۔ آن لائن پروگرام میں متعدد اہم شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت مرزا غالب کالج، گیا بہار کے سابق صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر عین تابش نے کی جب کہ کلیدی خطبہ معروف ناقد اور افسانہ نگار پروفیسر صغیر افراہیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پیش کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر عبدالصمد نے حسین الحق کے حوالے سے گفتگو کی۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز حسین الحق کے بڑے صاحب زادے شاعر علی حق نے کیا جب کہ شافع انوار الحق نے پروفیسر حسین الحق کی شخصیت کے تعلق سے تعارفی کلمات پیش کیے۔ پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ حسین الحق ایک زندہ دل انسان تھے، وہ ہمارے اندر سے آج بھی ختم نہیں ہو سکے اور نہ کبھی ختم ہوں گے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ دراصل حسین الحق خانقاہی تھے، اور جو خانقاہی مزاج ہے وہاں کوئی تمیز و تخصیص نہیں ہوتی، نہ کسی مذہب کی، نہ ہی کسی مسلک کی، وہاں سب انسان برابر ہیں۔ حسین الحق کو سبھی پسند کرتے تھے، جس کی وجہ ان کا اخلاق تھا۔ پروفیسر عین تابش نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مقررین کی گفتگو نے مجموعی طور پر پروفیسر حسین الحق کی شخصیت کے کمالات کو بحیثیت فکشن گار، بحیثیت صوفی، بحیثیت نثر نگار اور بحیثیت انسان نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے تمام شرکا کا صمیم قلب سے شکریہ بھی ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سید عینین علی حق نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2023

پنجاب

اردو پنجابی ادب میں نشہ بندی کی ترغیب

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام دو روزہ اردو پنجابی قومی سمینار بعنوان 'اردو پنجابی ادب میں نشہ بندی کی ترغیب' کا انعقاد 19 دسمبر کو کیا گیا۔ سمینار کا مقصد پنجاب کے لوگوں بالخصوص نوجوان نسل میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی منشیات کی عادت کے خلاف اور نسل نو کو منشیات کے نقصانات کے تئیں بیدار کرنا اور معاشرے سے اس لعنت کو ختم کرنا تھا۔ منشیات کے بڑھتے رجحانات

کے خلاف اس دو روزہ قومی سمینار میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد جمیل الرحمٰن، وائس چیئرمین، پنجاب اردو اکیڈمی، صدارت کے لیے پروفیسر ناشر نقوی، کلیدی خطبہ کے لیے پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی، مہمان اعزازی کے طور محترمہ فریال رحمٰن اور سردار کلدیپ سنگھ، ڈی ایس پی، مالیرکوٹلہ شریک ہوئے۔ اس سمینار میں ملک کی نامور سات یونیورسٹیز اور مختلف کالجز کے پروفیسر صاحبان کے ساتھ ساتھ اساتذہ و ادبی تنظیموں کے رہنماؤں نے بطور مقالہ نگار شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر رنجودھ سنگھ، سکریٹری، پنجاب اردو اکیڈمی نے مہمانان کا خیرمقدمی کلمات سے استقبال کیا اور مختصر طور پر سمینار کے انعقاد کے مقصد اور اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج سے شروع ہونے جا رہے اس دو روزہ منشیات کے خلاف قومی سیمینار کے مثبت اثرات ہمارے سماج پر ضرور نظر آئیں گے۔ اس کے بعد جناب ارشد شریف کی مترنم آواز میں پیش کیے گئے قومی و سماجی ترانہ سے باقاعدہ طور پر سیمینار کا آغاز کیا گیا۔

خصوصی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد جمیل الرحمٰن نے کہا کہ میرے خیال میں ادبی دنیا کا پہلا سمینار ہے جس میں اردو اور پنجابی ادب میں نشہ بندی کی ترغیب پر مشتمل تخلیقات اور ادبا کی اس حوالے سے کی گئیں کوششوں کو اجاگر کرنا اور اردو پنجابی ادب کے ساتھ ساتھ دیگر ادبیات میں اس سنگین مسئلے کی طرف ادبا کو مائل کرنا ہے۔

ڈاکٹر علیم اشرف خاں، شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو ادب کی مختلف تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے منشیات کی روک تھام کے لیے تخلیق کیے گئے مختلف ادبی فن پاروں کی بات کی۔ انھوں نے بے حد متاثر کن انداز میں اپنا خطبہ پیش کیا اور اردو، فارسی، عربی و دیگر ادبیات میں منشیات کے خلاف کیا کچھ تخلیق کیا گیا اسے اپنے تجزیہ کے ساتھ بہترین انداز میں بیان کیا۔

پروفیسر ناشر نقوی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج پنجاب ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستان منشیات کے بڑھتے استعمال سے جوجھ رہا ہے جو کہ ہمارے لیے لمحہ فکر اور سنگین ترین مسئلوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے حوالے سے مختلف ادبا و شعرا کے اس ضمن میں اپنی تخلیقات کے ذریعے اٹھائے گئے اقدامات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے ادبا و شعرا اس مہلک مسئلے پر بہت کچھ لکھ رہے ہیں جس سے مستفید ہو کر ہماری نوجوان نسل صحیح راستہ اختیار کرے گی اور اسے نشہ بندی کی ترغیب بھی حاصل ہوگی۔ سردار کلدیپ سنگھ، ڈی ایس پی، مالیرکوٹلہ نے کہا کہ حکومت پنجاب نشوں کے روک تھام کے لیے بلند سطح پر اقدامات کر رہی ہے مگر پھر بھی اس لعنت کے خلاف لڑنے کے لیے حکومت کا ساتھ ہر ایک عام و خاص کو دینا بے حد ضروری ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد سلیم زمری نے انجام دی۔

منشیات کے خلاف بیداری مہم کے تحت منعقد کیے گئے اس دو روزہ قومی سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت معروف ادیب و شاعر پروفیسر عزیز پریہار، ریٹائرڈ پروفیسر، سرکاری کالج، لدھیانہ نے فرمائی جبکہ ڈاکٹر علی عباس، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ نے 'ادب سماج اور شراب کی شیطانی اصلیت'، ڈاکٹر گورسیوک لمبی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے 'پنجابی ناٹک وِچ نشہ بندی دی پریرنا'، ڈاکٹر ریحان حسن، گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر نے 'نشہ بندی کی ترغیب اور ٹمپرنس گائیڈ' اور جناب جسویر رانا نے

’نشہ خوری توں نشہ بندی تک‘ عنوانات پر اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض معروف افسانہ نگار جناب ایم انوار انجم نے انجام دیے۔

اس قومی سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر منظور حسن، ریٹائرئڈ پروفیسر، سرکاری کالج، مالیر کوٹلہ نے فرمائی جبکہ ڈاکٹر رحمٰن اختر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے ’اردو افسانے میں منشیات کے مسائل: ایک اجمالی جائزہ‘، جناب پون ہرچند پوری، معروف افسانہ نگار نے ’پنجابی ساہت اندر نشہ بندی دی پریرنا‘، ڈاکٹر محمد تابش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے ’نئی نسل میں نشے کا بڑھتا رجحان‘ اور جناب جتندر ہانس نے ’پنجابی وارتک وِچ نشہ بندی: دِشا اور دَشا‘ عنوانات پر اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد شفیق تھند نے انجام دی۔

سمینار کے تیسرے واختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد اقبال، سابق پرنسپل سرکاری کالج آف ایجوکیشن، مالیر کوٹلہ نے فرمائی جبکہ ڈاکٹر ہندر بھمسی، شری گورو گرنتھ صاحب ورلڈ یونیورسٹی، فتح گڑھ صاحب نے ’بیمار مانسکتا توں تندرست مانسکتا تک‘، ڈاکٹر وقار صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے ’اردو شاعری میں خمریات کی روایت اور ردعمل‘ اور لیکچرار رشید عباس، معروف افسانہ نگار نے ’نشہ بندی دی پریناہت اکیسویں صدی وِچ لکھیا پنجابی ساہت‘ عنوانات پر اپنے تحقیقی مقالہ پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے سمینار کی رپورٹ اور کلمات تشکر پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض لیکچرار محمد دلشاد نے انجام دیے۔ سمینار کے آخر میں سبھی مہمانان اور مقالہ نگاروں کو اعزازات سے نوازا۔

پریس ریلیز: پنجاب اردو اکیڈمی، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ پنجاب، 21 دسمبر 2023

غالب اور ہم

چنڈی گڑھ: پنجاب اردو اکیڈمی مالیر کوٹلہ (حکومت پنجاب) کے اشتراک سے شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی

چنڈی گڑھ میں ’غالب اور ہم‘ کے موضوع پر ایک خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر 1995 میں شعبہ سے فارغ التحصیل ادریس احمد نے شعبہ کی ترقی کو سراہتے ہوئے کہا کہ آج مجھے جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اسی شعبے کی بدولت ہے۔ اسی نے مجھے غالب کی طرف مائل کیا اور غالب کو جاننے کا موقع فراہم کیا۔ مرزا غالب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری میں فکری ابعاد و جہات کے ساتھ شوخی وظرافت بھی جا بجا دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ عملی زندگی میں خوش باش انسان تھے اور ہر غم کو بھلا کر آگے نکلنے والے شخص تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الطاف حسین حالی نے انھیں حیوان ظریف کہا ہے۔ پروفیسر ریحانہ پروین نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ غالب مشکل ترین موضوعات کو انتہائی سادگی اور سلاست کے ساتھ بیان کرنے میں ماہر تھے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر علی عباس نے دونوں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے طالب علموں کی آگاہی کے لیے ماہرین غالبیات کی تحقیقات پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی زندگی اور ان کی شعری وادبی تخلیقات پر بہت سارے لوگوں نے کام کیا ہے اور ان کی زندگی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ بھی لیا ہے لیکن غالب کی آفاقیت کے سبب اب بھی ان کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن پر کوئی یقینی رائے نہیں دی جاسکتی اور یہی ناتمامی و تشنگی کا احساس ہی ان کی شخصیت اور شاعری کو نہ صرف آج بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی قابل توجہ بناتا رہے گا۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے ریسرچ اسکالر خلیق الرحمٰن نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں شعبہ کے طالب علموں نے غالب کے اشعار بھی پیش کیے۔ آخر میں شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر ذوالفقار علی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 25 دسمبر 2023

اردو اور فارسی کا باہمی رشتہ

پانی پت: شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں ’اردو اور فارسی کا باہمی رشتہ‘ کے عنوان پر ایک خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر زین العبا نے طلبہ سے خصوصی خطاب میں پنجاب میں فارسی کی آمد اور پنجابی زبان و ادب اور تہذیب پر فارسی کے اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب فارسی زبان وادب کی آبیاری کے لیے ایک سازگار مقام رہا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے چند تاریخی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی دور سے قبل فارسی زبان پنجاب میں آچکی تھی۔ اردو اور فارسی کے رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ اردو ادب کی اکثر اصناف سخن فارسی سے اردو میں آئی ہیں جن میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، داستان وغیرہ کا خصوصی طور سے ذکر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ہی نہیں بلکہ برصغیر کی کئی زبانوں کی نشو ونما میں فارسی زبان نے اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر زین العبا نے فارسی اور اردو کے رشتے کو ایک فطری رشتہ بتاتے ہوئے کہا کہ چونکہ فارسی زبان ہند ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اسی نسبت سے اردو اور فارسی میں فطری رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ دونوں زبانوں کی اصطلاحات اور مرکبات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ نیز انھوں نے طلبہ کو اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ اردو زبان نے عربی کے مقابلے میں فارسی زبان کا رنگ و آہنگ زیادہ قبول کیا ہے۔ مہمانانِ خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس نے اردو اور فارسی زبان میں پائی جانے والی لفظیاتی مماثلتوں پر خصوصی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں داخل ہوکر کس طرح اپنے اصطلاحی اور لغوی معنی سے جدا ہوکر نئی زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اردو میں بولے جانے والے الفاظ خواہ وہ عربی الاصل ہوں یا فارسی، اب ان کی شناخت اردو الفاظ ہی کی حیثیت سے ہے۔ پروفیسر ریحانہ پروین نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے اپنے صدارتی کلمات میں اردو اور فارسی کے باہمی رشتے پر مختصر اور جامع گفتگو کی۔ شعبے کے چند طلبہ نے اردو اور فارسی کے اشعار بھی پڑھے۔ واضح رہے کہ اس پروگرام کی نظامت شعبہ کے ریسرچ اسکالر خلیق الرحمٰن عوان نے کی۔ آخر میں شعبہ فارسی کے استاذ ڈاکٹر ذوالفقار علی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 15 دسمبر 2023

تلنگانہ

تدوین متن اصول اور طریقہ کار

حیدر آباد: تدوین متن کا مقصد اصل متن کی بازیافت ہے۔ یہ ایک فن ہے جس کا تعلق تحقیق سے ہے۔ ترتیب

بکھری ہوئی چیزوں کو قدیم وتاخیر کا لحاظ رکھتے ہوئے جمع کرنا ہے۔ متن کے منتشر اجزا کو یکجا کرنا تدوین ہے۔ تدوین متن کسی متن کے دستیاب مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترین متن تیار کرنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز محقق و ماہر دکنیات اور سابق صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل

اردو یونیورسٹی، پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے شعبۂ اردو کی جانب سے اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات کے کانفرنس روم میں 'تدوین متن: اصول اور طریقہ کار' کے موضوع پر منعقدہ خصوصی لیکچر میں کیا۔ انھوں نے متن کی تفصیلی تعریف بیان کی اور اس کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالی۔ متن تحریر کرنے کے لیے مختلف چیزوں مثلاً کاغذ، پیڑ کی چھال، پتے، پتھر، ہڈی وغیرہ سے بھی واقف کرایا۔ انھوں نے بتایا کہ اصل نسخے سے جب کوئی نقل تیار کی جاتی ہے تو اس میں تین فیصد غلطیاں در آتی ہیں۔ اس سے درجہ بہ درجہ جتنی نقلیں تیار ہوتی ہیں ان میں غلطیوں کا فیصد بڑھ جاتا ہے۔ لغزش قلم، لغزش چشم اور لغزش گوش کی وجہ سے متن مسخ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تعصب یا عقیدت کی وجہ سے بھی متن مسخ ہو جاتا ہے۔ وقت، موسم، گرد وغبار کیڑے مکوڑے وغیرہ مخطوطات کے دشمن ہیں۔ مدون متن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علم اور تجربے سے کام لے کر متن کو اس صورت میں پیش کرے جو مصنف کے ذہن میں موجود تھا۔ مدون متن کے لیے مصنف کی مکمل سوانح، اس سے پہلے اور بعد کی زبان اور اس کے الفاظ، متروکات، مخطوطے یا نسخے سے متعلق عہد وغیرہ پر مکمل نظر ہونی چاہیے۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبہ پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے کی۔ انھوں نے تدوین متن کے حوالے سے پروفیسر نسیم الدین فریس کی گفتگو کو نہایت کارآمد قرار دیا اور کہا کہ شعبے کی جانب سے آئندہ بھی اس طرح کے اہم موضوعات پر لیکچر کا انعقاد کیا جائے گا۔ پروفیسر مسرت جہاں نے مہمان مقرر کا جامع تعارف پیش کیا۔ نظامت پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر فیروز عالم ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو نے کی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر جابر حمزہ نے کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 دسمبر 2023

نذیر احمد میموریل لیکچر

حیدرآباد: مہیلا وشوا ودیالیم (کوٹھی ویمنس کالج) میں 'نذیر احمد میموریل لیکچر' بعنوان 'اردو زبان کا تحفظ اور عملی اقدامات' کا، کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ محمد نذیر احمد مرحوم جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں، چیئرپرسن بورڈ آف اسٹڈیز کے عہدے پر فائز رہے اور ایک طویل عرصے تک کوٹھی ویمنس کالج شعبۂ اردو میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو خدمات انجام دیں، اس دوران انھوں نے طلبا اور اساتذہ کی بہترین تعلیم و تربیت کے ساتھ انہیں روزگار سے مربوط کیا اور ریاست تلنگانہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں اردو اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے حکومت تلنگانہ سے مؤثر نمائندگی کی۔ اس پروگرام میں صرف نصاب پڑھانے تک محدود نہ رہنے بلکہ بنیادی طرز پر اردو زبان سکھانے، اردو طلبا کی تعداد بڑھانے اور اردو زبان کو روزگار سے مربوط کرنے کی کامیاب سعی کی گئی۔ وائس چانسلر پروفیسر ایم ویجولتا نے اردو زبان کو ایک میٹھی زبان قرار دیا اور کہا کہ وہ سائنس اینڈ ٹکنالوجی کے ساتھ زبانوں کا ارتقا بھی ضروری سمجھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ تمام طلبا ریاست تلنگانہ کی پہلی اور دوسری سرکاری زبان اردو اور تلگو پر مکمل عبور حاصل کریں۔ سینئر صحافی روزنامہ سیاست محمد ریاض احمد نے کہا کہ کوٹھی ویمنس کالج اردو کے لیے تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس وقت دنیا کی پہلی اردو یونیورسٹی کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا اس وقت برٹش ریزیڈنٹ کرک پیٹرک کی طرف سے مخالفت ہو رہی تھی۔ ایسے میں کرک پیٹرک کو قائل کرنے اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت لی گئی اور انھیں مشن دیا گیا کہ وہ کرک پیٹرک کو قائل کریں تب انھوں نے اس کام کے لیے سرسید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود احمد کو برٹش ریزیڈنسی کوٹھی ویمنس کالج حیدرآباد مدعو کیا جب سر راس مسعود احمد کوٹھی ویمنس کالج آئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں کرک پیٹرک کے دونوں بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کھیل رہے تھے تب انھوں نے ان بچوں سے انگریزی میں بات کرنے کے بجائے فرنچ زبان میں بات شروع کردی لیکن بچوں نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی مسلسل بات کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو تب کرک پیٹرک نے کہا کہ ان بچوں کی مادری زبان انگریزی ہے آپ ان سے انگریزی میں بات کیوں نہیں کرتے؟ سر راس مسعود احمد نے جواب دیا کہ میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ مادری زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ کرک پیٹرک قائل ہوگئے اور اس طرح جامعہ عثمانیہ کا وجود عمل میں آیا جو اردو کی پہلی یونیورسٹی کہلائی۔ اس جلسے میں سرگرم مجاہدین اردو جناب محمد محمود علی سہیل صدر و جنرل سکریٹری سید سمیع اللہ حسینی 'آئیٹا' (آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن حیدرآباد) نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ ان کی تنظیم شہر حیدرآباد میں 250 اسکولوں کے ساتھ کام کر رہی ہے اور وہ ان دوسو پچاس اسکولوں میں ابتدا ہی سے اردو کو سرکاری طور پر بحیثیت زبان اول عملی طور پر لازمی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد شوکت پرنسپل ایم ایس مشن ہائی اسکول جو عرصہ دراز سے اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں نے 'آئیٹا' (آل انڈیا آئیڈیل اسوسی ایشن حیدرآباد) پر زور دیا کہ وہ 'آئیٹا' سے وابستہ 250 اسکولوں میں سرکاری طور پر ایک مضمون اردو کو لازمی کریں اس کے علاوہ جناب محمد عبدالرحیم فہیم نے اس موقعے پر عملی اقدام اٹھاتے ہوئے کہا کہ وہ بھی ایک طویل عرصے سے اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں لیکن خاص طور پر اس پروگرام کے لیے انھوں نے 'سکسس جونیئر اینڈ ڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر این پارتھا سارتھی' اور 'رائل ایمپیسی جونیئر کالج' کی پرنسپل محترمہ مادھوی راگھوا کو اس بات کے لیے منوالیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ایک مضمون اردو لازم کر دیں گے اور یقین دلایا کہ وہ آئندہ تعلیمی سال سے طلبا کو اردو زبان کی طرف راغب کریں گے اور اساتذہ کے تقرر کو بھی یقینی بنائیں گے۔ جناب فضل الرحمٰن خرم ڈائرکٹر ڈان ہائی اسکول نے بتایا کہ انھوں نے شخصی طور پر اسکول انتظامیہ سے ملاقات کرتے ہوئے کئی اسکولوں میں اردو زبان کو لازمی بنانے پر آمادہ کرلیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد شعیب فرزند محمد نذیر احمد نے اپنے کلنک میں اردو میں ڈسکرپشن لکھنے کا اعلان کیا۔ مہمان خصوصی جناب محمد شکیل احمد سرکاری مندوب عالمی صحت نے کہا کہ وہ آج بھی روزنامہ سیاست پڑھتے ہیں، ان کا ذریعے تعلیم اردو ہی رہا ہے۔ عرب امارات و مغربی ممالک میں بھی اردو زبان تیزی سے پھل پھول رہی ہے لیکن افسوس کہ خود اپنے وطن میں انحطاط کا شکار ہو رہی ہے۔ صدر جلسہ محمد شاہد حسن خصوصی قانونی مشیر مملکت سعودی عربیہ وامریکہ نے حکومت تلنگانہ سے اپیل کی ہے کہ وہ تمام اسکولوں اور جونیئر کالجوں میں اردو کے لزوم کو یقینی بنائیں۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کہا کہ اردو کا رسم الخط ختم ہو رہا ہے اس کو بچایئے۔ اس موقعے پر فعال اردو اساتذہ کو نذیر احمد میموریل ایوارڈز عطا کیے گئے۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے جلسے کی کارروائی چلائی۔

پریس ریلیز: سیدہ نسیم، حیدرآباد، 2 جنوری 2024

جھارکھنڈ

قومی اردو کونسل کے سینٹر میں جلسۂ تقسیم اسناد

رانچی: 17 دسمبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی

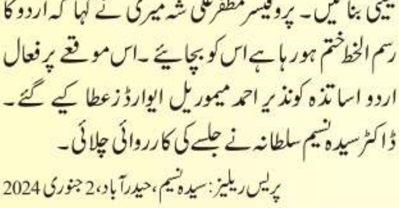

دہلی کے اردو ڈپلومہ سینٹر 'پائینیر ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ' کانکے (رانچی) میں جلسۂ تقسیم اسناد کا ایک شاندار

پروگرام منعقد کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی اور صدر جناب ڈاکٹر عابد حسین، انڈر سیکرٹری لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ گورنمنٹ آف جھارکھنڈ تھے۔ جن کی صدارت میں 37 طلبہ وطالبات کو سند، ٹرافی اور میڈل سے نوازا گیا، فرسٹ پوزیشن پر صالحہ خاتون رہی، دوسری پوزیشن پر شائستہ احتشام اور تیسری پوزیشن طاہرہ خاتون نے حاصل کی۔ سنہ 2022-2023 سیشن کے کامیاب طلبہ وطالبات کے درمیان تقسیم اسناد کے اس پروگرام کی نظامت ادارہ کے صدر محمد یوسف نے کی، انھوں نے بتایا کہ ادارے کا قیام عصر حاضر کے تقاضوں کہ پیش نظر نئی نسل کو جدید اور عصری تعلیم سے آراستہ کرانے کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات کے لیے کیریئر گائیڈینس کا پروگرام چلانا ہے۔ مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر عابد انڈر سکریٹری لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ نے اپنے تمہیدی خطاب میں کامیابی کے نایاب ٹپس دیے، انھوں نے اس کورس میں کامیاب ہونے والے تمام طلبہ وطالبات کو مبارکباد دیتے ہوئے مسلسل ایمانداری اور محنت کے ساتھ اپنے مشن میں لگے رہنے کا مشورہ دیا۔

پی کے میموریل کالج دھنباد ،شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر عالم گیر ساحل نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ادارے کا یہ قدم سراہنے لائق ہے کہ یہاں نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم طلبا کو بھی اردو لکھنا بولنا سکھایا جارہا ہے۔ موصوف نے عوام سے اپیل کی کہ وہ پہلے اپنے گھروں میں اردو رائج کریں۔ اپنے بچوں کو اردو اخبارات اور رسائل پڑھنے کی عادت ڈلوائیں۔ آس پاس کے پرائیویٹ اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم ہو سکے تو اس کی کوشش کریں۔ اس موقعے پر مختلف مشاہیر کی بطور مہمان شرکت رہی۔

محمد یوسف، اردو اسٹڈی سینٹر، کوڈا۔ 1125، پائیونیر ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ رانچی 28 دسمبر 2023

مہاراشٹر

میرا ادبی سفر

ممبئی: ممبئی کا ادبی سفر ایک صدی قدیم ہے، اور اردو کا مرکز نہ ہونے کے باوجود ادب کا گہوارہ ہے۔ ایک صدی کے دوران یہاں اردو زبان، لسانیات اور ادب کے عالم بڑی تعداد میں ملتے تھے، لیکن آج ان کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اس کا اظہار عبدالستار دلوی سابق صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی نے کیا۔ 'میرا ادبی سفر' کے عنوان کے تحت شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کا سلسلے وار تیسرا پروگرام گزشتہ روز منعقد کیا گیا۔ اس ادبی سفر کے مقرر ممبئی کے معروف ماہر لسانیات اور محقق پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے تعلیمی دور کے ساتھ ساتھ دوستوں، اساتذہ اور ممبئی کے حالات پر گفتگو کی۔ مذکورہ تقریب کی صدارت پروفیسر محمد شاہد (سابق صدر شعبۂ عربی ممبئی یونیورسٹی) نے کی۔ اس تقریب میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنا تعارف، تعلیمی سفر اور ممبئی میں بزرگوں کی علمی وادبی صحبتوں سے استفادے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں شہر سے کثیر تعداد میں اردو داں طبقہ، شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ نے شرکت کی۔ اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر احرار اعظمی نے کی۔ آخر میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 دسمبر 2023

اردو کارواں کے تحت افسانہ گوئی مقابلہ

ممبئی: اردو کارواں کے تحت 'کل مہاراشٹر آن لائن افسانہ گوئی مقابلہ' منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر مسرت فردوس (ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی) نے کی۔ منصفی کے فرائض ڈاکٹر شرمین انصاری (شاد آدم کالج بھیونڈی)، محمد علیم اسماعیل (شعبہ تعلیم ضلع پریشد بلڈانہ)، اور ڈاکٹر مسرت صاحب علی (سابق پرنسپل گورنمنٹ سیکنڈری ٹریننگ کالج، ممبئی) نے انجام دیے۔ صدر اردو کارواں فرید احمد خان نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے پروگرام کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ افسانہ گوئی مقابلے میں ممبئی، اورنگ آباد، بھیونڈی، مالیگاؤں وغیرہ سے 18 شرکا نے حصہ لیا اور بہترین انداز میں مختلف افسانہ نگاروں کے افسانے پیش کیے۔ پروگرام کی صدر پروفیسر مسرت فردوس نے اردو کارواں کے اس مقابلے کے بارے میں کہا کہ ''افسانہ گوئی کے مقابلے کی بدولت طلبا نے کئی اہم افسانوں کا مطالعہ کیا ہوگا، یہی مقصود مقابلہ ہے۔ ڈاکٹر شرمین نے صحیح ادائیگی وتلفظ کی اہمیت بیان کی۔ صدر اردو کارواں فرید احمد خان نے اردو کارواں اورنگ آباد کی سرپرست پروفیسر مسرت فردوس ودیگر جج صاحبان کے تعاون کے لیے خوشی وشکر کا اظہار کیا اور بتایا کہ ہر سال عشرۂ اردو میں ممبئی واورنگ آباد کے علاوہ مہاراشٹر کے مختلف مقامات سے شرکا مختلف پروگرام میں جڑتے رہے ہیں۔ نزہت فاطمہ کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: فرید احمد خان، مہاراشٹر، 5 دسمبر 2023

مدھیہ پردیش

اردو یونیورسٹی (مانو) بھوپال کیمپس میں ریجنل سینٹر اور کالج آف ٹیچر ایجوکیشن کی عمارتوں کا افتتاح

بھوپال: پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بھوپال کیمپس کا 5 دسمبر

2023 کو افتتاح کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھوپال کیمپس کی حیثیت جلد ہی سیٹلائٹ کیمپس کی ہوگی۔ 6.44 ایکڑ اراضی پر پھیلے ہوئے، بھوپال کیمپس، یونیورسٹی کے تعلیمی اختصاص کے حصول میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تا حال یہ اُردو یونیورسٹی، بھوپال ریجنل سینٹر، اور کالج آف ٹیچر ایجوکیشن کے طور پر اُردو کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ توسیع محض فزیکل انفراسٹرکچر نہیں بلکہ یونیورسٹی کے لیے تعلیمی اختصاص، ترقی اور جدت کے عزم کی علامت ہے۔ شیخ الجامعہ نے مانو بھوپال کیمپس میں دو ہوسٹلز (لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے) تعمیر کی منظوری دے دی ہے، نیز انھوں نے کہا کہ میں بھوپال کیمپس کے معیار کو بہتر بنانے اور اسے سیٹلائٹ کیمپس کی سطح پر لانے کے لیے کوشش کروں گا۔'' وائس چانسلر نے بھوپال شہر میں مقامی کمیونٹی اور مدارس کے ساتھ روابط قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ یونیورسٹی کے مینڈیٹ کو پورا کرنے کے لیے اس طرح کے اقدامات ضروری ہیں۔

پروفیسر سید عین الحسن نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگلے برس نوابوں کے شہر بھوپال میں مانو کا ایک پیشہ وارانہ .B.Voc تربیتی مرکز کھولا جائے گا، جو ہاسٹل، کلاس رومز وغیرہ کی دستیابی سے مشروط ہوں گے۔ نظامت فاصلاتی تعلیم کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد رضاء اللہ خان نے بھی بھوپال کیمپس کے ذریعے کی گئی کوششوں کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ وسیع تر سامعین تک پہنچنے اور سب کو تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے فاصلاتی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اس موقعے پر مانو کے ریجنل ڈائرکٹر (بھوپال) پروفیسر محمد احسن نے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے مصروف شیڈول سے وقت نکال کر بھوپال کیمپس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیمپس تعلیم اور اکتساب کے لیے سازگار ماحول کی فراہمی کے سلسلے میں مانو کے عزم کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیمپس ملک بھر میں اپنی نوعیت کے پہلے کیمپس کے طور پر نمایاں ہے۔

پروفیسر نوشاد حسین، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال نے وسیع تر مینڈیٹ کو پورا کرنے میں اپنے کالج

کے اہم کردار کی نشاندہی کی۔ سی ٹی ای بھوپال نے اکیڈمک کونسل سے بی۔ایڈ اسپیشل کو متعارف کرانے کی منظوری حاصل کرلی ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد احسن، ریجنل ڈائرکٹر و انچارج مانو بھوپال کیمپس، 4 جنوری 2023

اعزاز و اکرام

صادقہ نواب سحر

نئی دھلی: اردو زبان کے لیے پُروقار ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2023 معروف افسانہ و ناول نگار صادقہ نواب سحر کو ان کے ناول 'راجدیو کی امرائی' کے لیے دیا جائے گا۔ قرۃ العین حیدر کے بعد ڈاکٹر صادقہ نواب سحر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کرنے والی دوسری خاتون ادیبہ ہیں۔ نئی دہلی میں ساہتیہ اکادمی ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ چیئرمین جناب مادھو کوشک کی صدارت میں رویندر بھون میں اکادمی کی ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ میں 24 ہندستانی زبانوں کے لیے ساہتیہ اکادمی کے اعلیٰ ادبی ایوارڈز 2023 کو منظوری دی گئی۔ اس سال نو شعری مجموعے، چھ ناول، پانچ افسانوی مجموعے، ایک ادبی تنقید اور تین مضامین کے مجموعے کو انعامات کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

صادقہ نواب سحر اردو کی ممتاز افسانہ و ناول نگار ہیں۔ آپ کی پیدائش گنٹور، آندھرا پردیش میں ہوئی لیکن ممبئی میں پلی بڑھیں۔ آپ نے ہندی میں پی ایچ ڈی اور اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں ایم اے کیا ہے۔ آپ افسانے اور ناول کے علاوہ شاعری، تنقید اور ناٹک بھی لکھتی ہیں۔ اردو میں آپ کے تین ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا'، 'جس دن سے' اور 'راجدیو کی امرائی'؛ دو افسانوی مجموعے 'خلش بے نام سی' اور 'بیچ ندی کا مچھیرا'؛ ڈراموں کا مجموعہ 'مکھوٹوں کے درمیان'؛ پانچ شعری مجموعے 'انگاروں کے پھول'، 'ست رنگی'، 'باوجود'، 'چھوٹی سی یہ دھرتی' اور 'دریا کوئی سویا سا' کے علاوہ مضامین کا مجموعہ 'مضامینِ صادقہ' شائع ہوچکے ہیں۔ ہندی میں بھی آپ کی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کی کتابوں کے ترجمے مختلف ہندستانی زبانوں میں ہوچکے ہیں؛ نیز آپ کی تخلیقات کو نصابی کتابوں میں بھی جگہ ملی ہے۔ آپ کی شخصیت اور فن پر تین کتابیں شائع ہوئی ہیں اور کئی ایم فل کے علاوہ پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوچکی ہے۔ ماہنامہ 'چہارسو'، 'شاعر' اور 'اسباق' نے آپ پر خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ صادقہ نواب سحر کو کئی انعامات سے نوازا جاچکا ہے جن میں مہاراشٹرا اردو ساہتیہ اکادمی کا 'ساحر ایوارڈ'، بہار اردو اکادمی کا 'رشیدۃ النسا ایوارڈ' اور 'شکیلہ اختر ایوارڈ' کے علاوہ اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ کا 'مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'، بھارتیہ بھاشا پریشد کولکاتہ ایوارڈ، مہاراشٹرا ہندی ساہتیہ اکادمی کا 'منشی پریم چند ایوارڈ'، 'جینندر کمار ایوارڈ' وغیرہ شامل ہیں۔

اردو ایوارڈ کا فیصلہ جیوری کی میٹنگ میں ہوا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر چندر بھان خیال نے کی اور جیوری ممبران میں کرشن کمار طور، طیب علی (طیب خرادی) اور مہتاب عالم شامل تھے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ 12 مارچ 2024 کو کمانی آڈیٹوریم، نئی دہلی میں منعقد ہونے والی ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ اس بار یکم جنوری 2017 سے 31 دسمبر 2021 کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی نمائندہ کتابیں زیرغور آئیں۔

دیگر زبانوں کے انعام یافتگان کے نام ہیں: پرنو جیوتی ڈیکا (آسامی)، سوپن مے چکربرتی (بنگالی)، نندیشور دیماری (بوڈو)، وجے ورما (ڈوگری)، نیلم شرن گور (انگریزی)، ونود جوشی (گجراتی)، سنجیو (ہندی)، لکشمی شا تولپڈی (کنڑ)، منشور بانہالی (کشمیری)، پرکاش ایس پریکار (کونکنی)، باسوکی ناتھ جھا (میتھلی)، ای وی رام کرشنن (ملیالم)، سوروکھ کھیم ممھینی (منی پوری)، کرشنات کھوت (مراٹھی)، یدھ ویر رانا (نیپالی)، آشوتوش پریڈا (اڑیہ)، سورن جیت سوی (پنجابی)، گجے سنگھ راج پوروہت (راجستھانی)، ارون رنجن مشر (سنسکرت)، تاراسین باسکی (سنتھالی)، ونود آسودانی (سندھی)، راج شیکھرن (تمل)، ٹی۔ پتنجلی شاستری (تیلگو)۔

اس کے علاوہ اکادمی کی ایگزیکیٹو بورڈ نے سات بھاشا سمان کی بھی منظوری دی جو امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ قرون وسطیٰ کی زبانوں میں نمایاں ادبی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 21 دسمبر 2023

بزم صدف تقسیم ایوارڈ تقریب

پٹنہ: اردو زبان امن اور بھائی چارہ کے ساتھ محبت، رواداری اور انسانیت کے پیغام کو عام کرنے میں دنیا کے ہر خطے تک پہنچی۔ امیر خسرو سے وسیع المشربی اور سماجی بھائی چارہ کا تصور لے کر ہمارے شعرا و ادبا نے اپنی زبان کو پھیلانے کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ گذشتہ سات آٹھ سو برسوں میں یہ زبان ہندوستان اور برصغیر سے نکل کر یورپ، امریکہ اور خلیج کے ملکوں میں کروڑوں لوگوں کے اظہار کا ذریعہ بن گئی ہے۔ بزم صدف بین الاقوامی ایوارڈ تقریب برائے 2022 منعقدہ شارجہ (متحدہ عرب امارات) کا افتتاح کرتے ہوئے بزم صدف کے چیئرمین نے مذکورہ باتیں کہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بزم صدف اپنی مادری زبان سے محبت کرنے والوں کی ایک ایسی تنظیم ہے جہاں قومیت اور جغرافیائی قید و بند کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا بھر کے ادبا و شعرا کو دعوت دی کہ وہ بزم صدف سے جڑیں اور مل جل کر بڑے پیمانے پر ادبی اور علمی کاموں کے لیے سامنے آئیں۔ مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے روزنامہ تاثیر کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر محمد گوہر شریک تھے۔ انھوں نے اردو صحافت اور ادب کے رشتوں پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ان دونوں کے اشتراک سے کس طرح برصغیر میں انگریزوں سے مقابلہ کیا گیا اور آزاد ملکوں کے خواب دیکھے گئے۔ انھوں نے کہا کہ بزمِ صدف سے ان کا اخبار جڑ کر اردو کے اس عالمی پیغام کو گھر گھر تک پہنچانا چاہتا ہے۔ متحدہ عرب امارات کی بزمِ صدف شاخ کے کنوینر جناب امتیاز صدیقی نے بتایا کہ امارات میں ہماری شاخ ہر چند نوزائیدہ ہے مگر یہاں کے ادب دوستوں اور قدردانوں کے تعاون سے بزم صدف کی یہ شاخ اس سے بہتر پروگرام آنے والے دنوں میں کرے گی۔ شعر و ادب کے حوالے سے بزمِ صدف کی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے آنے والے وقت میں ہر طرح کی معاونت کی یقین دہانی کرائی۔ مشہور شاعر اور بزم صدف انٹرنیشنل کی دوحہ قطر شاخ کے صدر ڈاکٹر ندیم ظفر جیلانی دانش نے تقسیمِ ایوارڈ تقریب کی بہترین نظامت کی۔ بزمِ صدف بین الاقوامی ایوارڈ برائے 2022 ہندوستان کے مشہور محقق، ظریفانہ شاعر، رباعی گو اور ادب اطفال کے ماہر ڈاکٹر ظفر کمالی کو دیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت تک ظفر کمالی کی 19 کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور اتر پردیش اردو اکادمی کے علاوہ ساہتیہ اکادمی، نئی

دہلی نے بھی انھیں اپنے معزز ایوارڈ پیش کیے ہیں۔ 2022 کے لیے محمد صبیح بخاری ایوارڈ برائے اردو تحریک ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی کو دیا گیا۔ ناظم جلسہ نے بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ 2022 کے لیے دبئی میں مقیم جناب شاداب الفت کو آواز دی۔ ایوارڈ تقریب کے اختتام سے پہلے جناب صفدر امام قادری کی مرتبہ ضخیم کتاب 'ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں' کا تمام مہمانوں نے اجرا کیا۔ بزمِ صدف کے اس تقسیم ایوارڈ پروگرام کی صدارت بزمِ صدف کے ڈائرکٹر اور معروف نقاد پروفیسر صفدر امام قادری نے کی۔ انھوں نے انعام یافتگان ڈاکٹر ظفر کمالی (ہندوستان)، ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی (ابوظہبی) اور جناب شاداب الفت (دبئی) کو مبارکباد پیش کی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ ان کے کاموں سے آئندہ بھی ہماری زبان مالامال رہے گی۔ تقسیم ایوارڈ کے بعد ایک عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی نظامت جناب مسعود حساس نے کی اور پروفیسر صفدر امام قادری نے صدارت کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 9 دسمبر 2023

غضنفر اقبال

گلبرگہ: معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی سربراہ کاغذ دکن بیورو گلبرگہ کی کتاب روشن ستارے گلبرگہ یونیورسٹی کے راجیہ اتسوایوارڈ 2022 کے لیے منتخب کی گئی ہے یہ ایوارڈ 5 ہزار روپے نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

گلبرگہ یونیورسٹی کی جانب سے ہر سال کنڑا اور دیگر زبانوں کے کتب کے مصنفین کو راجیہ اتسو ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ سینئر صحافی عزیز اللہ سرمست نے ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی کو ان کی کتاب گلبرگہ یونیورسٹی کے راجیہ اتسو ایوارڈ 2022 کے لیے منتخب ہونے پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ یہ ایوارڈ جہاں اردو ادب کی اہمیت کو منوانے کے مترادف ہے وہیں نوجوان ادیب کی حیثیت سے ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی کے لیے اس نوعیت سے بہت بڑا اعزاز ہے کہ کنڑا کی اجارہ داری کے دور میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

روزنامہ بہمنی نیوز، گلبرگہ، 2 جنوری 2023

ابوالقاسم عباسی

لکھنؤ: لکھنؤ کی مشہور سماجی، تعلیمی اور ادبی شخصیت ڈاکٹر ابوالقاسم عباسی کا نام 2023 میں انڈیا پراؤڈ بک آف ریکارڈ میں درج کیا گیا اور ان کو شبد تنظیم کی طرف سے بھارت گوروسمان 2023 سے بھی نوازا گیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ابوالقاسم عباسی ایک ادیب، شاعر، سماجی کارکن اور ایک بہترین مقرر کے طور پر جانے جاتے ہیں اور انھیں ماضی میں بہت سے بین الاقوامی اور قومی اعزازات مل چکے ہیں، جن میں انٹرنیشنل اچیور ایوارڈ، یونائیٹڈ نیشن سلیب ایوارڈ اور شکشک رتن 2023 ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ پریاگ راج کے جھوسی میں واقع ایک گیسٹ ہاؤس میں شبد سنستھان کے زیر اہتمام آل انڈیا کوی سمیلن ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت مانو سنگھ رانا نے کی اور نظامت کے فرائض دین بندھو سرل نے انجام دیے جس میں متعدد ادبی خدمات انجام دینے والوں کو ساہتیہ گوروسمان سے سرفراز کیا گیا۔ مذکورہ پروگرام میں ڈاکٹر عباسی، آدرش پانڈے، ہرش جونپوری، ارچنا آنند غازی پور، انامیکا گپتا، آریہ دین بندھو وغیرہ سمیت متعدد ادبا و شعرا کو ساہتیہ گوروسمان سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 دسمبر 2023

اجرا

بیسویں صدی کے منتخب افسانے

نئی دھلی : 'سخن سرائے' ادبی فورم دہلی کے زیر اہتمام ڈاکٹر شمع افروز زیدی مدیرہ بیسویں صدی کی مرتب کردہ

کتاب 'بیسویں صدی کے منتخب افسانے' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے صدر مجلس پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ بیسویں صدی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے، خوشتر گرامی جیسے لوگوں نے یہ ثابت کیا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے، زبانیں سمواد کے لیے ہوتی ہے وواد کے لیے نہیں۔ بیسویں صدی کو رحمان نیر آگے بڑھا پائے اس میں شمع افروز زیدی کی رفاقت کا اہم کردار ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ بیسویں صدی کی بے انتہا مقبولیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں زمانہ طالب علمی میں ایک بار تامل ناڈو گیا تو وہاں جولار پیٹ جنکشن پر میں نے بیسویں صدی رکھا ہوا دیکھا۔ بیسویں صدی جیسے اہم رسالے کی پرانی فائلوں کو احتیاط سے رکھنا اور ان فائلوں میں سے بہترین افسانوں کا انتخاب کر کے کتابی شکل میں شائع کرنا شمع زیدی صاحبہ کا قابل ستائش کارنامہ ہے۔

چنڈی گڑھ سے تشریف لائیں ڈاکٹر رینو بہل نے کہا کہ بیسویں صدی رسالہ نہیں ایک انسٹی ٹیوشن ہے۔ یہ موقع میرے لیے باعث مسرت اور قابل فخر ہے، کیونکہ میں نے اس رسالے سے اردو سیکھی اور میرے افسانے لکھنے کی بنیاد رکھی گئی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ بچپن میں جن رسائل نے متاثر کیا ان میں بیسویں صدی بھی ہے، جناب خورشید اکرم نے کہا کہ ایک رسالہ جس کی عمر نوے سال سے زیادہ ہے، افسانے کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے، ساٹھ ستر کی دہائی میں شاید ہی کوئی لکھنے پڑھنے والا ہو جس نے بیسویں صدی نہ پڑھا ہو۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ اس رسالے میں شائع شدہ تمام افسانے رومانی قسم کے ہوتے تھے جنھیں پڑھ کر قاری پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی، انھوں نے کہا کہ شمع افروز زیدی صاحبہ نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی محنت کی ہے، امید ہے کہ ان کی یہ محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ بیسویں صدی رسالہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتا ہے، یہ کتاب افسانوی ادب کے لیے بے حد اہم ہے۔ جناب ارشد ندیم نے کہا کہ بیسویں صدی کے افسانوں کا یہ انتخاب اکیسویں صدی کا بڑا کارنامہ ہے۔ محترمہ نگار عظیم نے کہا کہ ایسے ماحول میں جب کہ اردو کے رسائل اور ادارے بند ہو رہے ہیں بیسویں صدی کا جاری رہنا ایک کرشمہ ہے۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ بیسویں صدی ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے پر ہمارے گھر میں پابندی نہیں تھی، بیسویں صدی پڑھنے کے بعد پہلا جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ کاش ہم بھی چھپیں، اس

میں جب میرا پہلا افسانہ چھپا تو میں خود یقین نہیں کر پا رہی تھی، بیسویں صدی نے مجھے افسانہ نگار بنایا۔ سہیل انجم نے کہا کہ آج نہ صرف بیسویں صدی کے افسانوں کے انتخاب کا اجرا ہو رہا ہے، بلکہ بیسویں صدی رسالے کا احیا بھی ہو رہا ہے۔ جناب حقانی القاسمی نے کہا کہ بیسویں صدی کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے ادب عالیہ کے ساتھ اردو زبان کو بھی زندہ رکھا۔ ہر دور میں فکشن کے باب میں اس کی شناخت رہی ہے۔ جناب شعیب رضا خان نے کہا کہ کہ بیسویں صدی پر کسی خاص رجحان کا اثر نہیں تھا، اپنے وقت کا بڑا رسالہ تھا، اس کا مقابلہ بڑے رسائل سے تھا۔ پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے کہا کہ اپنے محبوب رسالے کے لیے بے انتہا محبت کا اظہار اس کتاب کے اجرا کی یہ تقریب ہے۔ اللہ کرے کہ شمع زیدی کی سانسیں چلتی رہیں اور رسالہ بیسویں صدی زندہ رہے۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ آخر میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے تمام شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 20 دسمبر 2023

آرزوئے نجات

رامپور: عالمی شہرت یافتہ شاعر اظہر عنایتی کے مجموعہ حمد، نعت، منقبت اور سلام 'آرزوئے نجات' کی ورق نمائی کے موقعے پر صولت پبلک لائبریری کے الحاج حمایت اللہ خاں ہال میں یک روزہ سمینار بعنوان 'اظہر عنایتی کی حمد و نعت گوئی' کا پروقار انعقاد عمل میں آیا۔ صولت پبلک لائبریری کے زیر اہتمام منعقدہ اس ادبی تقریب کی صدارت صدر لائبریری ڈاکٹر محمود علی خاں نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق رکن پارلیمان بیگم نور بانو جلوہ افروز رہیں جب کہ نظامت کے فرائض مسلم ڈگری کالج مرادآباد کی معاون پروفیسر ڈاکٹر رباب انجم اور آکاش وانی رامپور اردو سروس کی کمپیئر فائزہ زبیر نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ سکریٹری صولت لائبریری ڈاکٹر عدنان ضیائی نے سبھی مہمانان کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر رامپور و بیرون شہر سے تشریف لائی ادبی شخصیات نے کہا کہ اظہر عنایتی جدید غزل گو شعرا میں نہ صرف ممتاز و منفرد ہیں بلکہ سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رامپور کی ادبی فضا میں شانہ بہ شانہ روایت پسندی و جدت طرازی نے ان کے آہنگ کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ اظہر کے لہجے کا بانکپن، الفاظ و محاورات کے شاعرانہ استعمال پر دسترس و خیالات کی گہرائی و گیرائی نے انھیں ایک صاحب طرز غزل کا درجہ عنایت کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 دسمبر 2023

اردو رباعی میں انسانی اقدار کی تلاش

نجیب آباد: خلیل میموریل ویلفیئر سوسائٹی بجنور کی جانب سے محلّہ مردگان میں سوسائٹی کے دفتر میں 'ایک شام اردو ادیبوں کے نام' ادبی محفل بزرگ شاعر شکیل احمد خان شکیل بجنوری کی صدارت اور محترمہ ریحانہ خلیل کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمرانہ خاتون کی کتاب 'اردو رباعی میں انسانی اقدار کی تلاش (ایک تنقیدی جائزہ)' کی رسم رونمائی پنجاب اردو اکادمی کے سابق سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال، دبستان بجنور کے مولف ڈاکٹر شیخ نگینوی، ماسٹر امیر احمد خاں، شکیل بجنوری، ڈاکٹر فرزانہ خلیل، شاعرہ ذہین گل، سماجی کارکن پرویز پاشی، اقبال الدین، ناز شریف کے بدست انجام پائی۔ مالیر کوٹلہ پنجاب سے تشریف لائے، ماہر تعلیم، مہمان خصوصی ڈاکٹر اقبال احمد نے کہا کہ انسانی اقدار وہ بنیادی قدریں ہیں جو صحیح معنوں میں آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ ان اعلیٰ قدروں کے طفیل ہی وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ ادب کا مطالعہ دراصل انسانی اقدار کا ہی مطالعہ ہے۔ سیرت سازی میں انسانی اقدار بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ معروف ادیب ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر عمرانہ خاتون کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو رباعی میں 'انسانی اقدار کی تلاش - ایک تنقیدی جائزہ' اردو ادب میں ایک خوش آئند اضافہ ہے۔ انجمن ترقی اردو کے صوبائی عہدیدار ماسٹر امیر احمد خان نے اردو رسم الخط کے تحفظ کی اپیل کرتے ہوئے اردو کو عام کرنے اور اردو کی نئی نسل تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ بزرگ شاعر اور پروگرام کے صدر شکیل احمد خان، شکیل بجنوری نے کہا بیٹے ہی نہیں بیٹیاں بھی کام کرتی ہیں اور خلیل صاحب کی سبھی بیٹیاں اردو کو فروغ دے کر اپنے والد کی وراثت کو آگے بڑھا رہی ہیں جو لائق تحسین ہے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 30 دسمبر 2023

باتیں ملاقاتیں

نئی دھلی: جامعہ نگر میں واقع 'تسمیہ آڈیٹوریم' میں ہمالیہ ڈرگس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید فاروق احمد کی سرپرستی میں 'باتیں ملاقاتیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی نظامت معروف اسکالر ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جب تک صحافت میں شاہد زبیری جیسے بے باک، ایماندار اور حساس صحافی موجود ہیں اردو کی عظمت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آسکتی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے مدیر ماجد نظامی نے کہا کہ آج کا سب سے بڑا چیلنج ہمارے سامنے یہ ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے اس لیے ہمیں اپنے گھروں میں اردو کے اخبارات پابندی سے منگوانا چاہیے اور نئی نسل کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کرنا چاہیے۔ سینئر صحافی معصوم مراد آبادی نے کہا کہ 'باتیں ملاقاتیں' دراصل انٹرویو پر مبنی منفرد نوعیت کی کتاب ہے۔ معروف کالم نگار سہیل انجم نے کہا کہ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ جس فیلڈ کے ماہرین کو اس میں شامل کیا گیا ہے ان سے انھی سے متعلق موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے اور ہر موضوع کو نہایت ہی سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پروگرام کے داعی و معروف صحافی سید منصور آغا نے کہا کہ شاہد زبیری کی صحافت اور ان کی تحریریں بے باک اور غیر جانبدار ہیں اور یہ امتیازی خصوصیت آج کے صحافیوں میں ناپید ہوتی جا رہی ہے کتاب کے مرتب ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے کہا کہ اس کتاب میں جن شخصیات کا انٹرویو کی شکل میں احاطہ کیا گیا ہے، کتاب کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے وہی کافی ہے۔ اسلامیہ کالج سہارنپور کے سابق پرنسپل جلال عمر نے کہا کہ شاہد زبیری کی صحافت ایمانداری پر مبنی ہے۔ کتاب کے مصنف شاہد زبیری نے کہا کہ میرا ایک خواب تھا جسے آج اللہ تعالیٰ نے پورا کر دکھایا اور یہی کتاب میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالملک مغیثی نے کہا کہ شاہد زبیری کی صحافت سے نئی نسل کو بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر سید فاروق احمد نے کہا کہ مرد کی زندگی میں عورت کا کردار کیا ہوتا ہے، اس کا تذکرہ شاہد زبیری اپنی تقریر میں کر چکے ہیں، ان کے اہل خانہ کی موجودگی خود اس بات کی گواہ ہے۔ آخر میں شاہ عالم اصلاحی کے کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر سہیل انجم کی کتاب 'زیارت حرمین شریف' کی بھی رونمائی ہوئی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2023

کہکشاں

نئی دھلی: سُربھی میوزک اسٹوڈیو ناگلوئی نئی دہلی میں ڈاکٹر تابش مہدی کے زیر صدارت نورالعین قیصر قاسمی کے

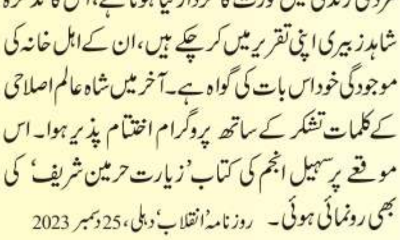

اعزاز میں 12 دسمبر کو ایک شام منائی گئی۔ اس موقعے پر قیصر قاسمی کے تیسرے شعری مجموعے 'کہکشاں' کی رسم رونمائی

بھی ادا ہوئی۔ پروگرام کی نظامت فخرالدین اشرف نے کی۔ ابتدائی مرحلے میں نورالعین قیصر قاسمی کو گلدستہ وشال پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ شعری مجموعے' پر اظہار خیال روزنامہ وہفت روزہ صدائے انصاری کے اسسٹنٹ ایڈیٹر حبیب سیفی نے کیا۔ مہمان خصوصی مولانا خورشید احمد الحسینی رہے، جبکہ مہمانان کرام میں ایڈوائزر سہارا گروپ جناب آفاق سیلانی، زونل ایڈوائزر سہارا انڈیا جناب جے منظر نے شرکت کی۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کسی کی عظمت کا اعتراف کرنا واقعی بڑی بات ہے، ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اب یہ سلسلہ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ میں مبارکباد دیتا ہوں ان صاحبان کو جنھوں نے یہ شام سجائی۔ 'کہکشاں' کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے حبیب سیفی نے کہا کہ بظاہر یہ مجموعہ حمد ونعت، منقبت، متفرق نظموں اور اشعار پر مبنی ہے۔ مگر اس میں اصلاحی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ شہادت علی نظامی نے صاحب مجموعہ سے اپنے چالیس برسوں کے تعلقات کے حوالوں سے گفتگو کی۔ اس موقعے پر کلیم شیخ، رفیق ملک، مناخان، خالد سیفی، عبداللہ شیخ نے خاص طور سے شرکت کی۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 12 دسمبر 2023

مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں

نئی دهلی: مولانا محمد علی جوہر کے یوم پیدائش پر مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے زیراہتمام نئی دہلی کے تسمیہ آڈیٹوریم میں ایک باوقار تقریب منعقد ہوئی، جس میں مقررین نے ملک کی آزادی کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی ناقابل فراموش خدمات کو یاد کیا۔ اس موقعے پر اکیڈمی کی جانب سے سرکردہ شخصیات کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں اور پروفیسر اخترالواسع شریک ہوئے، جب کہ ڈاکٹر ایس فاروق نے تقریب کی صدارت کی۔ اس موقعے پر سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی کی مرتب کردہ کتاب 'مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے جوہر اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر کی بیش بہا خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''مولانا محمد علی جوہر کی زندگی پر یہ کتاب غیرمعمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب کے مصنف مولانا محمد عبدالملک جامعی، مولانا محمد علی جوہر کے آخری دور کے ساتھی تھے اور انھوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا۔ مولانا جوہر سے متعلق ان کی یادداشتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور یہ مواد پہلی بار منظرعام پر آیا ہے۔'' اس موقعے پر کتاب کے مرتب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ انھوں نے یہ سارا مواد سعودی عرب سے مولانا عبدالملک جامعی کے قیمتی ذخیرے سے حاصل کیا ہے جو 1946 میں ہجرت کر کے وہاں گئے تھے، وہیں 1991 میں انھوں نے وفات پائی۔ مولانا محمد علی جوہر سے متعلق جو باتیں اس کتاب میں درج ہیں، وہ اس سے پہلے کسی کتاب میں نہیں آئیں۔'' اس موقعے پر پروفیسر اخترالواسع نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا محمد علی جوہر انگریزی سامراج کے لیے تیغ بے نیام اور ملک وملت کے لیے سراپا دردمند تھے۔ پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر ہماری جنگ آزادی کے سرخیل تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک وملت کے لیے وقف کردی تھی۔ صدارتی کلمات میں ڈاکٹر ایس فاروق نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کو یاد کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب اس قسم کے جری اور بیباک لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ وہ صرف اپنے خدا سے ڈرتے تھے اور اسی لیے انھوں نے دنیا کے سب سے بڑے سامراج سے لوہا لیا۔ اس موقعے پر جن سرکردہ شخصیات کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جوہر ایوارڈ سے نوازا گیا، ان میں ڈاکٹر تلک راج کیم، خالد سیف الدین (اورنگ آباد)، ایڈوکیٹ وسیم قادری شامل ہیں، جب کہ بی اماں ایوارڈ مسلم پرسنل لا بورڈ کی رکن ممدوحہ ماجد اور ایم سلیم میموریل ایوارڈ سرکردہ ہندی صحافی ارملیش کو دیا گیا۔ نظامت الیاس سیفی نے کی اور شکریے کی تحریک اکیڈمی کے جنرل سکریٹری احمد ندیم نے پیش کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 دسمبر 2023

پروفیسر اخترالواسع: شخصیت اور کارنامے

نئی دهلی: معروف قلم کار فاروق ارگلی کی مرتبہ کتاب 'پدم شری پروفیسر اخترالواسع شخصیت اور کارنامے' کے اجرا کی تقریب انجمن ترقی اردو ہند کے زیراہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق مرکزی وزیرمملکت طارق انور نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت حسن رحمت اللہ نے کی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے تمام مہمانان اور حاضرین کا استقبال کیا۔ طارق انور نے کہا کہ پروفیسر اخترالواسع اثر انگیز شخصیت کے مالک ہیں، میرا ان سے تعلق کافی پرانا ہے، میں نے ان کو ایک ہمدرد اور محبت کرنے والا انسان پایا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کی خدمات کو ہم کتاب کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ فاروق ارگلی نے کہا کہ پروفیسر اخترالواسع کی شخصیت کا اہم جز صلح کل ہے، میری اور ان کی خوب باتیں ہوتی رہی ہیں لیکن میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کے بارے میں ایک حرف بھی ایسا نہیں سنا جس سے کہ کسی کی مخالفت کا شائبہ بھی نظر آتا ہو۔ سراج الدین قریشی نے کہا کہ پروفیسر اخترالواسع ایک شخص نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارگزار وائس چانسلر پروفیسر اقبال حسین نے کہا کہ میں جب جامعہ میں بطور استاذ آیا تھا اس زمانے سے میں پروفیسر اخترالواسع کو جانتا ہوں، یہ اس زمانے میں اساتذہ کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے تھے، مجھے کئی مرتبہ ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا ہے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے سجادہ نشین سید محمد نظامی نے کہا کہ صحیح معنوں میں اس برصغیر میں اگر کوئی حضرت امیر خسرو کا وارث ہے تو وہ پروفیسر اخترالواسع ہیں۔ مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے چانسلر محمد عتیق نے کہا کہ پروفیسر اخترالواسع سے میرا تعلق علی گڑھ موومنٹ کے زمانے سے ہے، وقت گزرنے کے ساتھ یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود نے پروفیسر اخترالواسع کی شخصیت پر خاکہ پڑھ کر سنایا۔ شبیر بھوپال والا، محمد ناصر خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ حسن رحمت اللہ نے صدارتی خطاب میں کہا کہ پروفیسر اخترالواسع سے میرا تعلق 1977 سے ہے جب میرے سسر مشہور ماہر معاشیات علی محمد خسرو نے میرا ان سے تعارف کرایا تھا۔ آخر میں پروفیسر اخترالواسع نے تمام مہمانان، شرکا بالخصوص انجمن ترقی اردو ہند اور فاروق ارگلی کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2023

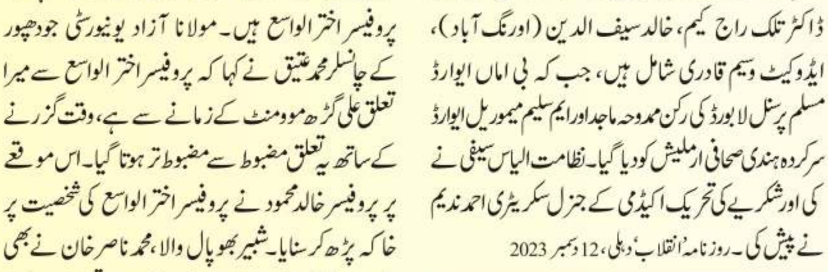

کلکِ فکر ونظر

کولکاتا: 30 دسمبر 2023 کو کولکاتا کی ایران سوسائٹی میں 'بزمِ نثار' کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر محمد منصور عالم کی کتاب 'کلکِ فکر ونظر' (تحقیقی، علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ) کی رسم رونمائی حکومت مغربی بنگال، جاوید احمد خان کے ہاتھوں سے انجام پذیر ہوئی۔ تقریب رونمائی کی صدارت معروف ڈرامانگار و ناقد جناب ظہیر انور نے فرمائی جب کہ جناب قمرالدین ملک بطور مہمانِ ذیشان موجود تھے۔ جلسے کا آغاز آچاریہ جمال احمد جمال کی افتتاحی تقریر سے ہوا۔ بعد ازاں ڈاکٹر غلام سرور، انجم عظیم آبادی، ڈاکٹر افتخار احمد (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر امتیاز وحید (کلکتہ یونیورسٹی) اور سید شکیل احمد (مقیم دوحہ، قطر) صاحبان نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ نقابت کے فرائض جناب خواجہ احمد حسین نے انجام دیے اور بزم نثار کے سکریٹری جناب اشرف احمد جعفری نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ کولکاتا و مضافات کی علمی و ادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں جلسے میں شرکت کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 3 جنوری 2023

وفیات

شمیم جیراجپوری

نئی دہلی: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے بانی وائس چانسلر اور ملک عزیز میں تعلیمی میدان میں اہم

کارنامہ انجام دینے والے پروفیسر شمیم جیراجپوری کا 10 جنوری کو جامعہ نگر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں کی گئی۔

محمد شمیم جیراجپوری کا تعلق اعظم گڑھ کے جیراجپور سے تھا۔ 8 اپریل 1942 کو ان کی پیدائش ہوئی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی، ایم ایس سی کے بعد 1964 میں زولوجی میں پی ایچ ڈی کی اور علی گڑھ ہی میں انھوں نے شعبۂ زولوجی کے پروفیسر و چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور فیکلٹی آف لائف سائنس کے ڈین بھی رہے۔ اس کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچرل کے فاؤنڈر ڈائریکٹر بھی رہے۔ زولوجی پر ان کی بہت سی کتابیں بھی ہیں اور تحقیقی مقالات بھی مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کا سب کا اہم کام Taxonomy of Nematodes کے حوالے سے ہے۔

پروفیسر جیراجپوری نے 9 جنوری 1998 کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اولین وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنے کام کا آغاز کیا جسے یونیورسٹی ہر سال یوم تاسیس کے طور پر مناتی ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں سال 2012 کے جلسہ تقسیم اسناد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے بھی نوازا تھا، اور بھی کئی اعزازات مل چکے ہیں۔

پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے نہ صرف بنیادی انفراسٹرکچر کا آغاز کیا بلکہ اپنی میعاد کے اختتام سے قبل یونیورسٹی سے باضابطہ فاصلاتی کورسز کا آغاز کردیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے اولین ریگولر کورس ڈی ایڈ کا بھی آغاز انہی کی نگرانی میں ہوا۔ بطور خاص یونیورسٹی کے لیے اراضی کے حصول کے بعد اس کی مکمل حصار بندی اور عمارت انتظامی کی تعمیر کے ذریعے انھوں نے یونیورسٹی کو ایک بنیاد فراہم کی۔ وہ لندن میں بحیثیت سائنسداں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 2023 اور وکی پیڈیا سے

پروفیسر بدرالدین الحافظ

نئی دہلی: عربی زبان و ادب کے ممتاز اسکالر پروفیسر بدرالدین الحافظ کا طویل علالت کے بعد 3 جنوری 2024 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 88 سال تھی۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ کی پیدائش 1935 کو ہوئی تھی۔ ان کا آبائی تعلق معروف علمی و صنعتی شہر مرادآباد سے تھا۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے اسلامیات میں فضیلت، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے جامعہ مڈل اسکول سے تدریسی زندگی شروع کی، ترقی کرکے شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ ہوئے اور اس کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی سے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوکر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی وہ تدریسی، تصنیفی و تحریری سرگرمیوں میں مصروف رہے اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام جب فضلائے مدارس کے لیے عربی زبان و

ادب میں تخصص کے لیے ایک ادارے کی شروعات کی گئی تو حافظ صاحب کو اس کا ڈائرکٹر بنایا گیا اور وہ تاحیات اس ادارے سے وابستہ رہے اور سیکڑوں طالب علموں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

پروفیسر الحافظ نے عربی و اردو زبانوں میں سیکڑوں مقالے اور متعدد تصانیف اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ مصری ادب، خصوصاً توفیق الحکیم اور نجیب محفوظ پر ان کا کام اہمیت کا حامل ہے، عباس محمود عقاد کی 'عبقریات' کے تراجم بھی ان کے بہت مقبول ہوئے۔ 'یادوں کی نگری' ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ ان کے علاوہ ان کے مضامین کے بھی متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 2022 میں بھی عربی زبان میں ان کی ایک کتاب 'بنت القصار والقصص الأخری' شائع ہوئی تھی۔ پسماندگان میں 3 بیٹیاں اور 2 بیٹے ہیں۔ ان کی تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 3 جنوری 2023

منور رانا

لکھنؤ: عالمی شہرت یافتہ شاعر منور رانا کا 14 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ بعد نماز ظہر تدفین عمل میں آئی۔ ان کی

وصیت کے مطابق انھیں لکھنؤ کے عیش باغ قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ نماز جنازہ ندوۃ العلما میں مولانا جعفر حسنی نے پڑھائی۔ وہ عرصے سے علیل تھے۔ منور رانا کی عمر تقریباً 71 برس تھی، وہ گزشتہ دو سال سے گردے کی بیماری میں مبتلا تھے،

پھیپھڑوں میں بھی انفیکشن ہوگیا تھا۔ کئی ہسپتالوں میں زیرعلاج رہنے کے بعد ایمس دہلی میں بھی بھرتی رہے۔ تقریباً دو ہفتہ قبل ایک بار پھر انھیں سانس لینے میں دقت و دیگر پریشانیوں کے سبب میدانتا ہسپتال میں بھرتی کرایا گیا تھا۔ کچھ افاقہ ہونے کے بعد ایک ہفتہ قبل پی جی آئی میں بھرتی ہوئے۔ 14 جنوری کی رات تقریباً 11:30 بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ پسماندگان میں پانچ بیٹیاں سمیہ رانا، فوزیہ رانا، عرشی رانا، عروسہ رانا اور ہبہ رانا کے علاوہ ایک بیٹا تبریز رانا ہیں۔ منور رانا رائے بریلی میں 26 نومبر 1952 کو پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان ہجرت کر گئے تھے، ان کے والد نے وطن کی محبت میں یہیں رہنا پسند کیا۔ ان کا کنبہ مغربی بنگال منتقل ہوگیا تھا، جہاں منور رانا کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بعد میں انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ منور رانا کی متعدد تصنیفات منظرعام پر آچکی ہیں۔ 'بغیر نقشہ کا مکان' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب 'ماں' میں شامل نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی تصنیف 'مہاجرنامہ' نے انھیں برصغیر میں ایک نئی پہچان دی، جس میں ہجرت کے کرب کو بخوبی بیان کیا ہے۔

ان کی تصنیفات میں جنگل پھول، کہو ظل الٰہی سے، شہدابہ، سفید جنگلی کبوتر، سخن سرائے، چہرے یاد رہتے ہیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی نظموں کا مع ہندی دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ منور رانا کو متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1993 میں رئیس امروہوی ایوارڈ، 1995 میں دلکش ایوارڈ، 1997 میں سلیم جعفری ایوارڈ، 2024 میں سرسوتی سماج ایوارڈ، 2005 میں غالب ایوارڈ (ادے پور)، 2006 میں کبیر سمان اعزاز، 2011 میں مغربی بنگال اردو اکادمی سے عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ، 2014 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2023

ڈاکٹر شریف قریشی

رامپور: علم و ادب کی معروف شخصیت ڈاکٹر شریف احمد قریشی 28 دسمبر کی صبح اس دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کی نماز جنازہ مفتی اسلام حسن رضوی نے بعد نماز عصر گورنمنٹ حامد انٹر کالج کے میدان میں ادا کرائی۔ بعدہ مزار ٹاٹ شاہ میاں کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ 30 سال تک گورنمنٹ رضا پی جی کالج رامپور کے شعبہ اردو میں خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہونے والے ڈاکٹر شریف احمد قریشی اترپردیش کے ضلع کانپور میں

پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے رامپور کو ہی اپنا مسکن بنالیا تھا اور رامپور میں رہتے ہوئے تقریباً تین درجن کتابیں لکھیں۔ وہ ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے جن کے مجموعہ کلام 'تیسری آنکھ' کے تین ایڈیشن منظرعام پر آچکے ہیں جب کہ اب تک چار جلدوں پر مشتمل ان کی کتاب رامپور کے چند قلم کار، متعدد فرہنگیں اور کئی اہم کتابیں منظرعام پر آکر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 دسمبر 2023

قیس رامپوری

نئی دهلی: مشہور شاعر اور خطاط قیس رامپوری دہلی میں طویل علالت کے بعد 6 جنوری کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 76 برس تھی۔ وہ کافی عرصے سے صاحب فراش تھے اور قوت گویائی سے محروم ہوگئے تھے۔ 7 جنوری بروز اتوار

شاہین باغ قبرستان میں عصر کے بعد ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ میں ادبی، سماجی شخصیات نے شرکت کی جن میں معصوم مرادآبادی، اعجاز انصاری، ممتاز عالم رضوی، رؤف رامش، حقانی القاسمی، الیاس ملک، شاہنواز احمد صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹی تزئین فاطمہ اور ایک بیٹا شیراز علی ہے۔

قیس رامپوری کا اصل نام سید سجاد علی تھا۔ وہ 1947 میں رامپور میں پیدا ہوئے جہاں انھوں نے خوش نویسی کا فن بھی سیکھا۔ معصوم مرادآبادی کے مطابق قیس رامپوری 1962 کے آس پاس روزگار کی تلاش میں دہلی آئے اور یہاں مولانا عبدالوحید صدیقی کے روزنامہ 'نئی دنیا' سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد جب مولانا نے 1966 میں 'ہما ڈائجسٹ' نکالا تو وہ اس کے تزئین کار بن گئے۔ 1973 میں جب 'نئی دنیا' ہفتہ وار ہوا تو قیس صاحب نے اس میں چار چاند لگانا شروع کیے۔ بعد کو وہ نئی دنیا سے الگ ہوکر روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے وابستہ ہوگئے تھے اور وہاں ہر روز عصری موضوعات پر ایک قطعہ لکھا کرتے تھے۔

قیس صاحب کا تعلق رامپور سے تھا اور ان کی شاعری میں بھی ایک رنگ رامپور کا بھی ہے جو خاصا شوخ و شنگ ہے۔ لیکن ان کی مقبولیت صرف رامپور تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی۔ ان کا ایک مجموعہ کلام 'سمندر اور سمندر' 1987 میں منظرعام پر آیا جس پر امیر قزلباش اور پروفیسر نعیم احمد کی تحریریں شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جنوری 2023 اور دیگر ذرائع

پرویز احمد

نئی دهلی: سینئر صحافی پرویز احمد کا 25 دسمبر نئی دہلی کے اپولو ہسپتال میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 75 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ اور دو بیٹیاں ہیں۔

پرویز احمد کی پیدائش مدھیہ پردیش کے اجین میں ہوئی تھی۔ انھوں نے وہیں سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ دہلی آگئے اور جے این یو میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے جے این یو سے اردو میں ایم فل کیا تھا۔ وہ پریس کلب آف انڈیا کے سابق صدر تھے۔ پرویز احمد نے بارہ سال ہندی روزنامہ 'نوبھارت ٹائمز' میں کام کیا وہ مشہور ہندی ادیب شانی کے داماد تھے اور ان کی اہلیہ صوفیہ بی بی سی لندن سے وابستہ تھیں۔ پرویز احمد نے بی آئی ٹی وی کے لیے بھی کام کیا۔ وہ اردو تہذیب کے پروردہ تھے اور انھیں اس زبان سے عشق تھا۔ اردو شاعری کی معیاری محفلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ انھیں دوپہر دہلی گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2023

پروفیسر تسنیم

نئی دهلی: معروف صحافی ادیب اور شاعر سعید سہروردی مرحوم کی صاحب زادی اور سینٹ اسٹیفن کالج کی ایسوسی ایٹ پروفیسر تسنیم سہروردی کا 26 دسمبر گروگرام کے فورٹس

ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحومہ مختلف امراض کے سبب 20 دسمبر سے داخل ہسپتال تھیں۔ مرحومہ ہندوستانی قرون وسطی کی تاریخ میں اپنے تخصص کے لیے علمی طور پر مشہور تھیں۔ سینٹ اسٹیفن کالج میں پڑھانے کے دوران انھیں کئی بار امریکی تعلیمی اداروں اور ہندوستان میں بھی کئی اہم اداروں کی جانب سے بطور مہمان مدعو کیا گیا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کے بھائی انیس سہروردی ایڈوکیٹ کا 2012 میں انتقال ہوگیا تھا۔ پسماندگان میں ان کی بہن نیلوفر سہروردی (سینئر صحافی)، بھتیجے عاطف سہروردی (وکیل) اور دیگر قریبی رشتہ دار شامل ہیں۔ ان کے انتقال کو علمی دنیا کے لیے ایک بہت بڑا خسارہ قرار دیا جارہا ہے۔ بعد نماز ظہر مہندیان قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں سیاسی اور صحافتی دنیا سے وابستہ افراد سمیت مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 دسمبر 2023

عتیق ملک

نئی دهلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق استاذ عتیق

ملک کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 70 سال سے زائد تھی۔ وہ ذاکر حسین کالج میں عربی کے لیکچرار تھے اور کچھ عرصہ جے این یو میں بھی انھوں نے عربی کے استاذ کی حیثیت سے پڑھایا۔ عتیق ملک کی تدفین بعد نماز عصر واقع ملکہ گنج ان کے اپنے آبائی قبرستان نزد پرانی سبزی منڈی دہلی میں ہوئی۔ عتیق ملک پرانی دہلی کے حویلی اعظم خاں علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ عتیق ملک کے پسماندگان میں اہلیہ اور ان کی دو بہنیں شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 دسمبر 2023

ڈاکٹر انعام الحق

گورکھپور: متعدد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر انعام الحق کا 28 دسمبر کو معمولی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی

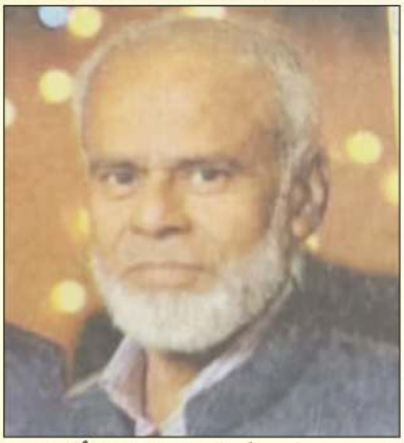

نماز جنازہ بعد نماز جمعہ گورکھناتھ جامع مسجد کے صحن میں ادا ہوئی اور اسی سے متصل قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ 3 مارچ 1955 کو آنکھیں کھولنے والے ڈاکٹر انعام الحق نے آخری آرام گاہ سے متصل مدرسہ سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا اور پھر انصار ہائی اسکول میاں صاحب اسلامیہ کالج سے ہوتے ہوئے گورکھپور یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں میں رنج وغم کا ماحول ہے۔ انھوں نے سرسید کی نثر پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور پچھلے سال انھیں اترپردیش اردو اکادمی کے ذریعے 'نوائے مسلم' تصنیف پر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2023

استاد راشد خان

کولکاتا: ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے مقبول ترین فنکاروں میں سے ایک پدم بھوشن استاد راشد خان کا طویل علالت کے بعد 9 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر

56 برس تھی۔ وہ 22 نومبر سے ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ کچھ عرصے سے پروسٹیٹ کینسر میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کردی تھی۔ نومبر میں انھیں برین ہیمرج ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ 9 جنوری کی سہ پہر تین بج کر 45 منٹ پر ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ راشد خان یکم جولائی 1978 کو بدایوں، اترپردیش میں پیدا ہوئے۔ عنایت حسین خان صاحب نے جس صنف کی بنیاد رکھی راشد نے اس صنف کے ایک اور استاد، استاد نثار حسین خان صاحب سے تلمذ حاصل کیا۔ جو راشد کے دادا تھے۔ استاد راشد خان 10 سال کی عمر میں کولکاتا آئے تھے۔ سنگیت ریسرچ اکیڈمی سے اسکالرشپ لے کر دادا نثار حسین سے موسیقی سیکھنا شروع کی۔ انھیں کئی اہم ایوارڈ سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ، پدم بھوشن ایوارڈ اور بنگال بنگو بھوشن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2024

علی حیدر رضوی

نئی دهلی: اردو کے تجربہ کار صحافی سید علی حیدر رضوی 'عرفی' کا طویل علالت کے بعد 5 جنوری کو تقریباً 52

سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ اور تین

بیٹوں کے علاوہ تین بھائی ہیں۔ مرحوم اتر پردیش کے ضلع ہردوئی کی تحصیل سنڈیلہ واقع گھوگھیرا گاؤں کے رہنے والے تھے اور طویل عرصے سے دہلی میں خوریجی میں کنبے کے ساتھ رہ کر صحافتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ گزشتہ سات ماہ سے بخار میں مبتلا تھے اور ایمس سمیت دہلی کے مختلف اسپتالوں میں کئی ماہ زیر علاج رہے، جہاں سے افاقہ نہ ہونے پر انھیں لکھنؤ واقع کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی میں بھرتی کرایا گیا جہاں تقریباً ایک ماہ علاج کے بعد طبیعت میں کچھ بہتری ہونے پر گزشتہ ہفتہ چھٹی دے دی گئی تھی لیکن کچھ دن بعد طبیعت پھر بگڑ گئی اور بدھ کو دوبارہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں بھرتی کرایا گیا جہاں 5 جنوری کو تقریباً 10 بجے دل کا دورہ پڑنے سے انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصہ میدان صحافت میں گزرا۔ مرحوم اپنی تقریباً 25 سالہ صحافتی زندگی میں سیکڑوں صحافیوں کے محسن تھے۔ وہ روزنامہ 'صحافت' دہلی میں منیجر کی حیثیت سے طویل خدمات انجام دے چکے تھے۔ وہ فی الحال نیوز پورٹل 'قومی آواز' میں برسر ملازمت تھے۔ اس کے علاوہ متعدد اردو اخبارات بھی ان کی خدمات کے گواہ ہیں۔ مرحوم رضوی انتہائی خلیق و شفیق اور بہترین و کامیاب صحافی تھے۔ مرحوم کی تدفین ہردوئی ضلع میں سنڈیلہ تحصیل کے گھوگھیرا گاؤں واقع آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 جنوری 2023

شمیم الرحمٰن

نئی دھلی: اردو روزنامہ 'ہمارا سماج' کے منیجر شمیم الرحمٰن کا 7 جنوری دہلی کے شانتی مکند ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔

ان کی عمر 52 برس تھی اور وہ لکشمی نگر کے للیتا پارک میں رہائش پذیر تھے۔ مرحوم گزشتہ پانچ برسوں سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے اور ان کا مستقل ڈائیلسس چل رہا تھا۔ وہ دو دن پہلے شدید بیمار ہونے کی وجہ سے داخل ہسپتال ہوئے تھے۔ پسماندگان میں چار بچے اور بیوی ہیں۔ ان کی تدفین ان کے آبائی وطن میں عمل میں آئی۔ دہلی سے ان کا جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس آبائی وطن لے جایا گیا۔ روانگی سے قبل دہلی میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں دفتر کا عملہ اور دیگر احباب اور متعلقین و رشتے دار شریک رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جنوری 2024

محمد سلیم خان ہمراز

نئی دھلی: مٹیابرج کے معروف شاعر و ادیب محمد سلیم خان ہمراز کا 63 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کے

انتقال سے حلقہ اردو ادب میں غم کی لہر دوڑ گئی اور ادبا و شعرا نے ان کے لواحقین سے اظہار تعزیت کیا۔ مرحوم کے بہنوئی اور تہذیب ہند دہلی کے ایڈیٹر محمد عمران دہلوی کے مطابق ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سلیم ہمراز ایک اچھے شاعر کے ساتھ بہترین افسانہ انگار تھے۔ پتلیوں میں پگھلتا سورج، ندی میں اترتا سمندر، انتظار، کالی مسجد کا مسافر اور آدھے چہرے کا انسان جیسی ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2023

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

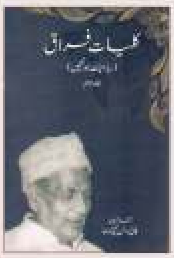

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

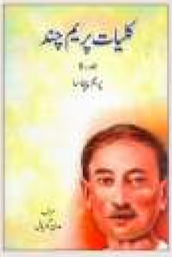

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

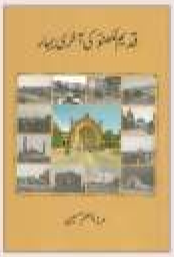

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

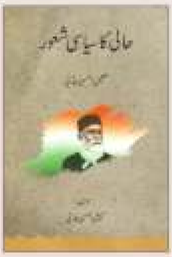

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

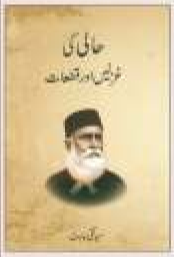

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, फ़रवरी-२०२४,वर्ष:२६, अंक:२
URDU DUNIYA Monthly, February-2024, Vol.26, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6